قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2023 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

پچیسواں قومی اُردو کتاب میلہ وانمباڑی 2023

25वां
राष्ट्रीय

2023

Azadi Ka Amrit Mahotsav

Azadi Ka Amrit Mahotsav

25वां

Azadi Ka Amrit Mahotsav

25 - வது
தேசிய
உருது
புத்தகக்
கண்காட்சி
2023

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:3، مارچ 2023

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 چھتہ گلی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

وانمباڑی کتاب میلہ نایاب حسن 8

زبان و تعلیم

ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل درخشاں تاجور 18

اردو زبان کا ارتقا صبا ناز محمد انصاری 20

باب یگانہ

یاس یگانہ چنگیزی کی تخلیقی انانیت ابوشہیم خان 23

جدید غزل کا امام: یگانہ چنگیزی وسیم فرحت 27

یادیں باتیں

جونپور کی تین معاصر محترم شخصیتیں عبدالحق 30

ادبستان ایک تعارف شعیب نظام 33

ادب: زاویے اور جہات

اردو ماس میڈیا میں ترجمہ کی ضرورت سرفراز جاوید 37

پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور اردو نیاز سلطانپوری 41

مظفر حنفی کی خودنوشت

شیشہ ساعت میں سرد ھنتی ہے رات تسلیم عارف 45

ہندوستانی ثقافت لکھنو اور فسانہ آزاد ساجد ذکی فہمی 49

اردو سانیٹ کا فن اور عزیز تمنائی عزیز سہیل 52

عرفان صدیقی کی شاعری میں

عصری مسائل سید بصیر الحسن وفا نقوی 55

خراج عقیدت

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم مہ نور زمانی 59

لعل و گہر

عبدالمتین رنگوں کے تعاقب میں عشرت ظہیر 63

کیف عظیم آبادی ہمایوں اشرف 68

کشمیری تہذیب و ثقافت کا عکاس

حکیم منظور مشتاق احمد گنائی 71

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 74

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ ادارہ 83

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 85

ہماری بات

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں بہت سی سطحوں پر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ان تبدیلیوں کا اثر ہمارے ذہنی نظام اور ترجیحات پر بھی پڑا ہے۔ ابتدا میں بہت سے لوگ نئی ٹیکنالوجی کے تعلق سے اندیشہ ہائے دور دراز اور بے جا خوف اور تذبذب میں رہے مگر اب الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی نہ صرف اہمیت، افادیت سامنے آرہی ہے بلکہ اس کی ضرورت کا شدت سے احساس بھی ہو رہا ہے کیونکہ اب اسی ٹیکنالوجی پر ترقی کا انحصار ہے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ سطحوں پر اس کے منفی اثرات بھی سامنے آئے ہیں مگر اس میں قصور ٹیکنالوجی کا نہیں بلکہ استعمال کرنے والوں کا ہے۔

یہ بات ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جدید تر تکنیکی ذرائع کی وجہ سے ہمیں بہت سے متبادل بھی ملے ہیں اور ہمارے پاس اسی کی وجہ سے وسائل کی فراوانی بھی ہے۔ پہلے کی طرح ہم خاص دائرے میں محدود نہیں ہیں بلکہ ہمارا دائرہ اب وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے لیے بہت سے ان مقامات تک رسائی کی راہ آسان ہوگئی ہے جن تک پہنچنا ہمارے لیے پہلے ممکن نہیں تھا۔ نئی ٹیکنالوجی سے ہمارے ذہن کو بھی وسعت ملی ہے اور ہمارا عملی دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔

آج جب ہمارے پاس بہت اچھے تکنیکی وسائل و ذرائع موجود ہیں تو ہمیں ان وسائل کا مثبت استعمال کرنا چاہیے۔ ان کا استعمال کرکے ہم نہ صرف اپنے جذبات و احساسات کو ہر خاص و عام تک پہنچا سکتے ہیں بلکہ بہت سے اہم مسائل کے تعلق سے مکالمے کی فضا بھی ہموار کر سکتے ہیں۔ ہم ان افکار و اقدار کی ترسیل بآسانی کر سکتے ہیں جن سے ہمارے سماج کو روشنی ملتی ہے۔ ہم پوری دنیا تک یگانگت، امن و یکجہتی کا پیغام پہنچا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو جدید ترین ٹیکنالوجی سے مکمل طور پر ہم آہنگ کریں اور سوشل و الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کرکے ہم اپنے خیالات دوسروں تک پہنچائیں کیونکہ اب ہمیں دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے وسائل کی کمی کا کوئی بہانہ نہیں رہ گیا ہے۔ ہمیں حیات و کائنات کے مسائل پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کا بھی ایک موثر ذریعہ مل گیا ہے۔

نئی ٹیکنالوجی کی وجہ سے زبان و ادب کے تعلق سے گفتگو کے نئے زاویے بھی ہمیں میسر آئے ہیں۔ اب زبان کو ٹیکنالوجی سے مربوط و ہم آہنگ کرکے وسیع تر تناظر میں سوچنے کی ضرورت ہے۔ ٹیکنالوجی سے زبان کی جتنی قربت و ہم آہنگی ہوگی زبان اتنی ہی ترقی کرے گی۔ زبان کی ترقی کے لیے جدید ترین تکنیکی ذرائع کا استعمال ضروری ہے۔ زبان سے جڑے ہوئے جتنے بھی مسائل ہیں ان کو اب تکنیکی نقطہ نظر سے ہی دیکھنا ہوگا تبھی ہمیں ان مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو شکر کی بات یہ ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی سے یہ زبان جڑی ہوئی ہے، اس سے یقینی طور پر اردو زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ نئی نئی بستیوں تک ہماری زبان کی رسائی ہو رہی ہے اور وہاں اس زبان سے محبت کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے اور سوشل میڈیا کے ذریعے ہی ہمیں یہ پتہ چل رہا ہے کہ اردو زبان کی ترقی کی رفتار کیا ہے اور کن ملکوں میں یہ زبان اب اپنا دائرۂ اثر بڑھا رہی ہے۔ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ یوروپی اور دیگر ممالک میں اس زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، بہت سی انجمنیں، ادارے، تنظیمیں اور جامعات ہیں جو اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ وہاں مختلف سطحوں پر اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے کوششیں بھی کی جارہی ہیں۔ اس میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کے لیے اردو نہ مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور نہ ان کی یہ قومی زبان ہے پھر بھی وہ اس زبان کی شیرینی اور مٹھاس کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہیں اور اکتسابی زبان کی حیثیت سے اردو سے ان کا رشتہ مضبوط ہوتا جارہا ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

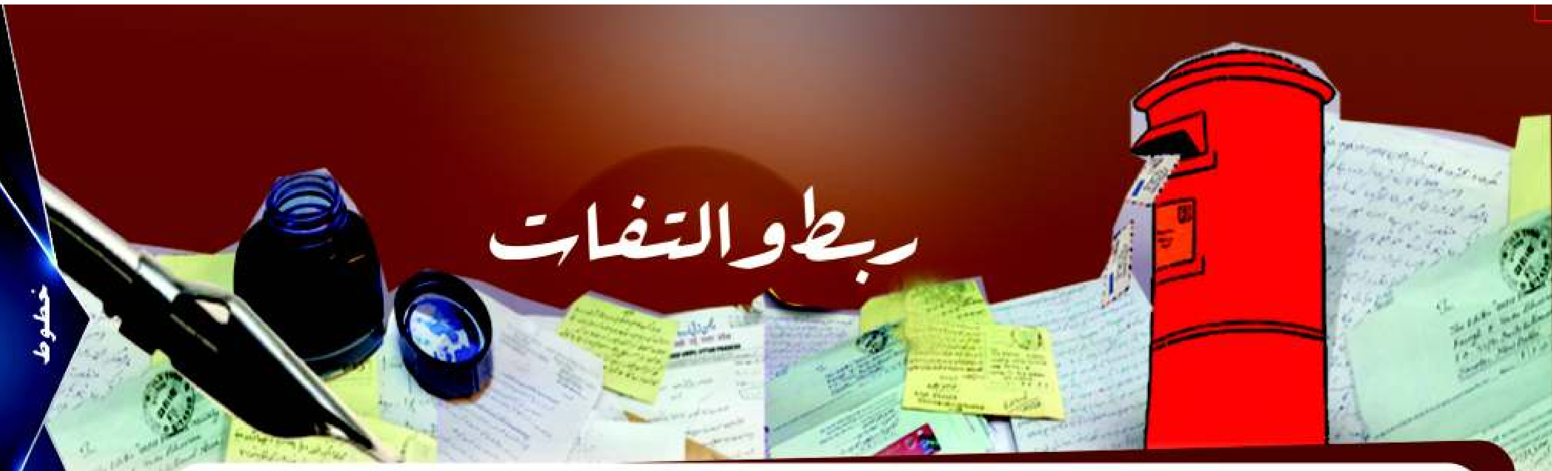

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ 'اردو دنیا' فروری 2023 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر 'عشق کتابوں سے' پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کتاب زندگی کا حقیقی سچا ساتھی ہے۔ ماضی میں ہندوستان میں کتابی کلچر تھا، لوگ اپنے ساتھ منفرد زبان میں شائع ناول، میگزین وغیرہ رکھتے تھے اور فرصت کے اوقات میں مطالعہ کرتے تھے۔ مدیر نے 'ہماری بات' میں مادری زبان پر روشنی ڈالی ہے۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے ذکاوت و ذہانت میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ صلاحیتوں اور لیاقتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ مدیر کہتے ہیں کہ ہم مادری زبان کے ذریعے ہی اپنے روشن ثقافتی تہذیبی، تمدنی اور تاریخی آثار و نشانات اور علامات سے روشناس ہو پاتے ہیں، اگر ہم مادری زبان سے رشتہ نہیں رکھیں گے تو ہمارے لیے تفہیم و اظہار کی بہت سی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ اسلم جمشید پوری نے 2022 کا فکشن اور فکشن تنقید میں عصری دور کے ناول نگاروں کے ناول کا تجزیہ و محاکمہ جامع اور مختصر پیش کیا ہے۔ 21 ویں صدی کے اردو ناول کا جائزہ تفصیلی طور پر لیا ہے۔ سید یحییٰ نشیط نے کلام غالب میں مستعمل فعل تمیز کا استعمال میں قواعد و فنی لحاظ سے جائزہ و تجزیہ کیا ہے۔ منی بھوشن کمار نے 'پریم چند کے انٹرویو: ایک مطالعہ' ادبی تخلیقی فنی لحاظ سے مفید ہے اور ادبی معلومات سے بھرپور ہے۔ 'اردو میں تخشیہ و تعلیق مسائل اور حل' ماضی کے ادب میں مروج تھا، آج کل اس کا استعمال کم ہوگیا ہے۔ سعدیہ صدف نے 'اکبر الہ آبادی رباعی گو درویش میں' اکبر کی رباعیوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جن میں تصوف درویش نظریات پائے جاتے ہیں۔ اعجاز رسول نے بہت خوب کہا ہے کہ وراثت کا تحفظ زندہ قوم کی شناخت ہے۔ اردو بھی ہندوستانیوں کی وراثت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا قوم و ملک کا فرض بنتا ہے۔ انٹرویو میں نئی معلومات ہیں۔ اردو کی ترقی کے لیے تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ افشاں بانو نے 'ممتاز احمد کا تنقیدی اختصاص' ان کے تنقیدی طریق کار کو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ جعدیہ اسجد نے 'سعید الظفر چغتائی' پر تجزیاتی انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ فکشن کے رنگ میں 'مرزا رسوا کے ناول اختری بیگم کے نسوانی کردار' محمد توحید خاں، ناول 'امراؤ جان ادا ثقافتی بیانیہ کے تناظر میں' جاوید احمد نجار نے تجزیہ و تبصرے میں تنقیدی انداز سے کام لیا ہے۔ اردو اور سائنس، لعل و گہر، کتابوں کی دنیا، خبرنامہ یہ ایسے کام ہیں جس سے اردو ادب کی عصری کیفیت کا ادراک ہوتا ہے۔ اس شمارے کے مشمولات ہر قسم کا علمی، ادبی، فنی شعور عطا کرتے ہیں۔ اردو والے ضرور اس رسالے سے استفادہ کریں۔ اردو کے طلبہ کے لیے یہ رسالہ ایک نعمت سے کم نہیں۔

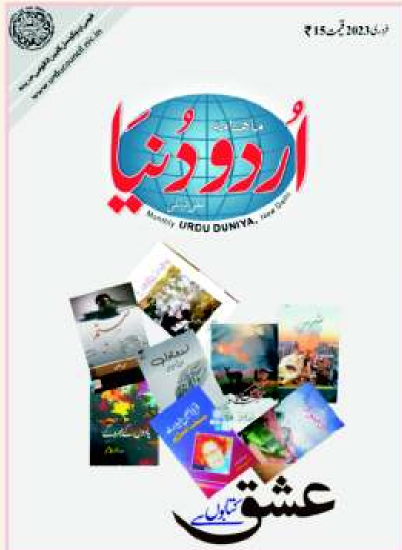

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدر آباد، تلنگانہ

'اردو دنیا' فروری ماہ کا شمارہ دیدہ زیب آسمانی رنگ کے پس منظر والے دلکش سرورق پر گزشتہ سال کے اصناف ادب کے سرورق کی تصاویر اور بلند پایہ مضامین کے ساتھ ظہور پذیر ہوا ہے۔

جناب اسلم جمشید پوری نے اپنے وسیع اور وقیع مضمون میں گزشتہ برس کے فکشن کی کتب اور ان کی تنقید کرتے ہوئے کہیں کہیں ان کے مصنفوں کی سوانح عمری کا بھی مختصر، لیکن معقول جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے نمائندہ ناول نگاروں و افسانہ نگاروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اپنے فریضے کو بخوبی انجام دیا ہے۔ انھوں نے افسانوں کی بابت بلند پایہ ادبا پر تنقیدی گفتگو کی ہے۔ مقالہ حاصلِ شمارہ کہا جا سکتا ہے۔

محترمہ سعدیہ صدف کا مضمون 'اکبر الہ آبادی: رباعی گو درویش' سامنے آیا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے بھرپور صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے بموجب

اکبر کی رباعیوں میں مزاح کم اور طنز زیادہ ہوا کرتا تھا۔ وہ مذہب و معاشرت کے باہمی رشتے کو مضبوط مانا کرتے تھے اور علم سے ہی دولت کو غیرت نصیب ہونے کے قائل تھے۔ وہ تھے کہ دان پن کرنے والے اشخاص ہی 'دانا' ہوا کرتے ہیں۔ رباعیوں میں ہمیشہ دنیاوی جذبات پر فلسفیانہ خیالات کو فوقیت دیتے تھے۔ مضمون نگار نے اکبر الہ آبادی کا موازنہ علامہ اقبال اور سر سید احمد خاں کے ساتھ کرتے ہوئے توازن برقرار رکھا ہے جو کچھ کم بڑی بات نہیں ہے۔ اکبر الہ آبادی پہلے تو سر سید کے مغربی خیالات کے زبردست خلاف تھے اور علی گڑھ جانے کے بعد وہ ان کے ہمدرد بن گئے تھے۔

ڈاکٹر کرشن بھاؤک : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

میں گذشتہ کئی سال سے 'اردو دنیا' کی مسلسل قاری رہی ہوں۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ اپنے آپ میں منفرد ہوتا ہے۔ ادب کے ساتھ معاشرتی، ثقافتی اور جدید ٹکنالوجی پر مشتمل مضامین اس رسالے کو خاص بناتے ہیں۔ جنوری 2023 کا شمارہ جب ہاتھ میں آیا تو دیدہ زیب سرورق کو دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ خاص بات یہ رہی کہ اہم مضامین کے عنوانات کی جھلکیاں سرورق پر ہی سلیقے کے ساتھ نمایاں کی گئی ہیں جو قارئین کی دلچسپی کو مزید بڑھا رہی ہیں۔ سرورق پر تحریر 'ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے' دیکھ کر محسوس ہوا کہ 2023 تک اردو زبان کا سفر پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے اور روز بروز اردو زبان و ادب کی ترقی کی منازل پر گامزن رہنے میں 'اردو دنیا' نے اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ شمارے میں شامل مضامین بھی تحقیقی نقطۂ نظر کے ساتھ نئے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ شمارے کا پہلا مضمون 'شاعری کیا ہے؟' تنقیدی بصیرت کا عمدہ نمونہ اور بہت ہی مدلل انداز میں شاعری کو جمالیاتی شعور کی ترجمانی اور اظہار ذات کا وسیلہ بتایا ہے۔ مضمون 'شمس الرحمٰن فاروقی کی روایت پسندی' فاروقی صاحب کی کتاب 'عروض آہنگ و بیان' اور 'لغات روزمرہ' کے حوالے سے اردو شاعری میں مستعمل علامتیں، الفاظ کی تفہیم، تطویل، تجوید، معانی و بیان کے سلسلے میں لکھا گیا اچھا مضمون ہے جو کلاسیکل شاعری کو فاروقی صاحب کے نظریات سے سمجھنے کی کوشش میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ مضمون 'برجستہ گوئی اور فن اصلاح شعر کا ماہر سید محمود الحسن صولت' میں صولت کی غزل گوئی کے مختلف زاویوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ غزل کے علاوہ صولت کی نعت گوئی اور چار بیت پر بھی دسترس کا ذکر موجود ہے۔ مضمون 'میر غلام نازکی ایک غزل دو قرأت' کے عنوان سے ہے جس میں شاعر نازکی کی ایک غزل کا تجزیاتی مطالعہ ہر پہلو کو نظر میں رکھ کر پیش کیا ہے۔ 'اردو شاعرات کی نظموں میں اساطیری کردار' میں شفیق فاطمہ، پروین شاکر، ادا جعفری، رفیعہ شبنم عابدی، شائستہ یوسف اور فہمیدہ ریاض کی غزلوں کے حوالے سے نسوانی اساطیری کرداروں کو سامنے لایا گیا ہے لیکن اساطیر کے حوالے سے کوئی خاص بات نہیں ملتی۔ 'اردو مثنوی میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب' میں اردو مثنویوں میں ہندوستانی تہذیب و روایت کا احاطہ کیا ہے۔ 'نازش پرتاپ گڑھی انسانیت اور حب الوطن کا شاعر' میں نازش کے کلام پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین ظہیر دہلوی کی غزل گوئی، مہابھارت کے اردو تراجم، اردو شاعری میں گیتا اور 'گرونانک دیو جی ایک انقلابی ہادی' موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس کے علاوہ رسالے میں شامل نیا آسمان نئے ستارے، سوشل میڈیا، خصوصی گفتگو، کتابوں کی دنیا، عالمی اردو نامہ اور 'خبر نامہ' جیسے گوشے قارئین کے لیے بہت ہی کارآمد اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ جس سلیقہ شعاری کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے اس کے لیے میں رسالے کی مکمل ادارتی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

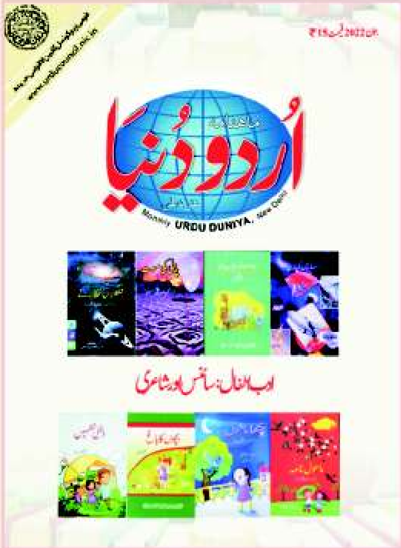

سفینہ سماوی : کریلی، الہ آباد، اتر پردیش

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔
صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

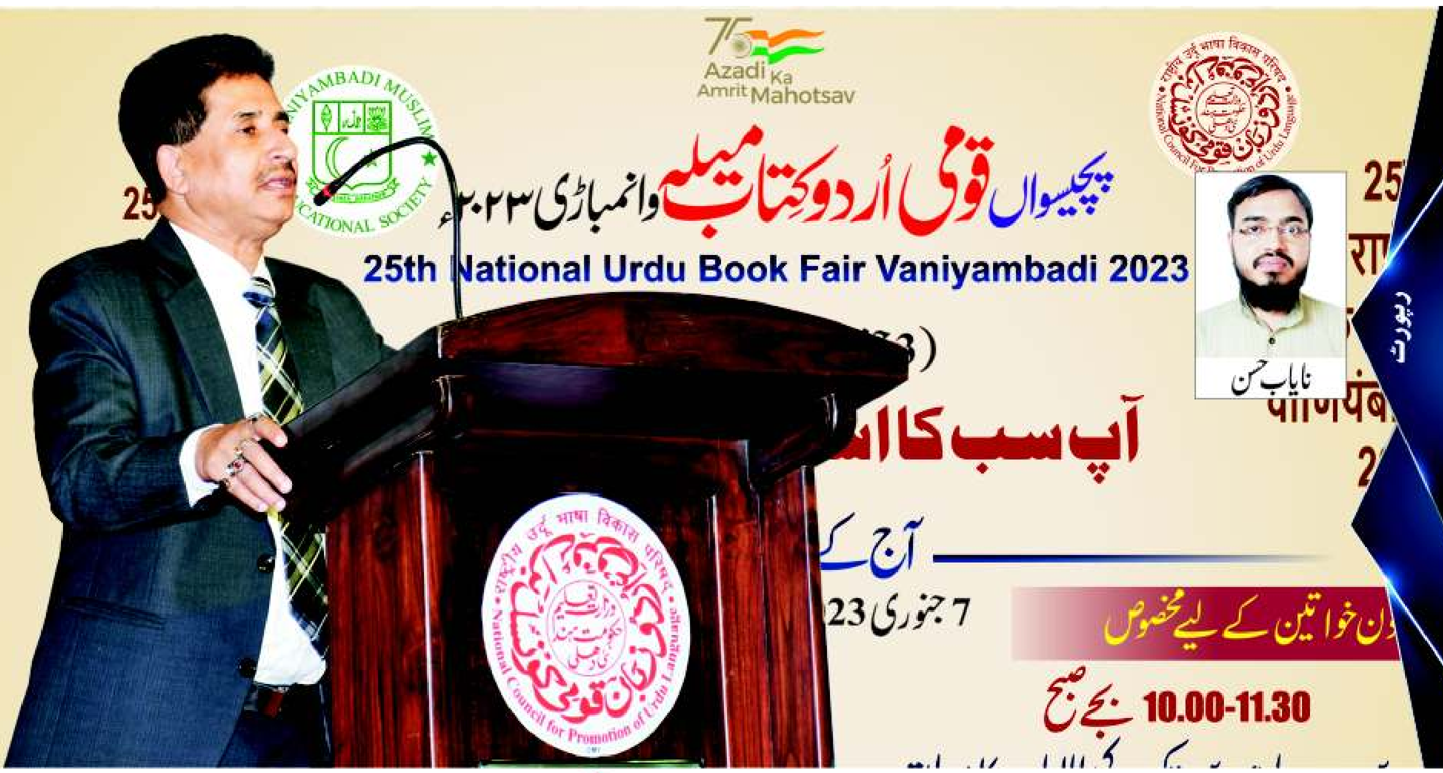

نایاب حسن

رپورٹ

وانمباڑی قومی اردو کتاب میلہ 2023

جنوبی ہند کے معروف علمی، ادبی و ثقافتی شہر میں منعقدہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پچیسویں اردو کتاب میلے سے فروغِ اردو کی نئی تاریخ رقم،مسلسل نو دنوں تک جاری رہنے والے میلے میں ملک بھر سے پچاس سے زائد ناشرین و تاجرینِ کتب کی شرکت، سیکڑوں موضوعات پر نادر و نایاب کتابوں کی نمائش، رنگا رنگ ثقافتی و ادبی پروگراموں کا انعقاد، ہزاروں شائقین زبان و ادب کا غیر معمولی جوش و جذبے کا مظاہرہ، 45لاکھ کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام وانمباڑی میں منعقدہ پچیسواں نو روزہ قومی اردو کتاب میلہ اس اعتبار سے تاریخ ساز رہا کہ کونسل نے اس کے ذریعے پورے ہندوستان کو جنوبی ہند کے ایک اہم اردو خطے سے متعارف کروایا۔ ایک ایسا خطہ، جس کی تاریخ اردو سے انیسویں صدی سے ہی وابستہ ہے، جہاں تعلیم و تعلم کی گرم بازاری کا عرصہ طویل، روشن، قابلِ قدر اور شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے قابلِ رشک بھی ہے،ایک ایسا علاقہ، جہاں کم و بیش چھ ہزار سالہ قدیم تمل زبان وتہذیب کی روشنیاں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں، ایک معنی خیز ہندو مائتھولوجی کی طرف مشیر'وانمباڑی' شیر میسور ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے خلاف اولین رزم گاہ بھی رہا ہے،تقریباً دو لاکھ کی آبادی والا ایک ایسا شہر، جو سادگی،شرافتِ نفس، بے ریائی، علمی و فکری روشن ضمیری کا جیتا جاگتا نمونہ ہے،ایک ایسا قطعۂ ارض، جہاں کے لوگ فخریہ طور پر اپنے مذہب و ثقافت سے وابستگی کا اظہار کرتے ہیں،مگر دوسرے مذہب والوں کی ایذا رسانی کا انھیں خیال تک نہیں آتا۔وہ اپنی تمل زبان سے مفتخرانہ وابستگی رکھتے ہیں،مگر ان کی اردو سے شیفتگی کی تاریخ بھی قدیم ہے، دہلی کے کوچہ چیلان اور گلی قاسم جان کی طرح اندرون وانمباڑی جب خوب صورت نستعلیق رسم خط میں 'کوچہ محمد قاسم' اور' گلی زین العابدین' کے حجری کتبے نظر آتے ہیں، تو آنکھیں چمک اٹھتی ہیں، اپنی خدمت و بارآوری کے سیکڑوں سال گزار چکے متعدد تعلیمی ادارے اس شہر کی خوب صورت تعمیر وتشکیل کے حوالے ہیں۔ مدرسۂ مفید عام (1873)، مدرسۂ اعظم (1886)، مدرسہ معدن العلوم (1888)، مدرسۂ نسواں و انجمن خیر خواہ عام (1904) یہاں کے قدیم ترین تعلیمی ادارے اور انجمنیں ہیں، مدارس کے نام سے شمالی ہندوالے مدرسے کی اصطلاح کی طرف ذہن نہ جائے، کہ یہ ادارے آزادی سے پہلے کے تصورِ مدرسہ پر کاربند ہیں اور یہاں طلبہ و طالبات کی دینی وعصری دونوں قسم کی تعلیم کا منصوبہ بند اہتمام کیا جاتا ہے۔ایک انجمن خدام الاسلام 1939 سے قائم ہے، جس کے تحت ایک لائبریری و دارالمطالعہ بھی اتنی ہی عمر کا ہے، اس میں اردو سمیت مختلف زبانوں کی ساڑھے چھ ہزار کتابیں ہیں، جن سے اہلِ ذوق استفادہ کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے خصوصاً طلبہ و طالبات کی علمی رہنمائی بھی کی جاتی ہے۔

قومی اردو کونسل نے اس کتاب میلے کے انعقاد کے لیے وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی سے اشتراک کیا، جس کی تاریخ بھی کم و بیش سوا سو سال کو محیط ہے اور اس کے زیر اہتمام لڑکوں اور لڑکیوں کے معیاری اسکولوں کے علاوہ ایک اعلی معیار کا اسلامیہ کالج بھی ہے، جس میں ریسرچ تک کی تعلیم کا نظم ہے اور وہ بھی ایک سو سات سال پرانا ہے، اسی کے خوب صورت اور وسیع و عریض

کیمپس میں اس میلے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ درجنوں ادارے اس شہر میں ایسے ہیں جو آزادی کے بعد قائم ہوئے ہیں اور ان کی خدمات بھی اہم ہیں۔ ان خصوصیاتِ علمی و ثقافتی کے ہوتے ہوئے اگر اس شہر کو جنوب کا علی گڑھ کہا جاتا ہے، تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں؛ بلکہ کئی محاسن تو اسے موجودہ علی گڑھ سے بھی ممتاز کرتے ہیں!

قومی اردو کونسل اور وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے ذریعے پورے میلے کی تنسیق و تنظیم بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی، جس کے اطمینان بخش نتائج بھی سامنے آئے۔ جہاں اس میلے میں ملک بھر کے تقریباً پچاس ناشرین و تاجرین کتب نے شرکت کی اور 90 سے زائد اسٹالز پر سیکڑوں موضوعات پر مشتمل عمدہ اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ ایک جگہ دستیاب تھا، وہیں 3 سے 11 جنوری 2023 تک تک مسلسل نو دن کامیاب ثقافتی و تعلیمی پروگرام بھی منعقد ہوئے جن میں وانمباڑی و اطراف کے دینی و عصری تعلیمی اداروں نے حصہ لیا، تجارتی اعتبار سے بھی یہ میلہ نہایت کامیاب رہا اور مجموعی طور پر 45 لاکھ تک کی کتابیں فروخت ہوئیں۔

میلے سے ایک دن قبل 2 جنوری کو ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مقامی صحافیوں اور نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کونسل کی طرف سے ان کا استقبال کیا اور کونسل کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل فروغ اردو اور اردو کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا قومی ادارہ ہے، جس کا مقصد بلا تفریق تمام ہندوستان میں اردو کو پہنچانا اور اسے فروغ دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کی طرف سے ملک گیر سطح پر فروغ اردو کی دسیوں اسکیمیں چلائی جاتی ہیں، جن میں سب سے اہم اسکیم کتاب میلے کی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ نئی نسل میں کتابوں کے مطالعے کا رجحان پیدا کیا جائے۔ اسی کے تحت کونسل ہر سال ملک کے کسی شہر میں کتاب میلے کا انعقاد کرتی ہے اور پچیسواں کتاب میلہ ہم نے وانمباڑی میں کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ یہ شہر علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور یہاں اردو کے شائقین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اردو زبان و ادب سے اس شہر کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ وانمباڑی اور آس پاس کے شہروں کے لوگ اس میلے میں ضرور شرکت کریں اور اپنی لائبریری کو قیمتی کتابوں سے مالا مال کرنے کے لیے یہاں سے کتابیں ضرور خریدیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس میلے میں ہندوستان بھر سے پچاس سے زائد پبلشرز نہایت ہی قیمتی اور نادر و نایاب کتابوں کے ساتھ شریک ہو رہے ہیں، جن کے نوے سے زائد بک اسٹالز ہیں، علم و مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک زریں موقع ہے، میری درخواست ہے کہ وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔ انھوں نے کہا کہ اس میلے میں کتابوں کے علاوہ مسلسل نو دنوں تک طرح طرح کے ادبی و ثقافتی پروگراموں کا بھی اہتمام کیا جائے گا، طلبہ کے لیے بھی خصوصی پروگراموں اور سائنسی نمائش کا اہتمام کیا جائے گا، میری تمام اہل علم، والدین اور طلبہ سے گزارش ہے کہ ان پروگراموں سے بھی استفادہ کریں۔ انھوں نے میلے کے انعقاد میں شریک ادارہ وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی علمی، تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے تعاون کے لیے اس کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب غنی ازہر، میلہ کنوینر جناب پٹیل یوسف اور کونسل کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج جناب اجمل سعید بھی موجود رہے۔

اردو کتابوں کی فروخت کا قومی ریکارڈ

قومی اردو کونسل کے کتاب میلوں کا حساب کتاب

	ماہ	سال	مقام	مجموعی فروخت
1	نومبر	2000	لال قلعہ، دہلی	10 لاکھ روپے
2	نومبر	2001	لال قلعہ، دہلی	12 لاکھ روپے
3	جنوری	2003	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	16 لاکھ روپے
4	ستمبر	2003	سری نگر، جموں کشمیر	22 لاکھ روپے
5	جنوری	2004	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	23 لاکھ روپے
6	دسمبر	2004	حیدرآباد، آندھرا پردیش	24 لاکھ روپے
7	دسمبر	2005	لکھنؤ، اتر پردیش	23 لاکھ روپے
8	دسمبر	2006	کولکاتہ، مغربی بنگال	16 لاکھ روپے
9	نومبر	2007	پٹنہ، بہار	14 لاکھ روپے
10	جنوری	2009	ممبئی، مہاراشٹر	26 لاکھ روپے
11	فروری-مارچ	2010	حیدرآباد، آندھرا پردیش	52 لاکھ روپے
12	مارچ	2011	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	15 لاکھ روپے
13	جنوری	2012	انجمن اسلام، صابو صدیق گراؤنڈ ممبئی، مہاراشٹر	52.4 لاکھ روپے
14	نومبر	2012	لکھنؤ، اتر پردیش	25 لاکھ روپے
15	ستمبر	2013	شیواجی، چھوٹا میدان، بنگلور، کرناٹک	31 لاکھ روپے
16	دسمبر-جنوری	2013-14	مالیگاؤں	87 لاکھ روپے
17	دسمبر-جنوری	2014-15	عام خاص میدان، اورنگ آباد	1,29,40,722 روپے
18	نومبر	2015	جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی گراؤنڈ دہلی	ایک کروڑ سے زائد
19	دسمبر	2015	قلی قطب شاہ اسٹیڈیم، حیدرآباد	50 لاکھ روپے
20	دسمبر	2016	رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، مہاراشٹر	ایک کروڑ 12 لاکھ روپے
21	دسمبر	2017	ایم اے پانگل اینگلو اردو ہائی اسکول	تقریباً 62 لاکھ روپے
22	اپریل	2018	روئی دھاسہ میدان، کشن گنج، بہار	تقریباً 20 لاکھ روپے
23	جون	2019	علامہ اقبال لائبریری گراؤنڈ، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، جموں کشمیر	تقریباً 50 لاکھ روپے
24	دسمبر	2021	مالیگاؤں، مہاراشٹر	تقریباً سوا کروڑ روپے
25	جنوری	2023	اسلامیہ کالج (خودمختار)، وانمباڑی، تمل ناڈو	تقریباً 45 لاکھ روپے

پہلا دن (3 جنوری 2023)

3 جنوری کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس کتاب میلے کا افتتاح تمل ناڈو کی معزز شخصیت جناب ملک محمد ہاشم کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو کسی خاص علاقے کی نہیں، بلکہ تمام ہندوستان کی زبان ہے جسے سمجھنے اور بولنے والے ہر جگہ پائے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک کی تمام زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ اس میں تقریباً ہر ہندوستانی زبان کے الفاظ پائے جاتے ہیں اور یہ زبان ہر ہندوستانی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آج کا دور علمی مسابقت کا دور ہے جس میں زیادہ سے زیادہ علوم وفنون اور زبانیں سیکھنے کی ضرورت ہے، ہمیں اپنی زبانوں کے ساتھ دوسری زبانیں بھی سیکھنی چاہیے، تاکہ ہم ملکی و عالمی سطح پر اپنی افادیت ثابت کرسکیں۔ انھوں نے کہا کہ ماں، مادری زبان اور مادر وطن کا احترام ہماری قومی ثقافت میں شامل ہے، لہٰذا ہمیں تمام زبانوں کے ساتھ اپنی مادری زبان کے فروغ کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور کونسل کا یہی مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس میلے کا انعقاد وانمباڑی میں کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے کہ یہ شہر جنوبی ہند کا علی گڑھ ہے، جہاں تعلیمی و ادبی تحریکوں کی قدیم تاریخ ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ نئے دور میں یہ شہر اردو زبان کے فروغ اور اردو کتابوں کے مطالعے کی تحریک کا بھی علمبردار بنے۔ انھوں نے کہا کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی یلغار کے دور میں ہمیں اپنے تہذیبی امتیازات و خصوصیات کے تحفظ کے لیے نئی نسل کو کتاب سے قریب کرنا ضروری ہے، لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ وانمباڑی اور آس پاس کے شہروں کے محبان علم وادب زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس میلے میں شرکت فرمائیں اور نہایت مناسب قیمتوں پر دستیاب قیمتی کتابیں خرید کر اپنی لائبریری کو ثروت مند بنائیں۔ پروفیسر عقیل احمد نے اس موقعے پر تمام مہمانوں اور ملک کے مختلف خطوں سے

آنے والے ناشرین کتب کا خصوصی طور پر استقبال کیا اور ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ملک محمد ہاشم صاحب نے کتاب میلے کے انعقاد پر دلی مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ ان شاء اللہ اس میلے سے وانمباڑی اور جنوبی ہند میں اردو کے فروغ و اشاعت کی نئی تحریک شروع ہوگی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے اپنے خطاب میں کہا کہ جس کالج میں اس کتاب میلے کا انعقاد ہو رہا ہے اس سے میری پندرہ سالہ یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس میلے کو تاریخی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہوئے کہا کہ نئی نسل کو کتابوں اور اپنے ادب و ثقافت سے مربوط کرنے میں ایسے پروگراموں کی بڑی اہمیت ہے۔ ویلور انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے بانی و تقریب کے مہمان اعزازی جناب جی وشوناتھن نے اپنے پر مغز خطاب میں کہا کہ اردو ہندوستان کی اہم زبان ہے جس کے بولنے والے تقریباً پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں، یہ ہندوستان کی بائیس شیڈولڈ زبانوں میں ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے لسانیاتی تنوع پر اچھی گفتگو کی۔ انھوں نے اس قومی کتاب میلے کے انعقاد کے لیے قومی کونسل اور وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے وانمباڑی اور تمل ناڈو کے قدیم ادبی خصائص و محاسن پر بھی روشنی ڈالی۔ مقامی ممبر اسمبلی جناب سیندھی کمار نے بھی اظہار مسرت کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کی اس پیش رفت کا استقبال کیا اور کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ کونسل نے مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے اشتراک سے جنوبی ہند کے اس اہم شہر میں کتاب میلے کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے میلے کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

قبل ازاں تمام مہمانوں کا شال اڑھا کر اور مومنٹو پیش کرکے اعزاز کیا گیا۔ افتتاحی تقریب کی نظامت کا فریضہ وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے رکن اور کتاب میلہ کے کنوینر جناب پٹیل یوسف نے انجام دیا۔ اس تقریب میں خصوصی مہمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین شریک رہے۔ پہلے دن کے دوسرے سیشن میں معروف ڈراما نگار ڈاکٹر سعید عالم کی ہدایت کاری میں ڈراما 'مولانا ابوالکلام آزاد' پیش کیا گیا، جسے سامعین نے بہت پسند کیا۔

دوسرا دن (4 جنوری 2023)

میلے کے دوسرے دن جہاں وانمباڑی اور آس پاس کے شائقین علم و ادب نے کتابوں کی خریداری کی، وہیں اس دوران منعقد ہونے والے تعلیمی و ثقافتی پروگراموں سے بھی لطف اندوز ہوئے۔ دوسرے دن کے پہلے سیشن میں اسکولی طلبہ کے درمیان 'سوشل میڈیا رحمت ہے یا زحمت؟' کے عنوان سے ایک خوبصورت مباحثے کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت وی ایم ای سوسائٹی کے نائب سکریٹری جناب نزی محمد نعیم نے کی۔ اس مباحثے میں وانمباڑی اور دیگر شہروں کے سولہ اسکولوں کے بتیس طلبہ نے حصہ لیا اور سوشل میڈیا کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں پر عمدہ تقریریں کیں۔ جج کے فرائض ڈاکٹر ایم سعید الدین، ڈاکٹر کلیم اللہ اور جناب محمد یاسر نے انجام دیے اور اول، دوم و سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو کونسل و سوسائٹی کی جانب سے بالترتیب پانچ ہزار، چار ہزار اور تین ہزار روپے جبکہ چھ دگر طلبہ کو ہزار ہزار روپے نقد تشجیعی انعام کے طور پر پیش کیے گئے۔

دوسرے سیشن میں 'تمل ناڈو میں اردو اسکولوں کے تعلیمی معیار کو کیسے بہتر بنایا جائے؟' کے عنوان سے پینل ڈسکشن کا انعقاد کیا گیا، جس میں فاضل مقررین نے تمل ناڈو کے اردو میڈیم اسکولوں کے تعلیمی معیار پر گفتگو کرتے ہوئے اسے بہتر بنانے کے امکانات پر غور و خوض کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے اساتذہ، والدین اور تعلیمی اداروں کو مل کر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت پر بھی زور دیا۔ اس ڈسکشن میں جن اہل علم و دانش نے حصہ لیا، ان میں ڈاکٹر پیش امام نذیر احمد، جناب کاکا محمد ظہیر، جناب نزی محمد نعیم، جناب کے انیس احمد، ڈاکٹر بشیر الحق قریشی اور جناب چاکوا پرویز احمد شامل تھے۔ پروگرام کی صدارت جناب کندالم اقبال احمد نے کی اور نظامت جناب پٹیل محمد یوسف نے کی۔

تیسرے سیشن میں اسکولی طلبہ کے مابین حمد و نعت خوانی کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت جناب موولے رفیق احمد سکریٹری اسلامیہ گرلس اسکول نے کی۔ ان پروگراموں میں کونسل کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر جناب محمد احمد، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر و میلہ انچارج جناب اجمل سعید اور پروگرام کوآرڈینیٹر افضل حسین خان نے خاص طور پر شرکت کی۔

تیسرا دن (5 جنوری 2023)

میلے کے تیسرے دن پہلے سیشن میں تمل ناڈو کے مدارسِ عربیہ کے طلبہ کے درمیان 'اردو زبان و ادب کے فروغ میں عربی مدارس کا کردار' کے عنوان سے مسابقے کا انعقاد ہوا۔ اس مسابقے میں وانمباڑی، پرنام بٹ، میل وشارم، عمرآباد وغیرہ کے درجنوں مدارس کے طلبہ نے حصہ لیا اور انھوں نے اردو زبان و ادب سے مدارسِ اسلامیہ کی قدیم وابستگی اور فضلائے مدارس کی اردو میں علمی، درسی، ادبی و ثقافتی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں کیں۔ اس مسابقے میں اول، دوم و سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو بالترتیب پانچ ہزار، چار ہزار اور تین ہزار جبکہ تین مساہمین کو ہزار ہزار روپے نقد اور سند توصیفی سے نوازا گیا۔ مسابقے میں حکم کے فرائض ڈاکٹر راہی فدائی اور مولانا ڈاکٹر شیخ سعید احمد نے انجام دیے۔

دوسرے اور تیسرے سیشن میں اسی موضوع پر سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا، جس میں وانمباڑی، بنگلور اور عمرآباد وغیرہ کے مختلف علمانے فروغ اردو میں مدارس کے کردار پر خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ماضی سے لے کر آج تک اردو زبان کی لسانی و ادبی خدمات انجام دینے والے بے شمار بڑے ادبا مدارس کے فضلا یا ان کے فیض یافتہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مدارس میں چونکہ ذریعۂ تعلیم اردو ہوتی ہے اس لیے لازمی طور پر ان کے لیے اردو بولنا اور لکھنا ضروری ہوتا ہے اور اسی وجہ سے آسام، بنگال، کرناٹک اور دیگر غیر اردو خطوں میں بھی اردو جاننے والے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے سیشن کی صدارت وی ایم ای سوسائٹی کے صدر جناب موداحمد باشاہ نے کی جبکہ مقررین میں ڈاکٹر مقصود عمران رشادی، مولانا سید عبدالرحمٰن معدنی، مولانا گلزار احمد باقوی، جناب پریاہکم احمد سلیم شامل تھے۔ تیسرے سیشن کی صدارت وی ایم ای سوسائٹی کے ٹرسٹی وی اے ایس نوراللہ نے کی، جبکہ مقررین میں مولانا افتخار احمد، مولانا اعزاز علی قاسمی، قاری امتیاز احمد اور ڈاکٹر بشیرالحق قریشی شامل تھے۔ چوتھے سیشن میں طلبۂ مدارس کے درمیان بیت بازی کے مقابلے کا انعقاد کیا گیا، جس میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔

چوتھا دن (6 جنوری 2023)

کتاب میلے کے چوتھے دن بھی شہر و مضافات سے شائقین زبان و ادب نے جوش و خروش کے ساتھ اس میلے میں شرکت کر کے کتابوں کی خریداری کی، ساتھ ہی اردو زبان کے طریقۂ تدریس اور جدید تعلیمی نظریات پر منعقدہ خصوصی لیکچرز سے بھی مستفید ہوئے۔ پہلا لیکچر اردو زبان میں طریقۂ تدریس کے موضوع پر اعظم کیمپس پونے کے انجینئر محمد شکیل نے دیا، جس میں انھوں نے اردو میڈیم اسکولوں کے طریقۂ تدریس میں جدت اور تبدیلی لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ نیو کالج چینئی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سدید ازہر فلاحی نے فن تعلیم و تربیت کے جدید نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف جدید و قدیم سائنٹفک تدریسی نظریات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ تعلیم و تعلم دراصل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، یعنی پڑھانا سیکھنے سے پہلے پڑھنا ضروری ہے، بچے کو کیسے اچھی طرح سکھایا جا سکتا ہے اس کا علم اگر استاذ کو ہو تو اس کی تدریس نتیجہ خیز اور مفید ہو سکتی ہے۔ جناب غنی محمد ازہر جنرل سکریٹری وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ فن تدریس کے جدید نظریات سے آگاہی اور اس کے کارگر حصے کو اپنانا آج کی اہم ترین ضرورت ہے۔

دوسرے سیشن میں اسلامیہ کالج وانمباڑی کے سکریٹری جناب ایل ایم منیر احمد کی صدارت میں جناب ستار فیضی کڑپہ اور ان کے رفقا کی مزاحیہ نشست ہوئی، جس سے سامعین لطف اندوز ہوئے۔

پانچواں دن (7 جنوری 2023)

میلے کا پانچواں دن خواتین کے لیے مخصوص تھا، جس سے وانمباڑی اور مضافات کی علم دوست خواتین نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور سیکڑوں موضوعات پر دستیاب قیمتی کتابیں خریدنے کے ساتھ مختلف علمی، ادبی و ثقافتی پروگراموں سے بھی لطف اندوز ہوئیں۔ اس دن پہلے سیشن میں دسویں سے بارھویں تک کی اسکولی طالبات کے درمیان 'کیا آن لائن تعلیم روایتی طریقۂ تعلیم سے بہتر ہے؟' کے عنوان سے مباحثے کا انعقاد ہوا، جس میں وانمباڑی، میل وشارم، پرنام بٹ وغیرہ کے درجنوں اسکولوں کی طالبات نے حصہ لیا اور طے شدہ موضوع پر تقریریں کیں۔ اس مباحثے میں اول، دوم و سوم پوزیشن حاصل کرنے والی طالبات کو قومی اردو کونسل و وی ایم ای سوسائٹی کی جانب سے بالترتیب پانچ ہزار، چار ہزار اور تین ہزار روپے نقد انعامات اور سند توصیفی سے نوازا گیا، جبکہ تشجیعی انعام کے طور پر تین طالبات کو ہزار ہزار روپے نقد و سند توصیفی پیش کی گئی۔ اس پروگرام میں صدارتی خطاب کرتے ہوئے ویمنس ہیومنیٹی ہیلپ لائن کی سربراہ محترمہ وحیدہ نے مسابقے میں حصہ لینے والی طالبات کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ ہم اگر آج اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں سنجیدگی سے مشغول رہیں اور دیگر علمی و ثقافتی پروگراموں میں حصہ لینے کی عادت ڈالیں تو مستقبل میں اس سے بے پناہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تمل ناڈو ٹیکسٹ بک کارپوریشن کی ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر شمیم صاحبہ نے بہ طور مہمان خصوصی اظہار خیال کرتے ہوئے طالبات کے اندازِ پیش کش کو سراہا اور کہا کہ آن لائن طریقۂ تعلیم روایتی طریقۂ تعلیم کے متبادل کے طور پر پوری دنیا میں رائج ہو چکا ہے، جس سے ہمیں بھی حسبِ ضرورت فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مہمان اعزازی محترمہ موودا ریشمہ غزالہ نے بھی طالبات کی تقریری صلاحیتوں کو سراہا۔

دوسرے سیشن میں کالج کی طالبات کے درمیان 'کیا ٹکنالوجی میں حالیہ پیش رفت لوگوں کی دلچسپیوں کو تبدیل کرتی ہے؟' کے عنوان سے مباحثے کا اہتمام کیا گیا، جس میں کالج کی طالبات نے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا اور جدید ٹکنالوجی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی افادیت و مضرت رسانی اور عام انسانی مزاج اور طرزِ فکر پر پڑنے والے اس کے مثبت و منفی اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مباحثے میں کامیاب ہونے والی طالبات کو بھی گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔ اس سیشن کی صدارت محترمہ غنی ثانیہ ارم نے کی، جبکہ ڈاکٹر ایچ عائشہ سعاد عارف مہمان خصوصی اور محترمہ مدیحہ عنبر مہمان اعزازی تھیں۔ تیسرے سیشن میں اسلامیہ ویمنس کالج وانمباڑی کی طالبات کے ایک گروپ نے دلچسپ ڈرامہ پیش کیا، اس کے بعد غزل سرائی کی محفل برپا ہوئی، جس سے حاضرین محظوظ ہوئے۔

چھٹا دن (8 جنوری 2023)

چھٹے دن بھی شائقین کتب بڑی تعداد میں کتابوں کی خریداری کرتے نظر آئے، ساتھ ہی اس دن سول سروسز اور دیگر مسابقتی امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے ایک خصوصی پروگرام کا بھی انعقاد ہوا، جس میں ماہرین نے طلبہ و طالبات کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اس پروگرام کی صدارت مدینہ منورہ میں مقیم معروف کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر اعجاز غنی نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ یو پی ایس سی اگزام اعلی سرکاری عہدوں تک پہنچنے کے لیے سب سے باوقار امتحان سمجھا جاتا ہے، اس کے لیے بہت زیادہ ذہانت اور کسی خاص میڈیم سے پڑھا ہوا ہونا ضروری نہیں، اردو میڈیم سے

پڑھ کر بھی اس امتحان میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ٹرسٹی وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی جناب منڈی محمد اسلم نے کہا کہ آج کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں دنیا کی تمام زندہ زبانیں نئی نئی ترقیات حاصل کر رہی ہیں، ان میں اردو بھی شامل ہے جو ایک عالمی زبان میں تبدیل ہوچکی ہے، اسی وجہ سے ہندوستان بھر میں اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ بہت سی یونیورسٹیوں میں بھی اردو کی تعلیم کا اہتمام ہے، ساتھ ہی اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر کے اعلی مسابقتی امتحانات میں بھی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

یو پی ایس سی امتحانات کی کوچنگ کے حوالے سے جنوبی ہند کے مشہور و معروف ادارہ بنجارہ اکیڈمی کے بانی وچیئرمین ڈاکٹر علی خواجہ نے اپنے پرمغز خطاب میں کہا کہ کسی بھی شعبے میں تعلیم حاصل کر رہے طلبا کو کامیابی اسی وقت ملتی ہے جب ان کے اندر ذوقِ جستجو ہو، اس کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس موقعے پر انھوں نے یو پی ایس سی کے علاوہ مرکزی و ریاستی سرکاروں کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے دیگر مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں بھی گراں قدر معلومات فراہم کیں۔

ہندوستانی فوج میں خدمات انجام دے چکے کرنل ونود نے انڈین آرمی، انڈین ایئر فورس اور نیوی کے مختلف شعبوں میں شمولیت کے لیے نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کے ذریعے ہندوستان گیر سطح پر منعقد ہونے والے امتحانات کے بارے میں بتاتے ہوئے ان امتحانوں میں کامیابی حاصل کرنے کے طریقوں پر بھی مفصل گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ فوج کی نوکری میں عزت بھی ہے اور پیسہ بھی ہے، اگر ہم خلوص اور جواں مردی کے ساتھ چند سال اپنے ملک کی خدمت کرتے ہیں تو اس کے بدلے میں نہ صرف ہمیں معاشرے میں وقار و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے بلکہ ہم مادی فوائد بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس پروگرام میں بڑی تعداد میں اسکول وکالج کے طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

ساتواں دن (9 جنوری 2023)

میلے کے ساتویں دن 'اردو زبان و ادب کی آبیاری میں تعلیمی اداروں کا کردار' کے موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس میں عصری و دینی اداروں کے ذریعے فروغِ اردو کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ اس پروگرام میں بہ طور مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے سابق آئی اے ایس افسر، ساؤتھ انڈیا ایجوکیشن ٹرسٹ کے بانی و چیئرمین اور ممتاز مصنف و شاعر موسی رضا نے کہا کہ دنیا کی ہر زبان کسی نہ کسی ضرورت کے تحت وجود میں آتی ہے، یہی حال اردو کا بھی ہے کہ ہندوستان میں مقیم مختلف قوموں کے باہمی رابطے کی ضرورت کے پیش نظر اس کا وجود عمل میں آیا، پھر اپنی غیر معمولی افادیت کی وجہ سے یہ زندہ رہی اور اپنے چاہنے والوں کی جد و جہد اور ان کی تخلیقات کی وجہ سے فروغ پاتی رہی۔ اسی طرح کوئی بھی زبان اچانک نہیں مرتی، یہ واقعات و سانحات کے ایک لمبے سلسلے کا نتیجہ ہوتا ہے، جس میں دوسروں کے ساتھ اپنوں کی بے توجہی کا بھی دخل ہوتا ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی بھی زبان کو اس کا سخت سے سخت دشمن بھی ختم نہیں کرسکتا، اس کے محبین اگر اخلاص کے ساتھ اسے فروغ دینے میں سرگرم رہیں تو وہ زبان نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ مسلسل ترقی کرتی ہے۔ زبانوں کی ترقی میں باہمی افادے و استفادے کی ضرورت کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ زبانوں میں لین دین جاری رہنا چاہیے، اس سے ان کے پھلنے پھولنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کی بہترین مثال انگریزی ہے جس نے دنیا کی تقریباً ہر زندہ زبان کے الفاظ مستعار لیے اور انھیں کھلے دل سے اپنایا اور اپنے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ بنایا، اردو میں بھی یہ سلسلہ شروع سے جاری ہے اور اسی وجہ سے ہماری زبان پیہم ترقی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ اردو کے فروغ اور تقویت کے لیے اہم کام کر رہا ہے، یہ کتاب میلہ بھی اسی کا حصہ ہے، جس کے لیے میں کونسل کے ذمے داروں اور اس میلے کے منتظمین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مولانا روح الحق نے اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کے کردار پر گفتگو کی۔ ماہر معاشیات حوالدار عبدالرقیب نے کہا کہ کوئی بھی زبان محض ادب و شعر کی وجہ سے زندہ نہیں رہ سکتی، اسے معاصر علوم وفنون اور اختراعات و ایجادات کی زبان بھی بنانا چاہیے۔ اس لیے اردو زبان میں نئے علوم وفنون کی کتابیں بھی شائع کرنے کی ضرورت

ہے۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد کے استاذ مولانا سراج الدین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک خوب صورت اور ترقی یافتہ زبان ہے جسے بلاتفریق ہر مذہب و مسلک کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ یہ زبان قومی اتحاد، یکجہتی اور دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔اس کے فروغ میں دیگر تعلیمی اداروں کے ساتھ مدارس کا بھی غیر معمولی کردار رہا ہے۔ ان کے فضلا نے نثر وشعر میں بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔انھوں نے خصوصاً تمل ناڈو کے مدارس اور جامعہ دارالسلام کی اردو زبان میں تعلیمی، تدریسی اور تصنیفی وتخلیقی خدمات پر گفتگو کی۔

کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے اس پروگرام میں خاص طور پر شرکت کی اور اظہارِ خیال کرتے ہوئے کونسل کی اشاعتی سرگرمیوں اور فروغ اردو کی اسکیموں کا مختصر تعارف کرایا۔انھوں نے کہا کہ یہاں کے طلبہ و طالبات کا ذوق وشوق دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی ہے، میں اس خوب صورت میلے کے انعقاد میں کونسل کا تعاون کرنے کے لیے وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے منتظمین کو مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ان کا شکریہ بھی ادا کرتی ہوں۔ اس پروگرام کی صدارت اسلامیہ ویمنس کالج کے سکریٹری جناب سی قیصر احمد نے کی۔

دوسرے سیشن میں 'مصنف سے ملاقات' کے عنوان سے ایک خصوصی پروگرام منعقد ہوا، جس کی صدارت جناب کے ایم سراج نے کی۔ اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ممتاز ادیب وشاعر، سابق آئی پی ایس افسر جناب خلیل مامون نے شرکت کی اور پرمغز خطاب کیا۔انھوں نے اپنی تقریر میں ادب وشعر کی قرأت وتفہیم کے لیے خاص قسم کے ذوق وشوق سے آراستہ ہونے کو

ضروری قرار دیا۔ انھوں نے شاعری کی ہزاروں سالہ قدیم تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے انسانی ذہن واحساس پر پڑنے والے اس کے اثرات کا بھی خوب صورت تجزیہ کیا۔انھوں نے اردو وفارسی کے چند نمایاں شاعروں کے منتخب اشعار کے ذریعے زندگی کے حقائق ونکات کو آشکار کرتے ہوئے کہا کہ شاعری ہمیں اس لیے پڑھنی چاہیے کہ یہ ہمارے ذہن و خیال کی تربیت کرتی اور شعور و احساس میں سوز وگداز پیدا کرتی ہے۔ تیسرے سیشن میں حیدرآباد کی ٹیم نے علامتی ڈرامہ 'کوڑا' اور مزاحیہ ڈراما 'گڑ کی مکھیاں' پیش کیے، جن سے ناظرین خوب محظوظ ہوئے۔

آٹھواں دن (10 جنوری 2023)

کتاب میلے کے آٹھویں دن کے پہلے سیشن میں اردو صحافت پر ایک خصوصی پروگرام کا انعقاد ہوا، جس میں اردو صحافت سے وابستہ موقر شخصیات نے اردو صحافت کے مختلف پہلوؤں پر معلومات افزا گفتگو کی۔ روزنامہ سالار بنگلور کے مدیر جناب اسجد نواز نے اپنے خطاب میں اردو صحافت کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کا کردار ملک کی سلامتی و اتحاد کو برقرار رکھنے اور ملکی مفاد کے تحفظ میں اہم رہا ہے۔ انھوں نے موجودہ چیلنجز کی نشان دہی کرتے ہوئے ان پر قابو پانے کے لیے سنجیدہ کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ معروف صحافی امتیاز خلیل نے اپنے خطاب کے دوران موجودہ صدی میں صحافت میں رونما ہونے والی تیز تر تبدیلیوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں مایوس کن صورت حال سے افسردہ ہونے کے بجائے نئی ٹکنالوجیکل

تبدیلیوں کو قبول کرنا چاہیے اور صحافت کے نئے فارمز اختیار کر کے اپنی باتیں دور تک پہنچانے کے مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ہم نئے میڈیمز اپنا کر اردو صحافت کو ترقی کی بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ حالات کے تناظر میں کہا کہ آج اچھی صحافت اردو ہی نہیں، پورے ملک کی ضرورت ہے، جس کا احساس ہر زبان کے صحافی کو ہونا چاہیے۔ بنگلور کے معروف صحافی اعظم شاہد نے کہا کہ صحافت حالات کا آئینہ ہوتی ہے اور صحافی معاشرے کا نباض ہوتا ہے، مگر آج صحافت بدل گئی ہے، پہلے مشن تھی اب اس کا کردار مشینی ہوگیا ہے۔ انھوں نے اردو اخباروں کے انتظامی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح صحافیوں کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی طرح اخباروں کے مالکان کی بھی تربیت ہونی چاہیے تا کہ اردو صحافت پیشہ ورانہ انداز میں فروغ پا سکے۔

دوسرے سیشن میں 'برقیاتی ذرائع کتابوں کے متبادل ہو سکتے ہیں یا نہیں؟' کے عنوان سے کالج کے طلبہ

کے درمیان مباحثہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں چھ کالج کے بارہ طلبہ نے حصہ لیا اور ان میں سے چھ نے موضوع کے مثبت جبکہ چھ نے منفی پہلو پر تقریریں کیں۔اس مسابقے کی صدارت اسلامیہ آئی ٹی آئی کالج کے سکریٹری جناب جاوید اقبال نے کی اور جج کے فرائض پروفیسر سید سجاد حسین، پروفیسر حبیب احمد اور ڈاکٹر سدید ازہر نے انجام دیے۔ مسابقے میں کامیاب ہونے والے اولین تین طلبہ کو بالترتیب پانچ ہزار، چار ہزار اور تین ہزار روپے نقد انعامات و سندِ توصیفی، جبکہ چھ طلبہ کو ہزار ہزار روپے کے تشجیعی انعام اور سندِ توصیفی سے نوازا گیا۔ تیسرے سیشن میں جامعہ دار السلام عمرآباد کے طلبہ کے گروپ کا تمثیلی مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں انھوں نے مختلف جدید و قدیم شعرا کے منتخب اشعار سے سامعین کو محظوظ کیا۔

آخری دن (11 جنوری 2023)

11 جنوری 2023 کو اس شاندار پچیسویں قومی اردو کتاب میلے کا اختتام عمل میں آیا۔ اختتامی تقریب کی صدارت کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں وانمباڑی کے محبان اردو کی بے مثال اردو دوستی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ وانمباڑی نے اردو زبان کے فروغ اور اس سے محبت کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تجارتی اعتبار سے بھی یہ میلہ نہایت کامیاب رہا کہ وانمباڑی جیسے چھوٹے سے شہر میں پینتالیس لاکھ کی کتابیں فروخت ہوئی ہیں، جو بڑے شہروں کے ڈھائی کروڑ کے برابر ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں آ کر مجھے محسوس ہوا کہ وانمباڑی کے نوجوانوں، طالب علموں، خصوصاً خواتین میں اردو سے بے پناہ محبت پائی جاتی ہے۔ یہ سرزمین اردو زبان کے لیے نہایت زرخیز ہے اور ایسے شہر اور لوگوں کے ہوتے ہوئے اردو کبھی ختم نہیں ہو سکتی، اس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا رہے گا اور اردو کی تازہ بستیاں آباد ہوتی رہیں گی۔ اس موقعے پر انھوں نے اس میلے کے انعقاد میں غیر معمولی تعاون پیش کرنے کے لیے وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے تمام عہدے داران و اراکین کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہوئے سوسائٹی کے نائب صدر و میلے کے کنوینر جناب پٹیل محمد یوسف کو مومنٹو بھی پیش کیا۔ وانمباڑی کے مشہور و معروف حکیم اکبر کوثر کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں صوفی حکیم کا خطاب دیا گیا اور ایک توصیفی سند بھی عطا کی گئی۔ اسی طرح میلے کی سرگرمیوں کے بھرپور کوریج کے لیے انھوں نے مقامی میڈیا اہل کاروں، اخبارات کے مدیروں اور پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے نمائندگان اور کتاب میلے میں شریک ہونے والے تمام محبانِ اردو کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کیا۔

اس تقریب کے مہمان خصوصی ضلع ترپاتور کے کلکٹر جناب امر کشواہا نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو نہایت شیریں زبان ہے کیونکہ یہ دلوں کو جوڑتی ہے۔ اردو

کا کوئی مذہب نہیں ہے، یہ اپنے آپ میں ایک مذہب ہے، جس سے ہر دھرم کے لوگ وابستہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کے ترقیاتی دور میں ہمیں ایک زبان تک محدود نہیں رہنا چاہیے، زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنی چاہئیں، ہم جتنی زیادہ زبانیں سیکھیں گے ان کا ہماری شخصیت پر اتنا ہی اچھا اثر مرتب ہوگا۔ انھوں نے زبان وادب کے ذوق کو ترقی دینے میں کتاب میلوں کے کردار کو غیر معمولی قرار دیتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل اور مقامی انتظامیہ کا یہ اقدام قابل تعریف ہے، اس سے نئی نسل میں کتب بینی کا ذوق وشوق نشو ونما پائے گا۔

چنئی سے تشریف لائے مہمان اعزازی آئی پی ایس شکیل اختر نے اپنے خطاب میں کتاب میلے کی علمی و ثقافتی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی شناخت اس کے دوستوں اور کتابوں سے ہوتی ہے، وانمباڑی نے اس میلے کے انعقاد کے ذریعے اپنی کتاب دوستی اور اردو کے تئیں اتھاہ خلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔ جب تک ایسے لوگ اور ایسے علاقے موجود ہیں اردو زندہ رہے گی اور ترقی کرتی رہے گی۔

قبل ازاں اس تقریب کے شروع میں اسلامیہ کالج وانمباڑی کے پرنسپل ڈاکٹر ٹی محمد الیاس نے اس کتاب میلے میں پیش کیے گئے تمام پروگراموں کے تعلق سے اپنے تاثرات پیش کیے۔ پبلیشرز کی نمائندگی کرتے ہوئے ہدی پبلی کیشنز حیدرآباد کے سربراہ عبدالباسط شکیل نے میلے کے تعلق سے اپنے تجربات شیئر کرتے ہوئے کہا کہ اس میلے سے نہ صرف تمل ناڈو بلکہ پورے جنوبی ہند میں اردو کے تعلق سے بیداری کی نئی لہر پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے ادارے کی جانب سے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور وانمباڑی مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر کو یادگاری مومنٹو بھی پیش کیا۔ جبکہ کونسل کی جانب سے کتابوں کے بیسٹ کلکشن کا ایوارڈ ہدی پبلی کیشنز حیدرآباد کو اور بیسٹ ڈسپلے کا ایوارڈ ملی پبلی کیشنز دہلی کو دیا گیا۔

قبل ازاں صبح کے سیشن میں مختلف کالجوں کے طلبہ کے مابین سائنس ایگزیبیشن کمپٹیشن کا انعقاد کیا گیا، جس میں انھوں نے اپنی عملی سائنسی کاوشوں کا بڑی خوبی سے مظاہرہ کیا۔ آخر میں وی ایم ای سوسائٹی کے سکریٹری غنی محمد ازہر نے ہدیۂ تشکر پیش کیا اور پورے اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض سوسائٹی کے نائب صدر اور اس کتاب میلے کے کنوینر جناب پٹیل محمد یوسف نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ اس اجلاس میں قومی اردو کونسل اور وی ایم ای سوسائٹی کے ذمے داروں، اراکین کے علاوہ تمل ناڈو اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر نعیم الرحمٰن، درجنوں دانشوران واہلِ علم اور ہزاروں کی تعداد میں شائقین زبان وادب بھی شریک تھے۔

یہ نو روزہ کتاب میلہ ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ اس میلہ کی غیر معمولی کامیابی میں میلہ کے انچارج جناب اجمل سعید اور سوسائٹی کی جانب سے میلہ کے کنوینر جناب پٹیل محمد یوسف کا کلیدی کردار رہا۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے جناب اجمل سعید صاحب کو اعزازی شیلڈ سے نوازا گیا۔

تقریب کے آخر میں قومی ترانہ پیش کیا گیا۔ اس تاریخی کتاب میلے کا باقاعدہ اختتام غزل سرائی کے خوب صورت پروگرام سے ہوا، جس میں رحمٰن علی اور ان کی ٹیم نے اپنی گلوکاری کا مظاہرہ کیا۔

■

Md Nayab Hasan
Batla House, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Mob.9560188574

ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل

درخشاں تاجور

اردو زبان وادب کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کا یہ بیان حیاتِ جاوداں کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

''اردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا ہے۔ بادشاہوں نے اسے منھ لگایا ہے۔ سپاہیوں نے زبانِ تیغ اور تیغ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور کا ادب ہے۔''

(بحوالہ 'اردو زبان وقواعد' (حصہ دوم) از شفیع صدیقی مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 2008، ص 1

ان کا یہ مقولہ جس وقت میں نے پڑھا تھا وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اس وقت نہ تو مجھے جمہوریت کا مطلب معلوم تھا اور نہ ہی میں اردو زبان وادب کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے اس زبان سے میری رغبت بڑھی مجھے پروفیسر آل احمد سرور کے اس بیان کی معنویت کا احساس بھی ہوا اور اردو زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ رفتہ رفتہ میں بھی اس خوبصورت زبان کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہوگئی اور اب میں بھی آنند نرائن ملا کے لفظوں میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتی ہوں کہ ؎

بزمِ ادب ہند کے ہر گل میں ہے خوشبو
ملا گل اردو کی مہک اور ہی کچھ ہے

یہ وہ زبان ہے کہ جو ہمیں تہذیب یافتہ بھی بناتی ہے اور شائستگی کا ہنر بھی سکھاتی ہے فراق گورکھپوری جو اس زبان کے عاشقوں میں سے تھے اکثر کہا کرتے تھے کہ ''اردو اس لیے بھی پڑھو کہ افسر بننے کے بعد افسر دکھائی دو''

(ماہنامہ اردو دنیا، اگست 2004، ص 5)

اردو کا اپنا ایک شاندار ماضی بھی ہے یہی وہ زبان ہے جس نے ہندوستان کی پوری جنگ آزادی کی تاریخ اپنے آپ میں سمو کر رکھا ہے۔ یہ زبان تحریکِ آزادی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلی ہے ملک کے سیاسی افق پر ابھرنے والی ہر تحریک کی موافقت میں نظمیں کہہ کر اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اپنا تعاون دیا ہے۔ آزادی کے متوالوں کو 'انقلاب زندہ باد' کا ولولہ انگیز نعرہ اسی زبان نے دیا ہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

(بسمل عظیم آبادی)

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے

(محمد علی جوہر)

جیسے اشعار سے سرفروشانِ وطن کے حوصلوں کو توانائی اسی زبان نے بخشی ہے۔ عباس بیگ بریلوی عباس اسی زبان کے شاعر تھے جن کے شعر ؎

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

کو انگریزوں نے بغاوت پر محمول کیا تھا اور انھیں پھانسی دے دی تھی۔

(1857 کے مجاہد شعرا از مولانا امداد صابری، مکتبہ شاہراہ دہلی، لکھنؤ 1959، ص 304)

بدرالاسلام بدایونی مشہور بھی اسی زبان کا شاعر تھا جسے ایک نظم کے کہنے پر سزائے موت دے دی گئی جس کا ایک مصرعہ تھا ؏

سر کمپنی کا کٹ کے پکاؤ آنے آنے میں

انھیں انگریزوں نے گولی مار کر شہید کیا تھا۔

(1857 کے مجاہد شعرا از مولانا امداد صابری ص 337)

اسی زبان کے صحافی مولوی محمد باقر بھی تھے، جنھیں 1857 کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کی مخالفت میں خبریں شائع کرنے کے جرم میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا تھا اور اپنی ساری جائداد سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔

(تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ از ڈاکٹر معین الدین عقیل ترقی اُردو کراچی 1976، ص 80)

بہادری پریس قائم کرنے والے سید قطب شاہ بریلوی بھی اسی زبان کے صحافی تھے جن کے پریس سے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کو فروغ دینے کے لیے بڑی تعداد میں لٹریچر شائع ہوتا تھا انگریزوں نے ان کی بھی ساری جائداد ضبط کر لی تھی اور انھیں بہ عبور دریائے شور کی سزا دی تھی۔

('اوراقِ زریں' از ڈاکٹر درخشاں تاجور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2017، ص 75 تا 80)

یہ تو فقط چند ادبا و شعرا تھے جنھوں نے ہندوستانیوں کے ذہن و دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت و عداوت کی چنگاریاں بھڑکا کر انھیں غیر ملکی غاصبوں کے خلاف سینہ سپر کرنے میں نہ صرف اپنا تعاون دیا بلکہ اپنا تن من دھن سب کچھ اس ملک پر خندہ پیشانی سے نچھاور کر دیا۔ انگریز اردو کے قلمکاروں سے جو ملک میں ان کے خلاف بے اطمینانی کے جذبات بھڑکا رہے تھے حد درجہ خائف تھے اور سراسیمگی کی حالت میں انھوں نے اس زبان کا بہت سا شعری و ادبی سرمایہ ضبط بھی کیا آج بھی بہت سا مواد نیشنل اور اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ہے اور جو ہندوستان کی جنگِ آزادی میں دیے گئے اردو کے شاندار اور مثالی کردار کی گواہی دے رہا ہے۔

یہ زبان ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی امین ہے سیکولرزم اس زبان کی خمیر میں ہے۔ یہ زبان صوفیوں اور درویشوں کی گود میں کھیلی ہے۔ خانقاہوں میں اس نے پرورش پائی ہے لہٰذا مذہبی رواداری تو اس کی روح میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اس زبان نے ہر دور میں دلوں میں محبت کے دیپ اور اتحاد و یکجہتی کی قندیلیں جلانے کا مقدس فریضہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ غلام ہندوستان رہا ہو یا آزاد ہندوستان اس زبان نے اقبال کے لفظوں میں اہل وطن کو یہی پیغام دیا ہے کہ ؎

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تحریر سے

ہندو مسلم اتحاد کے جذبات کو توانائی بخشنے کے لیے اردو میں دیے گئے سرسید احمد خاں کے اس بیان کا کیا کوئی مول ہے جس میں انھوں نے اہل وطن کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ:

''اے میرے دوستو! میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دولہن کی مانند ہے اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دولہن بھینگی ہو جاوے گی اور ایک دوسرے کو برباد کر دیں گے تو وہ کانڑی ہو جاوے گی... اب تم کو اختیار ہے کہ اس دولہن کو بھینگا بناؤ کہ کانڑا۔''

(مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز، مرتبہ جناب مولانا محمد امام الدین گجراتی

مصطفائی پریس لاہور 1900، ص 270)

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت اس زبان کو صرف مسلمانوں سے جوڑ کر اس کی توہین کی جاتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے اسے اپنا کر اسے سیکولر سانچے میں ڈھالنے میں معاونت کی ہے۔ فراخ حوصلگی اس زبان کی پہچان ہے تو دوسرے مذاہب کے عقائد کا احترام اس کا سرمایۂ افتخار۔ مذہبی رواداری کی جو مثالیں اس زبان نے پیش کی ہیں اس کی نظیر شاید ہی دنیا کی کوئی دوسری زبان پیش کر سکے اس کے ہندو شعرانے اگر عید، محرم، پیغمبران اسلام اور شہیدانِ کربلا پر عقیدت مندانہ نظمیں کہی ہیں تو اس کے مسلم شعرانے ہولی، دیوالی، مذہبی کتابوں اور دیوی دیوتاؤں پر نظمیں کہہ کر اپنی وسیع المشربی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کے گیسوئے سخن کو سنوارنے میں جتنا حصہ مسلمانوں نے لیا ہے اس سے کہیں زیادہ حصہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے لیا ہے۔ رام نرائن موزوں، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، پنڈت دتا تریہ کیفی، بالمکند عرش ملسیانی، لبھورام جوش ملسیانی، آنند نرائن ملاّ، فراق گورکھپوری، منشی پریم چند، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شاد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، مہندر پرتاپ چاند جیسی قدآور شخصیات نے اردو زبان و ادب کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اس زبان کا ایسا روشن باب ہے جسے اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

یہ اس زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اردو کو صرف ایک طبقے سے جوڑنے کے خلاف غیر مسلم ادبا اور شعرا نے زبردست احتجاج کیا ہے آنند نرائن ملاّ نے اپنے کرب کو اپنے ایک شعر میں ان الفاظ میں ڈھالا۔

لب مادر نے ملاّ لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا اب اس کو بھی غیروں کی زباں سمجھ

پروفیسر کنہیالال کپور نے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنے والوں کی مذمت کچھ اس انداز میں کی ہے:

''ایک وہ زمانہ تھا کہ اردو کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کس کی نظر کھا گئی کہ اس سے نظر بچا کر نکل جانے میں ہی خیریت سمجھی جانے لگی۔ ان دنوں ارباب وطن اس سے یوں بدکتے ہیں جیسے یہ کوئی خطرناک چیز ہو۔ ہندوستان میں اردو کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ اردو کے دشمنوں اور نادان دوستوں نے اسے مسلمانوں کی زبان بنا دیا۔ یہ خوبصورت زبان ہندوستانی اور اسلامی تہذیب کے امتزاج سے وجود میں آئی یہ مشترکہ تہذیب کی نشانی تھی اس کی سرپرستی ہر مذہب کے لوگوں نے کی آزادی کے بعد یہ فرقہ پرستوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔''

(ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی، اگست 2004، ص 16)

اقبال اشہر نے اپنے اشعار میں ایسے لوگوں کو کچھ اس انداز میں مخاطب کیا کہ۔

کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں مانا
دیکھا تھا کبھی میں نے بھی خوشیوں کا زمانہ
اپنے ہی وطن میں ہوں مگر آج اکیلی

خوش آئند بات یہ ہے کہ اب لوگوں کو یہ احساس ہونے بھی لگا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ 14 فروری 2004 کو قومی اردو کونسل کے سنگ بنیاد کی تقریب میں مرلی منوہر جوشی کے اس بیان کی پذیرائی اردو داں حلقے میں خوب ہوئی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ:

''اردو مسلمانوں کی نہیں ہندوستان کی زبان ہے۔ کوئی بھی زبان کسی خاص مذہبی فرقے کی نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان ہندوستانی تہذیب اور اس کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔'' (بحوالہ ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی اپریل 2004، ص 7)

یہ سوچ ہی غلط ہے کہ زبان کسی مذہب یا فرقے کی ہوتی ہے زبان اس کی ہوتی ہے جو اسے سیکھتا ہے۔ نازش پرتاپ گڈھی نے کیا خوب کہا ہے۔

ہر اک زبان کو یارو سلام کرتے چلو
گروہ کی ہے نہ فرقے کی اور نہ مذہب کی

اس صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو کے غیر مسلم شعرا و ادبا نے نہ صرف اس زبان پر ناز کیا ہے بلکہ انھوں نے اس زبان کی محبت میں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے۔ گوپال متل نے اگر یہ دعویٰ کیا کہ۔

ہم بھی اردو پہ ناز کرتے ہیں
یہ ہماری زبان ہے پیارے

تو پنڈت نرائن پانڈے اور جے بہادر سنگھ نے اس زبان کی محبت میں اپنی جانیں قربان کردیں۔ پنڈت نرائن پانڈے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے بھوک ہڑتال پر کانپور کے کلکٹر کے روبرو بیٹھے تھے جہاں 20 مارچ 1967 کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد اردو کا ایک اور عاشق جے بہادر سنگھ 31 مارچ کو لکھنؤ میں قانون ساز اسمبلی کے سامنے جاں بحق ہوگیا۔ اردو کے ان بے لوث عاشقوں نے اردو زبان کے لیے جو قربانی دی اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ناانصافیوں کے باوجود اردو مٹنے کے آثار نہیں۔ اس کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن ہے۔ انٹرنیٹ اور ٹکنالوجی نے اس زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو کی نئی بستیاں بھی آباد ہو رہی ہیں بیرونِ ممالک میں بھی بڑے پیمانے پر اردو اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں اور کالجوں یونیورسٹیوں میں اردو بہ حیثیت مضمون پڑھائی بھی جارہی ہے۔ سمینار اور مشاعرے کا انعقاد بھی ہو رہا ہے جو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختلف اکادمیاں اور این سی یو پی ایل بھی اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں اردو سیکھنے کے لیے کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

فضاؤں کو اردو کی خوشبو سے معطر کرنے کے لیے اردو کے چاہنے والوں کو آگے آنا ہوگا۔ انھیں انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی اس کی بقا کے لیے کوشش کرنی ہوگی جس سے تہذیب و ثقافت کی یہ زبان رہ سکے اور ہمارے اسلاف کی یہ امانت نئی نسلوں تک پہنچ سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سمینار اور مذاکرے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بچوں کو اردو سے قریب لانے کے لیے ان کے لیے تحریری اور تقریری مقابلوں کا انعقاد کرنا بھی اردو کے فروغ کی سمت میں ایک مثبت قدم ہوگا۔ اردو کو سادہ اور عام فہم بنا کر بھی اسے مقبولِ عام بنایا جا سکتا ہے۔ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ مختلف بورڈ میں اردو ایک مضمون کی حیثیت سے تو شامل ہے لیکن اردو پڑھانے کا انتظام کہیں نہیں ہے۔ ابتدائی درجات میں اس زبان کی تعلیم کا نظم نہ ہونے کی وجہ سے ایک پوری نسل اردو رسم الخط کی شناخت سے محروم ہو چکی ہے۔ اس سلسلے میں بھی کارگر اقدامات کیے جانے کی ضرورت ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم امید کی شمع روشن رکھیں اور آشا کے دیے کو بجھنے نہ دیں۔ مسلسل کوشش اور جدوجہد ہی اس زبان کو پھلنے اور پھولنے کے مواقع فراہم کر سکتی ہے بقول منظور ہاشمی۔

یقین ہو تو کوئی راستہ نکلتا ہے
ہوا کی اوٹ بھی لے کر چراغ جلتا ہے

اردو کے چراغ کی لو مدھم ضرور ہوئی ہے لیکن ابھی بجھی نہیں ہے۔ اس تھرتھراتی ہوئی لو کو جلا بخشنا ہماری اور آپ کی ذمے داری ہے۔ شکیل اعظمی کے اس شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرنا چاہوں گی۔

ہار ہو جاتی ہے جب مان لیا جاتا ہے
جیت تب ہوتی ہے جب ٹھان لیا جاتا ہے

■

Dr. Darakhshan Tajwar
Kainat, B/34, Tewari Pur
Aawas Vikas Colony
Gorakhpur- 273001 (UP)
Mob.: 7007281376

اردو زبان کا ارتقا

صبا ناز محمد انصاری

> **اردو ادب کی ایک طویل تاریخ ہے جس کے نمونے برصغیر ہند و پاک کے مختلف علاقوں میں ملتے ہیں اور ہر علاقے کے ادبی نمونے، گہری مماثلت کے باوجود ساخت و مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ یہ زبان جہاں جہاں پہنچی وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کرکے اپنی شکل بناتی رہی۔ اس کا ایک ہیولا سندھ و ملتان میں تیار ہوا پھر یہ لسانی عمل سرحد و پنجاب میں داخل ہوا جہاں سے تقریباً دو صدی بعد یہ دہلی پہنچا اور وہاں کی زبانوں کو جذب کرکے اور ان میں جذب ہو کر سارے برعظیم میں پھیل گیا۔**

جس طرح کائنات میں حیات کا ارتقا خود انسان کے ارتقا کی تاریخ بن جاتا ہے اسی طرح زبان کا ارتقا کسی تہذیب کی تاریخ کا زرّیں باب بن جاتا ہے۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے کہ انسان کے پاس بولتی ہوئی زبان ہے اور حیوان کی زبان گنگ ہے۔ یہی بولتی زبان انسانی شعور کی علامت ہے۔ اس کے دکھ درد، خوشی و غم، خیال، احساس، جذبہ اور فکر و تجربے کا اظہار ہے۔ اس سے زندگی میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے ہیں اور زندگی کے بڑھنے، پھیلنے اور بامقصد و بامعنی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے زبان معاشرت کے پہلے درجے سے شروع ہو کر انسانی معاشرت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ انسانی شعور اسے نکھارتا ہے، خیالات و فکر کا نظام اسے روشنی دیتا ہے۔ زندگی کے مختلف عوامل اور تجربے اسے بناتے سنوارتے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی، اعلیٰ اور ادنیٰ چیز یا تصور، تجربہ یا احساس زبان کا لباس پہن کر فہم کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ لسانی عمل اور ادب کی تخلیق کے درمیان وقت کا ایک طویل فاصلہ ہوتا ہے۔ بولی، صدیوں میں جا کر زبان بنتی ہے۔

اردو زبان و ادب کے ساتھ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح یہی عمل ہوا۔ مسلمان جب برصغیر ہند و پاک میں داخل ہوئے تو عربی، فارسی اور ترکی بولتے ہوئے آئے اور جب ان کا اقتدار ہوا تو فارسی سرکاری زبان ٹھہری۔ اس نے یہاں کی بولیوں پر اثر ڈالا۔ زبان کا بیج جاندار تھا، زمین زرخیز تھی۔ نئے کلچر کی کھاد نے ایسا اثر کیا کہ تیزی سے کونپلیں پھوٹنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک تناور درخت بن گیا۔

ان اثرات کے ساتھ یہ زبان تو ترقی کرتی رہی لیکن فارسی زبان نے اسے بہت کچھ دینے کے باوجود اپنے برابر کبھی جگہ نہ دی۔ فارسی زبان کے تسلط اور رواج کے سامنے ویسے تو یہ زبان سر اٹھا کر نہ چل سکی لیکن تہذیبی ولسانی اثرات کے دھارے اس زبان کے جسم میں نئے خون کا اضافہ اسی طرح کرتے رہے کہ فارسی، ترکی اور عربی الفاظ اس میں داخل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں جذب ہو گئے۔ نئے الفاظ، خیالات نے احساس و شعور کو نیا سلیقہ دیا اور اسی کے ساتھ ادبی تخلیق کا بازار گرم ہو گیا۔ اردو شعرا کے سامنے فارسی ادب و اصناف کے نمونے تھے لیکن انھوں نے ان دو نمونوں کا معیار بنایا اور دل و جان سے اسے قبول کر لیا۔

اردو ادب کی ایک طویل تاریخ ہے جس کے نمونے برصغیر ہند و پاک کے مختلف علاقوں میں ملتے ہیں اور ہر علاقے کے ادبی نمونے، گہری مماثلت کے باوجود ساخت و مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ یہ زبان جہاں جہاں پہنچی وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کرکے اپنی شکل بناتی رہی۔ اس کا ایک ہیولا سندھ و ملتان میں تیار ہوا پھر یہ لسانی عمل سرحد و پنجاب میں داخل ہوا جہاں سے تقریباً دو صدی بعد یہ دہلی پہنچا اور وہاں کی زبانوں کو جذب کرکے اور ان میں جذب ہو کر سارے برعظیم میں پھیل گیا۔

گجرات میں یہ زبان 'گجری' کہلائی۔ دکن میں اسے 'دکنی' نام سے پکارا گیا۔ کسی نے اسے زبانِ ہندوستان کہا کہ یہ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ کسی نے اسے ہندی یا ہندوی کہا، کسی نے اسے لاہوری یا دہلوی کے نام سے موسوم کیا۔ اسی حساب سے کسی نے اس کا رشتہ ناطہ برج بھاشا سے جوڑا کسی نے اسے کھڑی بولی سے ملایا۔ کسی

نے اسے زبانِ پنجاب کہا کسی نے سندھی کے علاقے کو اس کا مولد بتایا۔ مختلف زبانوں سے اس کا یہ تعلق اور مختلف زبانوں کے علاقوں میں اس زبان پر دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے سب سے فیض اٹھا کر اپنے وجود کو انفرادیت بخشی ہے اسی لیے یہ زبان برعظیم کی سب زبانوں کی زبان ہے۔

آج ہم جسے اردو کے نام سے پکارتے ہیں، جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور 'عربی، ایرانی، ہندی' تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے۔ اس زبان میں ان تینوں تہذیبوں کی ہمہ گیر صفات یکجا ہو کر ایک جان ہوگئی ہیں۔ یہ زبان برعظیم کی معاشرتی، تہذیبی، سیاسی ضروریات کے تحت پروان چڑھی، کوہِ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک سمجھی اور بولی جانے لگی۔

گجرات کے مشہور جین عالم ہیم چندر نے اپنی قواعد کی مشہور کتاب میں اپنے سے پہلے زمانے کی تصانیف سے اپ بھرنش کے جو دوہے لکھے ہیں، ان سے اس زبان کے رنگ و روپ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ہیم چندر کے مطابق برعظیم کی ساری جدید زبانیں اپ بھرنش ہی کے بچے ہیں مثلاً ایک دوہا ہے

بھلاَ ہو ماریا بہنی مہارا کنتو
لجے جم تو واسیا ہو، جئے بھگا گھر ونتو

(بھلا ہوا بہن! جو میرا کنتو (پیارا شوہر) مارا گیا، جو بھاگا ہوا گھر آتا تو ہم عمر سہیلیوں میں مجھے لاج آتی)

اس دوہے میں پنجابی، گجراتی، راجستھانی کھڑی، برج بھاشا وغیرہ کے ملے جلے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں۔ شورسینی اپ بھرنش کا قدیم روپ ہی ہے اور اردو اسی بین الاقوامی ملک گیر شورسینی اپ بھرنش کا جدید ترین روپ ہے۔ اپ بھرنش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کے تت سم (خالص) الفاظ بہت کم استعمال ہوتے تھے۔ اسی طرح پرتھوی راج اور اس کی بہن پرتھا بائی سے منسوب 'دان پتر' کی زبان حیرت ناک طریقے پر کھڑی بولی سے قریب ہے۔ جسے ہووے گا، دیوے گا، کرے گا، آویں گے، عربی فارسی کے الفاظ بھی شامل ہیں جیسے کھجانہ (خزانہ)، ماف (معاف)، کھاتر (خاطر)، ہجور (حضور)، ہاجر (حاضر) وغیرہ۔

آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے سندھ پر حملہ اور اس پر قبضہ کر لیا۔ پھر دسویں اور گیارہویں صدی میں بڑی تعداد میں درہ خیبر کے راستے سے سارے پنجاب میں پھیل گئے۔ تقریباً 200 سالوں تک وہاں بسنے والوں میں میل جول بڑھتا رہا۔ اب یہ ملی جلی زبان لشکر کہلانے لگی۔

اب جس طرح پنجاب میں پنجابی بن رہی تھی اسی طرح دلی اور اس کے نواحی علاقے میں اردو بن رہی تھی۔ جب دلی پائے تخت بنی تو اردو کا رواج بڑھتا گیا۔ دلی کے پوربی علاقے کی زبان کھڑی بولی کہلائی اور اس میں عربی، فارسی کے الفاظ شامل ہونے لگے اور فوجوں کے ساتھ پھیلنے لگے۔ اس لیے کھڑی بولی نکھر کر اردو میں ضم ہوگئی اور نثر میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ریختہ میں شعر کہے جانے لگے۔ اس بات کو مرزا غالب نے بھی کہا تھا کہ

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

فوج میں ہر طرح کے لوگ تھے اس لیے ان کو ایک زبان بولنا ضروری تھا۔ اس وقت اردو کے اثرات عام ہوتے جا رہے تھے اس لیے انھوں نے اسے اپنا لیا۔ فقیروں اور صوفیوں نے بھی اردو زبان کو پھیلایا۔ اس کے بعد سب سے زیادہ امیر خسرو نے اردو کو فروغ دیا، یہ اچھے شاعر بھی تھے۔ امیر خسرو کو ہندی بولنے والے اپنا کوی مانتے ہیں اور اردو والے اپنا شاعر۔ اس کا انھوں نے خود اعتراف کیا ہے:

''جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ ست۔ سیخا ہم بذخرے بس کردم و نظر برآں دستہ شتم کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن لطفے اندارد مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بودہ است آوردہ شدہ''

اس طرح اردو دلی کے قریب پیدا ہوئی اور نکھرنے لگی، پھر شاعروں اور ادیبوں نے اسے کافی فروغ دیا۔

"آج ہم جسے اردو کے نام سے پکارتے ہیں، جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور 'عربی، ایرانی، ہندی' تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے، اس زبان میں ان تینوں تہذیبوں کی ہمہ گیر صفات یکجا ہو کر ایک جان ہوگئی ہیں، یہ زبان برعظیم کی معاشرتی، تہذیبی، سیاسی ضروریات کے تحت پروان چڑھی، کوہِ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک سمجھی اور بولی جانے لگی۔"

اردو نظم کی ترقی نثر سے پہلے ہوئی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ پہلے نظم ابھری اور نثر بعد میں سامنے آئی۔

اردو کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق بعض محققین نے اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کیا ہے۔

بقول محمود خان شیروانی، اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی اور پنجاب سے ہجرت کر کے دلی پہنچی۔ انھوں نے اس بیان کے ثبوت میں بعض تاریخی دلائل پیش کرنے کے علاوہ پنجابی اور اردو بالخصوص قدیم دکنی اردو کی مشترک لسانی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ پنجابی اور اردو صرف ونحو کے تقابلی مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنی تحقیقی تصنیف 'مقدمہ تاریخ زبانِ اردو' میں محمود شیروانی کے اس نظریے کی بڑی خوبی کے ساتھ تنقید کی ہے اور متعدد مثالوں اور دلیلوں کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی کی خصوصیات محمود شیروانی پنجاب سے منسوب کرتے ہیں، وہ دہلی اور نواح دہلی کی بولیوں بالخصوص ہریانی میں بھی پائی جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد کے علاوہ اور دکنی مصنفین بھی اردو کو برج کے ساتھ منسوب کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ مثلاً آزادی سے قبل میر امن، سرسید احمد خان اور امام بخش صہبائی اور آزادی کے بعد سید شمس اللہ قادری کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں جن کی تحریروں میں اس نظریے کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی تصنیف 'داستانِ زبانِ اردو' میں اردو کے آغاز و ارتقا کے تعلق سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے بعد اپنا الگ نظریہ پیش کیا جس کے مطابق اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں گیارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ وہ کہیں کہیں اردو، ہندوستانی اور کھڑی بولی تینوں کو ایک ہی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ بھی ہے کہ کھڑی بولی ہندوستانی یا دوسرے لفظوں میں اردو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔

دکن میں اردو

خلجی دور میں اسلامی فوجیں دکن میں داخل ہوئیں تو آپسی میل ملاپ سے اردو زبان کو بہت فائدہ ہوا۔ 1339 میں محمد تغلق نے دیوگیری کو دارالسلطنت بنایا اور شمالی ہند سے ہزاروں لوگوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ دونوں کے ملاپ سے قدیم اردو جو وجود میں آئی یہی دکنی اردو

کہلائی۔ صوفیوں نے دکنی اردو میں تبلیغ کا کام کیا تو اس دور میں بندہ گیسو دراز نے دکنی اردو میں کئی رسالے لکھے معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود تصنیف کیں۔ فخر دین نظامی درباری شاعر نے مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ اسی دور کے دوسرے مشہور شعرا میراں جی، شمس العشاق اور شاہ برہان الدین جانم ہیں۔ ان صوفیوں کے بابرکت ہاتھوں سے دکنی اردو کو فروغ ہوا اور یہ زبان ترقی کی راہ پر گامزن رہی۔ ان کی بدولت دکنی نثر و نظم دونوں کو فائدہ ہوا۔ بہمنی سلطنت کے بعد احمد نگر میں نظام شاہی حکومت کا آغاز ہوا اور اس دور میں اشرف بیابانی نے ایک طویل مثنوی 'نوسر ہار' لکھی جس میں کربلا کے واقعات کو داستانی انداز میں نظم کیا۔ یہ مثنوی ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ شیخ حسن شوقی نے دو مثنویاں لکھیں جن میں 'ظفر نامہ نظام شاہ' اور دوسری 'میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ'۔ اردو زبان کو اس کے عہد میں بڑی ترقی ملی۔ گولکنڈہ میں بڑی ترقی ملی۔ گولکنڈہ کے علاقے پر قطب شاہی دور میں بڑی ترقی ہوئی۔ قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ تینوں اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تسلیم کیا گیا۔ اس کے عہد میں ملا وجہی نے 'قطب مشتری' اور 'سب رس' لکھی۔ عبداللہ قطب شاہ نے تین مثنویاں لکھیں، اس طرح قطب شاہی دور میں اس میں بڑی ترقی ہوئی۔

ولی دکنی اورنگ آباد کے تھے۔ انھوں نے اردو شاعری میں بڑا نام پیدا کیا اور ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ عاشقانہ شاعری نے ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ جب یہ اورنگ آباد سے دہلی آئے تو دہلوی رنگ ان پر خوب چڑھا ہوا تھا۔

پروفیسر مسعود حسین خان نے دکن میں اردو کی ابتدا اور ترقی کے بارے میں لکھا ہے کہ، ''اردو پیدا ہوئی دہلی اور اس کے نواح میں لیکن ادبی حیثیت سے بعض تاریخی وجوہ کی بنا پر پروان چڑھی دور دراز دکن میں جہاں یہ پہلی بار فتوحات علائی کے ذریعے چودھویں صدی کی ابتدا میں پہنچی۔ محمد بن تغلق نے 1327 میں دولت آباد کو دارالسلطنت بنانے کی ناکام کوشش کر کے اس کے قدم نواح اور اورنگ آباد میں جما دیے اور پھر بالآخر بہمنی سلطنت کے قیام کے بعد اس کا چلن 1347 میں مراٹھی، تیلگو، کنڑ کے علاقے میں روز بروز بڑھتا گیا۔ چودھویں صدی سے اس میں مسلسل تصانیف کا سلسلہ ملتا ہے جو 1700 بلکہ اس کے بعد تک جاری رہا۔ اس کی پہلی مستند تصنیف فخر دین نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' (لگ بھگ 1434) اور آخری ادبی کارنامہ محمد ابراہیم کی 'دکنی انوار سہیلی' (1724) ہے۔''

دکن میں سب رس (ملا وجہی) پہلی کتاب نہیں بلکہ اب تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فخر دین نظامی کی 'کدم راؤ پدم راؤ' (1421 تا 1435) پہلی تصنیف ہے۔

قلی قطب شاہ کے دور میں اردو کو بڑی ترقی ہوئی۔ یہ بڑا باصلاحیت تھا۔ اردو میں شاعری میں بہت نام پیدا کیا۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے علما اور شاعر جمع تھے۔ اس کے کلام کا مجموعہ 1616 میں سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کیا۔

ملا وجہی جو ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں پیدا ہوئے ان کا شمار اس دور کے کامیاب شعرا میں ہوتا ہے۔ وجہی کا سب سے بڑا کارنامہ 'سب رس' ہے۔ یہ دکنی زبان میں ہے۔ اس کے پُرانے الفاظ اور محاورے سمجھ میں نہیں آتے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وجہی نے نثر کے پیرائے میں شعریت پیدا کی۔ اردو نثر کو یہ نیا انداز انہی کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'تاج الحقائق' بھی لکھی۔ سب رس قدیم اردو نثر میں خاص اہم مقام رکھتی ہے۔ ملا وجہی اپنی زبان کو دکنی نہیں کہتا لیکن قصے کے شروع میں زبانِ ہندوستان لکھتا ہے۔ جگہ جگہ ہندی، مراٹھی، عربی، فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ اس کی زبان 300 سال سے زیادہ پرانی ہے جو اب متروک ہے۔

دکنی دور میں ابن نشاطی، فائز، غواصی، نصرتی، عظیم شاعر گزرے ہیں۔

شمالی ہند میں اردو

شمالی ہند میں 1700 میں ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی کا ارتقا ہو چکا تھا لیکن برج بھاشا کی ادبی حیثیت ابھی تک مسلم تھی۔ شاہجہاں کی آگرے سے دہلی واپسی کے بعد ممکن ہے زبانِ دہلی کو اور شہرت ملتی۔ اگر اورنگ زیب دکن جا کر وہیں کا نہ ہو جاتا۔ درحقیقت شاہجہان آباد ابھی مکمل طور پر ادبی و لسانی مرکز بننے نہیں پایا تھا کہ اورنگ آباد ہو گیا۔ اورنگ زیب کی فتح بیجا پور اور گولکنڈہ کے بعد شمالی دکن کے تہذیبی باب پھر کھل گئے۔ اس زمانے میں شعراء، ادبا اور اہلِ علم کی جس قدر آمد و رفت دہلی اور دکن کے درمیان رہی ہے اس کی نظیر کسی اور زمانے میں نہیں ملتی۔ اورنگ زیب حکمرانی کی ایک طویل مدت ختم کرنے کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہوتا ہے۔ بادشاہت پھر لال قلعہ اور دہلی کو لوٹ آئی ہے۔ اس وقت زبانِ دہلی تبدیلی کے لیے تیار تھی۔ لوگ فارسی سے اوب چکے تھے۔ اسی زمانے میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے کوچہ و بازار میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جوشِ طبع میں دہلی کے شعرا نے نہ صرف ولی کی اسلوب شعر کی پیروی کی بلکہ اکثر ولی کے زبان کے ایسے متروک الفاظ تک استعمال کر گئے جو 'بموافق محاورہ شاجہاں آباد' نہ تھے۔

شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر جمیل جالبی کے مطابق شاہ مبارک آبرو ہیں نہ کہ نواب صدر الدین فائز۔ وہ اٹھارہویں صدی کے آغاز کی زبانِ دہلی کے پہلے نمائندے ہیں لیکن شمالی ہند کی مستند ادبی کتاب 'محمد افضل افضل بکٹ کہانی' ہے یہ پہلا مربوط شعری کارنامہ ہے۔

اردو شاعری کی ابتدا اور ارتقا

ادب میں اردو شاعری کی ایک خاص اہمیت ہے اس میں حسن و عشق کے نغمے مختلف انداز میں جلوہ گر ہوتے ہیں گویا اس میں خیالات و تجربات کی رنگارنگی، جذبات کی شدت و رنگینی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ شاعری کی اصناف میں غزل، قصیدہ، مرثیہ قطعہ اور رباعی بہت مشہور ہیں۔ ان میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں کشش اور جاذبیت دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے صنف غزل اردو شاعری کی جان ہے۔

سلطنت مغلیہ کا آخری زمانہ اردو شاعری کے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا قیام کلکتہ میں ہوا اور اسی کے ساتھ اردو کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔ اس دور کے شاعروں میں جرأت، انشاء، رنگین، نظیر اکبرآبادی، ذوق، غالب، ظفر، ناسخ، آتش وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ غزل کو اس دور میں خاص طور پر نمایاں حیثیت ملی۔ 1857 سے 1905 تک اردو شاعری نے نئی کروٹ لی۔ اس میں مرثیے کو نمایاں ترقی ملی۔ حالی نے مسدس کے ذریعے عوام کے جذبات ابھارے۔ اسمٰعیل میرٹھی، مجروح، امیر، داغ، انیس و دبیر مشہور ہیں۔

1905 سے 1938 تک انقلابی دور شروع ہوا۔ اس عہد میں قصیدہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا اور مرثیے اپنی آخری سانسیں پوری کرنے لگے۔ غزل کا رنگ بدل گیا۔ غزل قدیم کا تاج میر تقی میر کے سر پر اور جدید کا شاد عظیم آبادی کے سر پر رکھا گیا۔ اس دور میں شاد، غالب، اکبرالہٰ آبادی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، چکبست، سیماب، یگانہ، جوش، اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

■

Saba Naz Mohd Ansari
House No.: 564, Gali No.: 12, Islampur
Malegaon- 423203 (MS)
Mob.:7020326095

ابوشہیم خان

یاس یگانہ چنگیزی کی تخلیقی انانیت

بیسویں صدی کے اوائل میں یہ تصور عام ہو رہا تھا کہ اردو شاعری کی آبرو یعنی غزل پر قدامت کا غلبہ ہے۔ یہ کسی قدر ہیئت اور موضوع کے مخصوص دائروں میں محبوس ہے۔اس لیے اسے نئے ذائقے، نئے اظہار و انداز سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے۔ گرچہ اس تصور نے بعد میں تضحیک واستہزا اور اینٹی غزل کی صورت بھی اختیار کر لی اور غزل کے بنیادی اوصاف اور شناخت نامے پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا۔لیکن جن شعرا نے اس غیر ترجیحی ماحول میں بھی شاعری میں نئے تجربے کیے، شاعری کو تصنع سے آزاد کرنے اور فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کیں۔ فکر کو رفعت و وسعت اور زبان و بیان کو سلاست عطا کی۔ گیسوئے غزل کو مزید تابدار کیا اور آخر کار غزل کی نئی کروٹ یا بعض کے لفظوں میں نشاۃ الثانیہ کا سبب بنے ان میں علامہ اقبال،شاد عظیم آبادی،عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، نوبت رائے نظر، ریاض خیر آبادی، جلیل مانک پوری، فانی بدایونی، آرزو لکھنوی، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے ساتھ مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی (1884 تا 1956) کا نام نامی بھی شامل ہے۔

یاس یگانہ چنگیزی نے مختلف حوالوں سے پٹنہ، کلکتہ، لکھنؤ، لاہور، علی گڑھ، حیدر آباد، عثمان آباد، لاتور جیسے شہروں میں قیام کیا لیکن ان کی بیگانہ روی اور بیگانہ خوئی کو کہیں بھی قرار نہیں ملا۔ وہ پوری زندگی انانیت بنام انفرادیت کی،خود پرستی بنام حق پرستی کی، اصول پسندی بنام کلبیت پسندی کی جنگ لڑتے رہے۔لوگوں کو میر و غالب سے اپنی ہمسری باور کراتے رہے اور خود ابوالمعانی اور امام الغزل ہونے کا اعلان کر کے کہتے رہے کہ ع

جلوہ فرما حق ہوا باطل گیا

اور

شہرہ ہے یگانہ تیری بیگانہ روی کا
اللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

کون ہوں کیا ہوں مجھے دیکھ لیں اہل نظر
آبروئے لکھنؤ خاک عظیم آباد ہوں

لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ یگانہ کی شخصیت اور فن کے معدودے چند ہی قائل تھے۔ کلام میں تنوع، تغزل اور پابستگی رسم و رہ عام سے بے نیازی، آزادی، بانکپن اور پر زوری کے باوجود عام ناقدین فن کو ان کی ذات سے اور ان کی شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اعلی ترین مذہبی شخصیات پر اعتراض، مرزا غالب،علامہ اقبال،جوش ملیح آبادی اور اصغر گونڈوی، حسرت موہانی اور اپنے اکثر معاصرین شعرا سے بد اطمینانی یا شدید مخالفت اور غالب شکن و شہرت کاذبہ کے مانند دیگر ہنگامے اس پر مستزاد۔ حقیقت یہ ہے کہ یگانہ جب 1905 میں اکیس سال کی عمر میں عظیم آباد (پٹنہ) سے لکھنؤ آئے تو اس وقت لکھنؤ میں صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی اور عزیز لکھنوی، محشر، آرزو وغیرہ جیسے غالب ممدوحین کا اور نیاز فتح پوری، شاہد دہلوی، ماہر القادری اور عبدالماجد دریابادی وغیرہ جیسے صاحب علم ادیبوں کا دور دورہ تھا۔اس لیے بھی ان کی پذیرائی اس طرح نہیں ہو سکی جس کے وہ متمنی یا کسی حد تک مستحق تھے۔ حالانکہ ان کے ادبی کارنامے خصوصاً شعری طرز فکر، لہجے کی انفرادیت، بلند خیالی اور نئی غزل کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوششیں اور مختلف کتابیں جیسے نشتر یاس (دیوان)، چراغ سخن (رسالۂ عروض و قوافی)، شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز، آیات وجدانی، ترانہ (مجموعہ رباعیات)، غالب شکن (مکتوب بنام سید حسن رضوی) اور گنجینہ وغیرہ ایسے کارنامے تھے کہ ان کا شمار اردو کے قابل ذکر شعرا میں کیا جانا چاہیے، لیکن ان کا معرکانہ اور معاندانہ تیور، ادبی معرکے کو مذہبی معرکے میں بدل دینا اور اس میں حد درجہ تجاوز کر جانا اور انانیت و تعلی کی ساری حدیں پار کر جانا (شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز اور غالب شکن جیسی کتابیں) ایسے اسباب ہوئے جو کسی بھی عقل سلیم رکھنے والے شاعر یا عام شخص سے متوقع نہیں تھے۔ یاس یگانہ چنگیزی کا تعلیانہ دعوی ملاحظہ کریں:

''سچ تو یہ ہے کہ اس صدی میں یگانہ کے سوا اور کسی کو شاعر سمجھنا محض خود فریبی ہے۔''

''اس دور نے میرا کوئی حریف پیدا نہیں کیا۔ موجودہ دور کی لاشوں سے ٹکرانا مجھے پسند نہیں۔''

(آیات وجدانی: یاس یگانہ چنگیزی، ناشر مبارک علی تاجر کتب لاہور ص 11)

4 191 میں جب یگانہ نے اپنا دیوان 'نشتر یاس' شائع کیا تو اس کے مقدمے میں تعلی سے کام لیتے ہوئے لکھا تھا کہ لکھنؤ کے معاصرین حال اور آئندہ نسلوں پر فرض ہے کہ یاس یگانہ چنگیزی کی زبان اور اجتہادی تصرفات سے سند لیں۔ اس طرح انھوں نے ثاقب، صفی، عزیز اور دوسرے معاصرین سے مطالبہ کیا کہ وہ انھیں استاد فن تسلیم کرکے ان کی پیروی کریں۔ اس طرح کی تعلیوں اور ثاقب، صفی، عزیز کی ضد میں اسد اللہ خاں غالب کے خلاف نازیبا اور ناشائستہ باتیں (رباعیاں)، علامہ اقبال (اکبال) سے نفرت، نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی، قرآن مجید پر اختلافی نوٹ نے یاس یگانہ چنگیزی کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا۔ بہر کیف چند صاحب نظر تھے جنھوں نے یاس یگانہ چنگیزی کے ساتھ ہمدردانہ اور معتدل رویہ اپنایا اور بڑے سلیقے اور مستند حوالوں کے ساتھ جدید اردو شاعری میں ان کے مقام کا تعین کیا۔ جب شہر لکھنؤ یاس یگانہ چنگیزی کے خلاف تھا تب پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے ان کے کلام کا ہمدردانہ تجزیہ کیا اور ان کے کلام کی داد دی۔ وہ پہلے ناقد تھے جنھوں نے یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری کی قیمت کا تعین کیا۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری مشہور رسالہ 'نگار' جنوری 1942 کے شمارے میں یگانہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ غزل کو جواب تک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے یگانہ نے زندگی کی شاعری بنا دیا اور انسان اور کائنات کی ہستی کے رموز و اشارت کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا... یگانہ اس کشاکش اور تصادم کا احساس ہمارے اندر بڑی سہولت اور کامیابی کے ساتھ پیدا کر دیتے ہیں جو زندگی کا اصل راز ہے اور جس کا احساس عصر جدید کا سب سے بڑا اکتساب ہے... ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم و اعتماد ہے۔ انھوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے۔ روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کرکے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے... یگانہ کی شاعری ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی اک جدلیاتی حقیقت ہے اور تصادم و پیکار اس کی نمو اور بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔''

(نگار [معاصر غزل گویوں پر تنقید نمبر] مدیر: نیاز فتح پوری جنوری 1942)

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے علاوہ اردو مرثیہ اور ڈراما کے بڑے محقق اور لکھنوی تہذیب کے نمائندہ سید مسعود حسن رضوی ادیب بھی یگانہ کے فن کے قائل ہیں اور انھیں یگانہ کی ذات سے پوری ہمدردی ہے۔ مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی مایہ ناز کتاب 'ہماری شاعری' جسے مقدمہ شعر و شاعری (حالی) کا جواب اور تتمہ بھی کہا جاتا ہے، میں اردو غزل کے دفاع اور اعلی اردو شاعری کی مثالوں کے لیے مختلف مقامات پر یگانہ کے اشعار نقل کیے ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب اور یاس یگانہ چنگیزی کے مابین دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہر سطح پر مکمل خیال رکھتے تھے۔ حتی کہ لکھنؤ میں دونوں کی قبریں بھی ایک ہی قبرستان کربلائے منشی فضل حسین میں ہیں۔ یگانہ بھی خلاف فطرت مسعود حسن رضوی ادیب کی بڑی قدر کرتے تھے۔ 1930 میں 'ہماری شاعری' پر صابر علی خاں نے اعتراضات کیے تو اس کے جواب میں یگانہ لکھتے ہیں کہ:

''وہ کون صاحب ہیں جنھوں نے 'ادبی دنیا' میں سید مسعود حسن رضوی ادیب کی معرکۃ الآرا کتاب 'ہماری شاعری' پر حاسدانہ حملے کیے ہیں۔ یہ تو وہ کتاب ہے جو یورپ زدہ اصحاب کی غلامانہ ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتی ہے۔''

سید مسعود حسن رضوی ادیب کے صاحبزادے اردو کے ممتاز ترین جدید افسانہ نگار اور ناقد نیر مسعود بھی یاس یگانہ چنگیزی کے فن کے قائل اور ہمدرد تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے لیے ایک کتاب 'یگانہ: احوال و آثار' لکھ کر بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ منفی ردعمل، تنقید سے تنویر فن کے بجائے آمریت کے اظہار اور تعجیلی فیصلوں کے لیے مشہور باقر مہدی اپنے مضامین کے مجموعے 'آگہی و بے باکی' میں لکھتے ہیں کہ میر و غالب کے بعد تیسرا نام جو سب سے زیادہ احترام اور اہمیت کا مالک ہے وہ یگانہ کا ہے اور یگانہ کے بعد ان جیسا اب کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ وسیم فرحت علیگ نے بھی یاس یگانہ چنگیزی کے خطوط کو یکجا کرکے، ان پر تنقیدی و تحقیقی کتاب اور مونوگراف لکھ کر دنیائے ادب کے سامنے ان کی شخصیت کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔ راہی معصوم رضا نے بھی اپنے تحقیقی مقالے 'یاس یگانہ چنگیزی' میں ان کی شخصیت، اس کے منظر پس منظر، یاس عظیم آبادی سے یگانہ چنگیزی بننے کے سفر، حالات و کوائف اور جدید غزل میں ان کی اہمیت اور مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی غیر جانب دارانہ کوشش کی ہے۔ راہی معصوم رضا اس تحقیقی مقالے کی ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یگانہ ایک بحث طلب شخصیت ہیں۔ ان کے بارے میں نہ تو ان کی زندگی میں غیر جانب داری اور ناقدانہ ہمدردی سے سوچا گیا اور نہ ان کے مرنے کے بعد۔ 'غالب شکن' اور 'شہرت کاذبہ' کے ہنگاموں میں یہ بات تقریباً نظر انداز کر دی گئی کہ یگانہ شاعر بھی تھے۔ اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ یگانہ اور ان کی شاعری کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کیا جائے اور جدید اردو شاعری میں ان کے مقام کا تعین کیا جائے۔ میں نے غیر جانب دار رہنے کی کوشش کی ہے لیکن یگانہ سے اتنی ہمدردی ضروری ہے جتنی ہمدردی کا تقاضا فریضۂ نقد کرتا ہے... میں نے کوشش کی ہے کہ بزم شعر میں یگانہ کو وہ جگہ مل جائے جس پر ان کا حق ہے۔''

یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ غزل کو جواب تک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے یگانہ نے زندگی کی شاعری بنا دیا اور انسان اور کائنات کی ہستی کے رموز و اشارت کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا... یگانہ اس کشاکش اور تصادم کا احساس ہمارے اندر بڑی سہولت اور کامیابی کے ساتھ پیدا کردیتے ہیں جو زندگی کا اصل راز ہے اور جس کا احساس عصر جدید کا سب سے بڑا اکتساب ہے... ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم و اعتماد ہے۔ انھوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے۔ روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کرکے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے... یگانہ کی شاعری ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی اک جدلیاتی حقیقت ہے اور تصادم و پیکار اس کی نمو اور بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔

(یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا: شاہین پبلشر الہ آباد 1967 ص 8)

اس تحقیقی مقالے میں پہلے یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت اور ان کے حالات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے یاس عظیم آبادی کو یگانہ چنگیزی اور میر و انیس کے دلدادہ اور 'خاک پائے آتش' کو امام الغزل، ابوالمعانی اور یگانہ علیہ السلام بنا دیا اور خود کے لیے The Arch Artist- Poet of India کا فرمان جاری کرنا پڑا۔ اور 'غالب شکن' کا انتساب ان الفاظ میں کرنا پڑا۔

'تحفۂ غالب شکن

بجناب ہیبت مآب، دیوتائے جلال و عتاب، پیغمبر قہر و عذاب، دشمن تہذیب پرفن، حق شناس باطل شکن مرد میدان بگیر و بزن۔

شہنشاہ بنی آدم، سرتاج سکندر و جم، حضرت چنگیز خاں، اعظم قہر اللہ''۔ اور ترانہ کی ایک جلد پر یہ عبارت لکھنی پڑی:

"Omer Khyam challenged (as for as poetic Art is concerned) "

ان عبارتوں سے صرف ان کے مخاصمانہ اور معرکانہ رویے کا ہی اندازہ نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کی ضد، اکھڑپن، بے خوفی، انانیت پسندی اور خود پرستی کے ساتھ احساس کمتری اور احساس شکست کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے اندر منفی رویوں کو پروان چڑھانے میں صرف ان کی کج فہمیوں کو دخل نہیں تھا بلکہ وہ حضرات بھی اس کے ذمے دار تھے جنھوں نے ان کے ساتھ ہمیشہ مخاصمانہ، معاندانہ اور معرکانہ رویہ روا رکھا اور ان کے ساتھ علمی اور سماجی سطح پر نبرد آزما رہے اور ان کے ساتھ معتدل اور ہمدردانہ رویہ نہیں اپنایا۔

یگانہ کو چنگیزی، خاک پائے میر و آتش کو امام الغزل، ابوالمعانی اور یگانہ علیہ السلام بنانے والے عوامل و عواقب کا تجزیہ کرتے ہوئے راہی لکھتے ہیں کہ ''یگانہ کی شخصیت میں بڑے بل تھے۔ لکھنؤ والوں کی مخالفت، غیر ذمے دار نقادوں کی ناوک زنی، اور ذمے دار نقادوں کے تغافل نے ان بلوں کو اور سخت کر دیا۔ چنانچہ اپنی انا کے خلا میں 'پر پھڑ پھڑانے والا یہ فرشتہ' اسی خلا میں کھو گیا۔ یگانہ اردو غزل کا المیہ ہے۔ اس المیے میں ایک خاص طوالت بھی ہے، ابتدا، وسط اور انجام بھی ہے۔ جلال بھی ہے اور تزکیہ بھی۔ ارسطو نے بھی المیہ سے اس کے علاوہ کوئی اور مطالبہ نہیں کیا۔''

(یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا: شاہین پبلشر الہ آباد 1967، ص 32)

ناقدین فن یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت اور شاعری کے 'منظر و پس منظر' کا محاکمہ کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی تخلیق یا صنف کا مطالعہ اس کے گرد و پیش اور سیاسی، سماجی و معاشی سیاق میں ہی کیا جانا چاہیے۔ یاس یگانہ چنگیزی بھی دوسرے شعرا کی طرح اپنے گرد و پیش سے باخبر تھے گرچہ حالات، نقادوں کی ناوک زنی، اور تغافل، قومی تحریکوں سے علاحدگی، احساسِ تنہائی و کمتری اور حد درجہ انانیت و خود پسندی نے ان کی شاعری کو 'جبروتی رخ' دے دیا تھا لیکن ایک معروضیت پسند اور غیر جانب دار نقاد کو ان سیاق اور حالات پر بھی نظر رکھنی ہوگی جن حالات میں وہ شاعری کر رہے تھے۔ یاس یگانہ چنگیزی نے اپنی شاعری کے بارے میں فراق گورکھپوری کو لکھا تھا کہ ''ہر جنس کا آرٹ خود اپنے معیار پر پرکھا جاتا ہے۔ پرانے معیار پر نہیں''۔ مشہور شاعر و نثر نگار باقر مہدی بھی دوسرے ناقدین کی آرا کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' شاعری فقط سپاٹ حقیقت نگاری کا نام نہیں بلکہ حقیقت کو شاعرانہ انداز کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔''

(آگہی و بے باکی: باقر مہدی: گوشۂ ادب ارکیڈیا بلڈنگ بمبئی، ص 102)

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو ظالم پر سادگی برستی ہے
ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا
کمال صبر ملا صبر آزما نہ ملا
حسن بے تحاشہ کی دھوم کیا معمہ ہے
کان بھی ہیں نا محرم آنکھ بھی ترستی ہے
خدا معلوم کیسا سحر تھا اس بت کی چتون میں
چلی آتی ہیں اب تک کشمکشیں شیخ و برہمن میں

یاس یگانہ چنگیزی کے بہت سے اشعار اردو کی کلاسیکی شعری روایت اور عصری آگہی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان اشعار کو کسی بھی کلاسکی یا جدید پیمانہ نقد پر جانچیں پرکھیں یاس یگانہ چنگیزی کے کمال فن کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ ان کی شاعری لکھنؤ کی عام حرماں نصیبی، زندگی سے فرار اور بے زاری کے احساس کے برعکس پامردی، عزم و حوصلہ اور سعی و پیکار یا بقول مجنوں گورکھپوری 'مردانگی' کی نمائندہ ہے۔ یگانہ جس زمانے میں شاعری کر رہے تھے اس وقت اردو غزل نئی کروٹ لے کر ایک نئے سمت میں سفر کر رہی تھی اور معشوق، رقیب، شیخ محتسب، کعبہ و بت خانہ جیسی غزل کی علامتیں جدید معنوں میں استعمال ہو رہی تھیں۔ غزل کی فارسی نژادیت ختم ہو رہی تھی اور ہندوستانی عناصر کا تناسب بڑھتا جا رہا تھا اور غزل خالص ہندوستانی صنف سخن بنتی جا رہی تھی۔ اسی سیاق میں یاس یگانہ چنگیزی، حسرت موہانی، علامہ اقبال، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی وغیرہ کی شخصیتیں بنی بگڑی ہیں اور اسی سیاسی، سماجی و معاشی اور ادبی پس منظر میں یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری کا بھی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

مجنوں گورکھپوری، مسعود حسن رضوی ادیب، راہی معصوم رضا، باقر مہدی اور نیر مسعود وغیرہ یگانہ چنگیزی کے مختلف اشعار کے توسط سے ان کی نظریاتی کشمکش اور اہل لکھنؤ سے معرکہ آرائی کا جواز تلاش کرتے ہیں اور مختلف حوالوں سے ان کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یگانہ چنگیزی کی طرح اسی انداز کی شاعری اور نثر دوسرے ادیبوں نے بھی تخلیق کی لیکن انھیں وہ اذیتیں اور رسوائیاں نہیں جھیلنی پڑیں جو یگانہ چنگیزی کے حصے میں آئیں۔ بہر کیف مندرجہ بالا ناقدین مختلف شعری حوالوں سے یگانہ چنگیزی کی فوقیت اور برتری ثابت کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں کہ یگانہ چنگیزی ایک حساس، بے باک اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اہل لکھنؤ کی طرح ان کے یہاں لفظی بازیگری نہیں ہے اور ان کی شاعری لفظوں اور سندوں کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اور ان کی شاعری زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز ہیں۔ وہ بت پرستی نہیں بت شکنی کے دلدادہ ہیں۔ اسی لیے قدیم سے قدیم اور مسلمہ شعری و فکری روایت سے انحراف میں انھیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی ہے۔ یگانہ چنگیزی کی اپنی صلاحیتوں پر حد سے زیادہ اعتماد، بے جا خود داری و خود اعتمادی نے انھیں خود پرست اور انا پرست اور ناقدین کی نظر میں 'کجرو' بنا دیا تھا۔ یگانہ کے مخلص ناقدین ان کی نفسیاتی بوالعجبیوں کو، ان کے مزاج کی انفرادیت اور تیکھا پن کو جبروتی انداز اور مردانگی سے یا یگانہ آرٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان حالات و کوائف کا اور ان عوامل اور عواقب کا تجزیہ کرتے ہیں جنھوں نے یاس کو یگانہ، خود پرست، انا پرست اور کلبیت پسند بنایا اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہونے کے باوجود یگانہ چنگیزی کو احساس کمتری اور احساس شکست جیسی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔ انفرادیت اور انانیت کی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر شاعرانہ منصب اور منہج سے بہت دور تاریکی میں پہنچا دیا جہاں مثبت تنقید بے کیف اور تنقیص حرزِ جاں ہو گئی اور یگانہ کو ہر اس شخص کو اپنا حریف بنانے میں مزہ آنے لگا جو ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اور بقول آل احمد سرور آخر کار یگانہ اپنے پہلے ہی شعر۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

کا بہترین تبصرہ بن کر رہ گئے۔ اسی طرح راہی معصوم رضا بھی یاس یگانہ چنگیزی کے معرکانہ اور مخاصمانہ تیور کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یگانہ تنقید سے زیادہ تنقیص پر تلے ہوئے ہیں اور

بیشتر مقامات پر ان کا لہجہ غیر مہذب ہے اور ان کے الفاظ غیر شائستہ ہیں۔ وہ جگر اور جوش کا ذکر 'اشخاص' کہہ کر کرتے ہیں اور عزیز کو 'میاں عزیز' اور 'فضلتہ الشعرا' اور 'قصاب المعانی' کہتے ہیں اور یہیں چپ نہیں رہتے بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ڈھاڑی نہیں نخاس کے کشمیری (یعنی بھانڈ) ہیں اور پھر خطابات دینے کے بعد وہ عزیز کے قصیدوں پر 'پچھتر' 'وضوشکن' اعتراضات کرتے ہیں۔ مولانا حسرت کو اوسط درجے کا شاعر کہتے ہیں اور مولانا بے خود کو 'غالب کا دلچھا مولوی ٹھینگا موہانی' کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ جوش کے ساتھ 'خان' لگاتے ہیں۔ ترقی پسند شعرا کو 'غدار' کہتے ہیں اور انھیں گدھا جانتے ہیں...''

(یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا: شاہین پبلشر الہ آباد 1967، ص 191)

ہم عصروں میں چند ہی لوگ تھے جن کی یگانہ چنگیزی تھوڑی بہت عزت کرتے تھے ورنہ ہر کس و ناکس سے ان کی معرکہ آرائی تھی۔ ان اعتراضات میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی دور دور تک نظر نہیں آرہی ہے بلکہ تنقید کی جگہ معاندانہ آرا اور تنقیص نے لے لی ہے اور یہ اعتراضات کسی بانکے شاعر کی آواز نہیں بلکہ احساس شکست سے دوچار درماندہ رہرو کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

بہر کیف جدید اردو غزل میں یگانہ چنگیزی کے صحیح مقام و مرتبے کے حوالے سے ان کے مخلص ناقدین کا ماننا ہے کہ یگانہ کی شخصیت، ان کے فن اور نظریہ فن کو ان کے زمانے اور ان کے زمانے کی ادبی روایتوں کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یگانہ کی شخصیت کے داخلی اور خارجی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہی ان کے بارے میں رائے قائم کرنی چاہیے کیوں کہ یگانہ کا سارا شعری سرمایہ صرف 'پیترے بازی' نہیں ہے یا صرف انفرادیت سے انانیت کا گمراہ کن سفر نہیں ہے بلکہ رعنائی، توانائی، مردانگی جیسی قدروں پر مشتمل ایک تہہ دار اور قوت ایجاد کے حامل شاعر کا تخلیقی سرمایہ ہے، جس نے غزل اور رباعی جیسی مشکل صنف میں اپنے ہم عصروں بشمول جوش و فراق کو متاثر کیا۔ اور لکھنؤ کی غزل کو سطحی جذباتیت اور لفظی بازی گری کے طلسم سے نکال کر اصل زندگی کا ترجمان بنایا اور جدید اردو غزل کو ایک نیا لب و لہجہ عطا کیا۔ یگانہ ایک سچے کھرے، حق پرست اور خود پرست تھے۔ انھیں، ان کی شاعری، ان کے فن اور نظریہ فن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ غالب شکن اور شہرت کا ذبہ کے شان نزول کو سمجھا جائے اور ان کے لہجے کی جھلاہٹ اور کھردرے پن کے اندر جھانکا جائے۔ عبرت اور بصیرت دونوں کو بروے کار لاکر ان کا ادبی مرتبہ متعین کیا جائے۔ جن ناقدین نے یگانہ چنگیزی کے کلام کا Total Criticism کے اصولوں کے تحت مطالعہ کیا ہے ان میں مجنوں گورکھپوری، مسعود حسن رضوی ادیب، راہی معصوم رضا، باقر مہدی اور نیر مسعود، پروفیسر شمیم حنفی، سلیم احمد غیرہ کے ساتھ مشہور مورخ و ناقد ڈاکٹر انور سدید اور پروفیسر سیدہ جعفر بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے یگانہ چنگیزی کی غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''یگانہ کی غزل ان کے ترکی مزاج کی آئینہ دار اور منفرد کیفیات کی مظہر ہے۔ 'آیات وجدانی' میں وہ خیال کے ساتھ حسن مجسم کو بھی اڑا لے جاتے ہیں۔ ان کی گہری اور کٹیلی طنز ناآسودہ حسرتوں کو جگاتی ہے۔ وہ دکھی اور افسردہ دل تھے لیکن اپنی انا کو جھکنے نہیں دیا۔''

(اردو ادب کی مختصر تاریخ: ڈاکٹر انور سدید۔ ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی ص 354)

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا ظ
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چلے، اب ترک دعا کرتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ 'آیات وجدانی' میں بہت سے اشعار ہیں جو ڈاکٹر انور سدید اور ان کے ہم خیالوں کے دعوے کی دلیل میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یگانہ چنگیزی کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ وہ نثر میں ایک خاص اسلوب نگارش طنز ملیح اور طنز قبیح کے موجد و خاتم تھے۔ اسی طرح انھوں نے اردو غزل کو بھی ایک منفرد آواز عطا کی تھی۔ انھوں نے لفظی بازیگری اور شعری صنعتوں سے احتراز کر کے علامتوں کی ایک دنیا

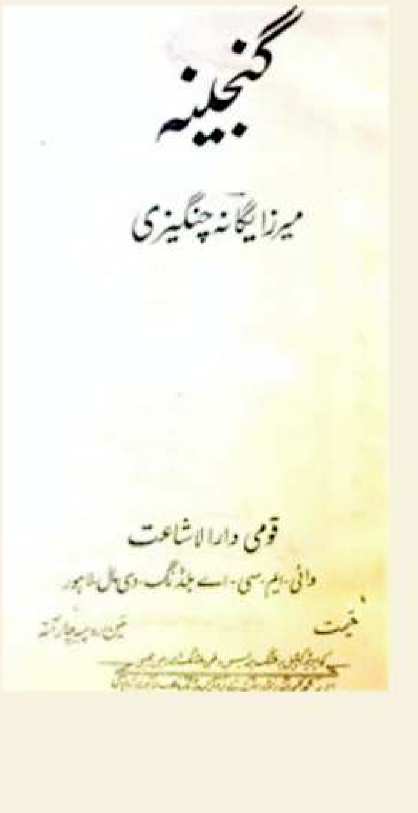

آباد کرنے کی کوشش کی۔ اردو شاعری کو اپنے منفرد مزاج اور عصری زندگی کا آئینہ دار اور مظہر بنایا۔ کہا جاتا ہے یگانہ کے مزاج کا تیکھا پن اور زندگی سے بھرپور لہجہ خواجہ حیدر علی آتش کی یاد دلاتا ہے۔ جن ناقدین نے یاس عظیم آبادی کو یگانہ چنگیزی، خاک پائے میر و آتش کو امام الغزل، ابوالمعانی اور یگانہ علیہ السلام بنانے والے عوامل و عواقب کا اور ان کے کلام کا معروضی تجزیہ کیا اور ان کی شعری خدمات اور انفرادیت کو تسلیم بھی کیا ان میں پروفیسر سیدہ جعفر بھی شامل ہیں۔ وہ یگانہ کی پوری شخصیت اور شعری انفرادیت کا معروضی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''یگانہ تنہا تھے اور مخالفین کی ایک بڑی جمعیت کا سامنا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میدان سے ان کے قدم اکھڑنے لگے۔ یگانہ کو اپنی عظمت اور انفرادیت کا شدید احساس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے لب و لہجے اور مزاج کو بدل دیا۔ روایت سے انحراف کر کے مصنوعی آرائش و زیبائش، لفظ پرستی اور سطحیت کو تفکر، جدت طرازی اور تازگی خیال سے بدل دیا.. زبان و بیان کے اعتبار سے یگانہ کا کلام اپنے کسی ہم عصر سے کمتر نہیں۔ روز مرہ اور محاوروں کا استعمال، بے ساختگی، طرز ادا کی سادگی اور روانی یگانہ کے انداز ترسیل کے پہچان بن گئے ہیں... رباعی کے فن پر یگانہ کو دسترس حاصل ہے... افکار و تصورات کی جدت اور زبان کی سادگی نے رباعیات یگانہ (ترانہ) کو قابل توجہ بنا دیا ہے۔''

(تاریخ ادب اردو: عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک جلد چہارم: سیدہ جعفر وی جی پرنٹرس دلسکھ نگر حیدرآباد ص 250)

حوالہ جات

1 آیات وجدانی: یاس یگانہ چنگیزی، مبارک علی تاجر کتب لاہور، 1927
2 یگانہ احوال و آثار: نیر مسعود انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1991
3 نگار (معاصر غزل گویوں پر تنقید نمبر) مدیر: نیاز فتح پوری جنوری 1942
4 یاس یگانہ چنگیزی: راہی معصوم رضا: شاہین پبلشر الہ آباد 1967
5 آگہی و بے باکی: باقر مہدی، گوشہ ادب ارکیڈیا بلڈنگ بمبئی 1965
6 اردو ادب کی مختصر تاریخ: ڈاکٹر انور سدید۔ ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی 2013
7 ہماری شاعری: سید مسعود حسن رضوی، نظامی پریس لکھنؤ اتر پردیش 1926
8 تاریخ ادب اردو: عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک جلد چہارم: سیدہ جعفر وی جی پرنٹرس دلسکھ نگر حیدرآباد 2002

■

Dr. Abu Shaheem Khan
Associate Professor, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.: 7354966719

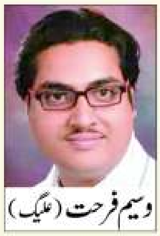

وسیم فرحت (علیگ)

جدید غزل کا امام
یگانہ چنگیزی

اردو غزل 'اسمِ با مسمیٰ' کا کردار نبھاتے ہوئے دو سو سال سے ایک ہی رنگ و آہنگ میں اپنا سفر طے کرتی آرہی تھی۔ خواجہ حالی کے بیانات محض کاغذی کارروائی کے طور پر ہی دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ عملی طور پر اردو شعرا اس وقت تک اسی گھسی پٹی روش پر گامزن تھے جس کی ابتدا ولی دکنی، عزلت سورتی، شاہ حاتم دہلوی وغیرہ سے ہوتی ہے۔ غالب کے گزرنے کو 15 برس بیت گئے تھے اور غالب نے اردو شاعری میں جو انقلاب برپا کیا تھا، بس وہی ایک راستہ اہلِ اردو کے نزدیک 'جدید' باقی رہا تھا۔ کل ملا کر ہندوستان بھر کے شعرا نے اسی ایک راستے کی تقلید 'فرضِ عین' تسلیم کر لی تھی۔ ایسے میں بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یگانہ چنگیزی نے ایک نئی عمارت کی بنا رکھی۔ ابتدا میں خواجہ آتش کے رنگ میں شعر کہنے کے بعد یہ شیوہ بھی یگانہ کو بہت زیادہ مفید نہ معلوم ہوا اور یہیں سے اردو شاعری کو ایک نیا موڑ 'یگانہ' کی صورت میں ملتا ہے۔

اردو شاعری کو پہلی مرتبہ کسی شاعر نے محض وارداتِ قلب کی سطحیت سے آزاد کرنے کا نظریہ سامنے رکھا۔ گوشت پوست میں غرق اردو شاعری کو دقیانوسی زنجیروں سے آزاد کرنے کا ایک منضبط لائحۂ عمل یگانہ نے اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔ وجودی شاعری کا زندہ اور توانا پہلو یگانہ کے طفیل اردو شاعری کو نصیب آیا۔ فرد اور عظمتِ فرد کو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شاعری کے میدان میں داخل کیا گیا اور یہ تسلیم کرنے پر اہلِ اردو مجبور ہوئے کہ شاعری محض عشقیہ معاملہ بندی، سرمستیِ رندی اور قصیدہ خوانی تک محدود نہیں بلکہ اور بھی کچھ ہے۔ اور اسی 'اور بھی کچھ' کو یگانہ نے شعری تہہ داری کے ساتھ غزل میں جائز مقام دلایا۔ معرفت اور مجاز کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے میں مصروف شعرائے اردو کے لیے یگانہ کا وژن بالکل انوکھا رہا۔ بلکہ اول اول ناقابلِ ہضم۔ لیکن زمانہ جانتا ہے کہ جدید شاعری کے امام یگانہ چنگیزی کی قربانیاں داخلِ نصاب نہ ہوتیں تو ہمیں شکیب جلالی، زیب غوری، ندا فاضلی، شجاع خاور اور اسی قبیل کے دیگر شعرا کی شاعری قطعی پسند نہ آتی۔ نباضِ ادب، ماہرِ غالبیات آنجہانی کالی داس گپتا رضا کے استاد اور شاگردِ داغ علامہ جوش ملسیانی نے یگانہ کے کلام کے متعلق کیا نپی تلی رائے دی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''یگانہ کا نمایاں وصف یہ ہے کہ فلسفیانہ شاعری اور حقائق زندگی کے دقیق مضامین کو موضوعِ سخن قرار دے کر وہ غزل کا اندازِ بیان اور غزل کی زبان کسی شعر میں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ کسی غزل میں کوئی شعر ایسا نظر نہیں آتا جو خشک سے خشک مضمون کو بیان کرنے کے باوجود غزل کے انداز سے بیگانہ ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شعر میں اس وصف کا پیدا کرنا اس میدان میں فی الحقیقت بہت مشکل کام ہے۔''[1]

ایمان کی بات یہ ہے کہ یگانہ کی شاعری ہمیں زندگی جینے کا فن سکھاتی ہے۔ کمزور لمحوں میں ہمیں حوصلہ بخشتی ہے۔ ہماری ڈھارس بندھاتی ہے۔ یہی یگانہ کی شاعری کا ماحصل ہے۔ خود کے لیے نئی راہ تیار کرنے اور پھر اس کی عظمت و انفرادیت زمانے سے منوانے میں یگانہ کو بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ یگانہ کی کیفیت بقول خلیل فرحت کارنجوی مرحوم۔

ذوق کے دور میں غالب کا طرفدار ہوں میں
بے تکلف مجھے سولی پہ چڑھایا جائے

کی سی ہے۔ یگانہ کے وقتوں میں لکھنوی تہذیب اور لکھنؤ اسکول پر مرثیے کا کچھ اس طور غلبہ تھا کہ ہر صنفِ سخن سے 'مرثیہ پن' جھلکتا تھا۔ یاسیت، قنوطیت سے اردو شاعری لبریز تھی۔ ہر عاشق درِ جاناں پر مرجانے کو زندہ رہنے پر مقدم جانتا تھا۔ گلدستوں اور طرحی مشاعروں میں محض پینترے بازی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جنون نے اردو شاعری کی صورت ہی کچھ اور کر دی تھی۔ یگانہ نے ان تمام گورکھ دھندوں سے پاک، صاف ستھری اور بامعنی شاعری سے اردو ادب کو روشناس کیا۔ ایک ایسی شاعری جو انسانیت کے لیے اکسیر ہو، ایک ایسی شاعری جہاں فرد کے زخموں پر مرہم لگایا جاتا ہو۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کے متعینہ اصولوں کو اس وقت تک کسی نے خود پر منطبق نہیں کیا تھا۔ یگانہ کی شاعری خواجہ حالی کے نافذ کردہ قوانین سے میلوں آگے بڑھ گئی۔ اہلِ زمانہ اس انقلاب سے چونک پڑے کہ، یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا۔

نیاز فتح پوری جیسے سخت ترین نقاد بھی یگانہ کی شعری روش کے قدر دان رہے، فرماتے ہیں:

''یگانہ پہلا شخص تھا جس نے لکھنؤ کے روتے اور بسورتے رنگِ تغزل پر کاری ضرب لگائی اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ یگانہ ہی نے سب سے پہلے اپنے زمانے کے لکھنوی شاعروں کے اس رنگِ تغزل کو بدلا جو اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر بے تمیزی کے ساتھ غالب کی تقلید پر آمادہ ہوگئے تھے۔ یگانہ نے غالب کے متعلق جو کچھ لکھا، میں اسے ردِ عمل سمجھتا ہوں اس شدید مخالفت کا جو لکھنوی مقلدین کی طرف سے یگانہ کے باب میں ظاہر کی گئی اور جسے یگانہ ایسے حساس آدمی کے دماغ کو واقعی بری طرح متاثر کرنا چاہیے تھا، ورنہ یگانہ کی فطرت شاید اس کو گوارانہ کرتی۔ یگانہ کی شاعری حسن و عشق کا وہ مرقع نہیں ہے، جس میں محبت کی فتادگی، خواری و تذلل تک پہنچ جاتی ہے بلکہ اس میں ہمیں ایسے عشق خودداری کی جھلک نظر آتی ہے جس کا سینہ تو ضرور خونچکاں ہے لیکن لب پر آہ و فغاں نہیں ہے۔ ایسے جواہر ریزوں کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔''[2]

یگانہ کی شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان کی آواز اپنے پیش روؤں یا ہم عصروں، سبھی سے جداگانہ ہے۔ یگانہ کا شعر کسی دوسرے کے خانے میں رکھا نہیں جا سکتا اسی لیے انتسابِ شعر کے معاملے میں یگانہ کا کوئی ایک شعر بھی تا حال کسی اور شاعر سے منسوب نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس کے برعکس آپ جگر، اصغر، سیماب، فانی، عزیز، ثاقب وغیرہ کے سیکڑوں اشعار یہاں وہاں خلط ملط پائیں گے۔ کلام کی یہی انفرادیت یگانہ کی شناخت کا وسیلہ ہے۔ ان کی آواز ان کی اپنی ہے، وہ کسی کے لہجے کی جگالی نہیں کرتے۔ میرے مربی ندا فاضلی صاحب یگانہ چنگیزی کے ساتھ ساتھ مرحوم خلیل فرحت کارنجوی کے متعلق اکثر فرماتے ہیں کہ 'بڑا شعر کہنا بڑی بات نہیں ہے بلکہ اپنا شعر کہنا بڑی بات ہے۔'

نریش کمار شاد یگانہ کی شاعرانہ عظمت کے یوں قائل ہیں:

''میرزا یگانہ چنگیزی بلاشبہ اس دور کے نہایت عظیم غزل گو شعرا میں سے ہیں۔ عظمت کا لفظ اگرچہ اس دور میں اپنی معنویت کھو چکا ہے لیکن میرزا یگانہ کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے پیشِ نظر ان کی عظمت پر شک کرنا ادبی خیانت کے مترادف ہے۔ یاس کی غزلوں کا لب و لہجہ ہمارا ادبی و تہذیبی ورثہ ہے۔ ہمیں نئی نسل کے شاعروں کو ان کے کلام کی صحت مند اور توانا روایات کو اپنانے کے لیے کسی تعصب اور بغض کے بغیر غیر متعلقہ امور کو بھلا کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔''[3]

یگانہ کی شاعری مردانہ آہنگ کی لے بلند کرتی ہے۔ مردانہ اور دلیرانہ جذبات کو یگانہ کچھ اس ڈھب سے شعری جامہ پہناتے ہیں کہ قاری و سامع جوش و انبساط کی سی کیفیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یگانہ کے یہاں افسردگی، لاچارگی، یاسیت، شکست خوردگی وغیرہ حوصلہ شکن مضامین عنقا ہیں۔ اس کے بدلے یگانہ کی شاعری ولولہ، غیرت، خودداری، حوصلے کی تعلیم دیتی ہے۔ ہم فرد کے غموں کا مداوا یگانہ کی شاعری میں تلاش کر سکتے ہیں اور یقین جانیے کہ اس تلاش میں مایوسی نہیں ہوگی۔ حقائقِ زندگی کے اظہار پر یگانہ کی زبردست گرفت ہے۔ اردو شاعری میں حقائقِ زندگی کو اس بڑے پیمانے پر یگانہ سے قبل کسی نے بروئے کار نہیں لایا۔ یگانہ کی فکری بلندی نے معاملاتِ زیست کی سطحیت کو بھی ارفع مقام عطا کیا ہے۔ ان کے یہاں بہت چھوٹی سی بات بھی چھوٹی معلوم نہیں پڑتی۔ اظہار اور تخلیق پر یہی قدرت یگانہ کو سربلندی فراہم کرتی ہے۔ مصائبِ زمانہ کے یگانہ شاکی ضرور ہیں تاہم ان سے نمٹنے کا فن ان کی شاعری سے عیاں ہے۔ حالات کی سختی اور ناہمواری وقت میں یگانہ کے اشعار ایک سچے دوست کا کردار نبھاتے ہیں۔ اور محض ہمیں سنبھالا ہی نہیں دیتے بلکہ لبِ ساحل تک پہنچنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ یہی بے پناہ انسیت یگانہ کی شاعری سے قاری کا رشتہ استوار کرتی ہے۔ اور وہ حیرت، تاسف و گم گشتگی کے بھنور سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہی یگانہ کی شعری کامیابی ہے۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری یگانہ کی شاعری کا کس بل محسوس کرتے ہیں:

''میرزا یاس یگانہ اردو غزل میں پہلے شخص ہیں جن کی شاعری میں وہ کس بل محسوس ہوتا ہے جس کو ہم صحیح اور توانا زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔ غزل کو جو اب تک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے یگانہ نے زندگی کی شاعری بنا دیا ہے اور انسان اور کائنات کی ہستی کے رموز اشارات کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے یہاں حسن و عشق سے متعلق اشعار نہیں ملتے، ملتے ہیں مگر ان میں بھی حسن و عشق کا احساس عام اور عالم گیر زندگی کے احساس میں سمویا ہوا ہوتا ہے۔''[4]

تخیل کی بلندی، لہجے کی ندرت اور زبان پر قدرت، یہ تینوں صفات کسی ایک شاعر میں موجود ہوں، اردو شاعری میں اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس قبیل میں غالب، داغ، امیر اور بلاشبہ یگانہ چنگیزی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ذوق دہلوی کے بعد اردو شاعری میں محاورے کے صرف بامحل کا سہرا یگانہ ہی کے سر جاتا ہے۔ آپ یگانہ کی شاعری میں محاورات کا اصراف ملاحظہ فرمائیں، یوں لگتا ہے جیسے محاورہ ہی شعر کے لیے بنا ہو۔ محاورہ دراصل ایک بے جان شے کا نام ہے، ایک سچا فنکار اپنی برجستگی اور صرفِ بامحل سے محاورے میں جان بھر دیتا ہے۔ یہی وصف یگانہ کی شاعری کو منتہائے خصوص تک پہنچا دیتا ہے۔ چنداں محاورے تو کچھ یوں نظم ہو گئے ہیں کہ اس کے بعد ممکن نہیں۔ یگانہ کی حیات میں ان کے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ انھیں زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ فارسی، اردو اور انگریزی ادب کے کثیر مطالعے نے جہاں زبان کو پختگی بخشی وہیں بیان بھی پر اثر ہو گیا۔ ٹھیٹ اردو کے الفاظ بھی یگانہ ہی کے طفیل داخلِ غزل ہوئے اور وہ بھی اس شان سے کہ باید و شاید۔ عوام تو خیر جانے دیجیے، خواص اور اساتذۂ فن بھی اپنے روزمرہ میں جن الفاظ کا استعمال کرتے تھے انھیں غزل میں شریک کرنا گناہِ کبیرہ گردانتے تھے۔ یگانہ نے روزمرہ کے الفاظ کو غزل میں یوں برتا کہ ایسے خشک اور سماعت پر بار محسوس ہونے والے الفاظ بھی مزہ دینے لگے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ عامیانہ الفاظ بروئے کار لانے پر بھی یگانہ کے ٹھیٹ اردو کے الفاظ 'بازاری' نہیں معلوم پڑتے۔ عمر بھر کی مشاقی اور قادر الکلامی نے ایسے لفظوں کی 'ثقلیت' کو زائل کر دیا۔ اور غزل کی لفظیات میں ایک زبردست اضافے کا موجب ہوا۔

باقر مہدی نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا ہے، اور کیا خوب فرمایا ہے:

''یگانہ کا آرٹ مینا کاری کا آرٹ نہیں ہے۔ ان کے یہاں نازک جذبات بھی زورِ بیان کے تیکھے پن کے ساتھ آتے ہیں اور ان کا یہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے آتش اور غالب کی زمین میں بلند پایہ غزلیں کہی ہیں جو نہ تو ان شعرا کی آوازِ بازگشت ہیں اور نہ صدا بہ صحرا بلکہ ان میں آواز کی تیزی اور سوز و گداز کی آنچ کے ساتھ زندگی کا ولولہ بھی پایا جاتا ہے جسے ہم یگانہ آرٹ کہہ سکتے ہیں۔ یگانہ آرٹ سنگ تراشی کا آرٹ ہے۔ ان جاندار پتھروں میں ذہن کے مختلف موڈ کی بے شمار کیفیتیں اور فکر کی تصویریں دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ابھر آئی ہیں اور یہ بھی معجز نما شخصیت کا پرتو ہے۔ یگانہ نے اردو شاعری کو جو ولولہ بخشا ہے وہ سرکشوں کی پوری داستان کا عنوان بن سکتا ہے۔ اگر اقبال کی شاعری بقول سرور صاحب 'ارضیت کا عہد نامۂ جدید' ہے تو یگانہ کی شاعری اردو میں ایک باغی کا پہلا کامیاب شعری رجز ہے، جس کی بنیاد 'مانگے کے

اجالے پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ جس کا سرچشمہ خود یگانہ کی شخصیت تھی۔ اردو غزل میں میر اور غالب کے بعد تیسرا نام جو سب سے زیادہ احترام اور اہمیت کا مالک ہے، وہ یگانہ کا ہے۔''[5]

اردو غزل کی تاریخ میں غالب، آتش اور اقبال کے بعد انفرادی لفظیاتی تشکیل صرف یگانہ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ زبان اور اس کا رچاؤ، اور ان دونوں خصوصیات کو اپنے قطعی نئے موضوعات میں خوش سلیقگی کے ساتھ جس طرح یگانہ نے برتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حالانکہ محض 'زبان' کے نام پر اپنی دوکانداری چلانے والے شعرا کے یہاں 'لچھے دار زبان' تو ضرور مل جاتی ہے تاہم اس چکر میں شعری پہلو خشک ہو جاتا ہے۔ اور شعر دیرپا اثر چھوڑنے سے قاصر رہتا ہے۔ غالب، آتش اور یگانہ متذکرہ دونوں ہی صفات پر یدِ طولیٰ رکھتے ہیں اور اسی لیے ان کی شاعری کا جادو اتنے برس بعد بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

مصرعوں کی ساخت پر یگانہ بے حد توجہ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی مصرعہ لکنت کا شکار محسوس نہیں ہوتا۔ سجے سجائے اور ڈھلے ڈھلائے مصرعوں کو پڑھ کر طبیعت جھوم اٹھتی ہے۔ سلاست اور روانی کا وہ عالم ہے کہ گمان پڑتا ہے کہ جیسے پوری غزل غیب سے اتاری گئی ہو۔ کہیں کسی شعر میں جھول، بے جا اضافتیں، نامانوس تراکیب، دوراز قیاس استعارات وغیرہ کو دخل نہیں ہے۔ ان کے ہر شعر سے استادانہ شان جھلکتی ہے۔ رموزِ شاعری سے مکمل آشنائی نے یگانہ کی شاعری کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ فن کی باریکیوں پر قدرت رکھنے کے باوجود ان کی شاعری بوجھل نہیں لگتی۔ ورگرنہ اس قماش کے بیش تر شعرا کے اشعار بطور 'سند' تو پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن 'پسند' نہیں کیے جا سکتے۔

اردو غزل کے خد و خال اور اس کے تخلیق کاروں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے سخت ترین نقاد محترم پروفیسر کلیم الدین احمد نے بھی یگانہ کی شاعری اور اس کے ابعاد کی عظمتِ دو چند کو تسلیم کیا ہے، فرماتے ہیں:

''یگانہ چنگیزی نے چند مخصوص وجہوں کے سبب صحتِ زبان، لطفِ محاورہ کی طرف زیادہ توجہ کی ہے اور اس میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ ان کی شاعری کی دوسری خصوصیت زور، شگفتگی اور انبساط ہے۔ قنوطیت کا نام و نشان نہیں۔ ان کا لہجہ بلند اور آواز خوش آئند ہے۔''[6]

اردو شاعری کی تثلیث رندی، عاشقی اور تصوف سے قطعی مختلف طرزِ فکر رکھنے والے یگانہ نے اپنے بعد کی نسلوں کے لیے ایک نئی راہ فراہم کر رکھی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ اعزاز اردو شاعری میں دو ہی شاعروں کے حصے میں آیا ہے۔ اول غالب دوم یگانہ۔ غالب نے اپنے پیش روؤں کے موضوعِ اظہار اور طرزِ اظہار سے انحراف کیا۔ ٹھیک اسی طرح یگانہ نے غالب کے موضوعات اور طریقہ ہائے اظہار سے انکار کیا اور نئی طرز ایجاد کی۔ مطلب یہ کہ غالب نقشِ اول ہیں اور یگانہ نقشِ ثانی۔ غرض کہ یگانہ کی شاعری 'رجحان ساز' ثابت ہوئی اور اسی آواز کی گونج شاد عارفی و نئی نسل کے دیگر احتجاجی شعرا کے یہاں سنائی دی۔

یگانہ اظہار کو معنی پر مقدم جانتے ہیں۔ ان کی شاعری پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اظہار کی سطح پر ان کے یہاں مشاقی اور تازہ کاری دکھائی پڑتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ کسی بھی شاعر کے ہر شعر میں کچھ نہ کچھ معنی تو نکل ہی آتے ہیں، سوال یہ ہے کہ معنی کے علاوہ اظہار کی سطح پر بھی کچھ نیا پن ہے یا نہیں؟ ایک معمولی سے خیال کو مناسب و موزوں اظہار کے پیرائے میں پیش کیا جائے تو شعر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ ورگرنہ بلند خیال بھی پست اظہار کی بنا پر رفعت حاصل نہیں کر سکتا۔ بلند آہنگی اور بیان کا زور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یگانہ اظہار کے معاملے میں سنجیدگی سے کام لیتے ہیں۔

ندا فاضلی فرماتے ہیں:

''یاس سے یگانہ اور یگانہ سے چنگیزی بننے کا ادبی سفر خود یگانہ کی ادبی زندگی کا ہی نہیں اردو ادب کی تاریخ کا بھی اہم واقعہ ہے۔ اس واقعے کی تشکیل میں کئی اہم چہرے شامل ہیں۔ یگانہ کی زندگی کے یہ مختلف ادوار جو ان کی غزلوں، رباعیوں اور مضامین میں نمایاں طور پر جھانکتے نظر آتے ہیں اب غالب کے بعد غالب جیسی تخلیقی توانائی کی دوسری مثال ہے۔ یگانہ کا عہد غزل کا سنہری دور تھا، حسرت، فانی، جگر، اصغر اس دور میں صنفِ غزل کے روشن ستارے تھے۔ یگانہ کا امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں نے بھی غالب کی طرح اپنے دیکھے ہوئے اور اپنے جیے ہوئے پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ یگانہ نے اپنے شعر کہے جو موضوع، برتاؤ اور اظہار کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں کے اجتماع میں الگ سے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مرکزی کردار زمین کی سختی اور آسمان کی دوری کو تصوف اور حسن و عشق کے کھلونے سے بہلاتا نہیں، ان سے آنکھ ملاتا ہے اور ٹکراتا ہے۔ یگانہ کی شعری شناخت ان کے عہد میں ممکن نہیں تھی۔ اس کو نئے دور کا انتظار تھا جو اب پورا ہو چکا ہے۔''[7]

اردو شاعری میں رباعی یگانہ کی حاضری تک محض ادق مضامین، فلسفیانہ معاملات اور تشکیک و عقیدے کے اظہار کا ذریعہ تھی۔ یگانہ نے پامردی کے ساتھ اس بیش قیمتی صنفِ سخن کا دائرۂ موضوعات وسیع کیا۔ انسانی پراگندگی، زمینی مسائل، شکست و ریخت، سماجی افترا پردازیاں وغیرہ سے متعلقہ مضامین کو یگانہ نے اپنی رباعی میں شایانِ شان مقام عطا کیا۔ موضوعات کا تنوع، مردانہ کس بل اور فکر کی انفرادیت نے یگانہ کی رباعیوں کو ایک خاص مرتبہ بخشا ہے۔

یگانہ کے رباعیوں کے مجموعے 'ترانہ' پر تبصرہ فرماتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے خوب رائے دی:

''میرزا یاس عظیم آبادی اردو کے مشہور شعرا میں ہیں۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ میرزا یاس یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں، ان کے خیالات بلند، زبان صاف ستھری، ترکیبیں چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنؤ کے طرزِ شاعری میں ان کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا ہے۔ غزلیات کے ساتھ ان کی ہر رباعی زبان کی صفائی اور روزمرہ اور محاورات کی برجستگی اور ترکیبوں کی چستی کے لحاظ سے قابلِ داد ہے۔ ایسا نہ سمجھا جائے کہ ان کی رباعیوں کے مضامین صرف 'فلسفۂ خودی' کی تشریح پر مشتمل ہیں، بلکہ 'انفس' کے بعد 'آفاق' کا فلسفہ بھی ان میں جا بہ جا بیان کیا گیا ہے، کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں۔''[8]

غرض کہ یگانہ چنگیزی کی شاعری آنے والے وقت کے لیے نوید بہار کا کام کرتی رہی جو بہ زمانۂ خزاں دی جاتی ہو۔ پھر چاہے وہ غزل کے نصاب میں نئے موضوعات کی شمولیت ہو، یا ٹھیٹ اردو کے الفاظ کی شرکت، یا فرد کو مکمل اکائی کی طرح سمجھنے، اس کے مسائل کا حل تلاش کرنے اور اس پر دستِ ہمدردی پھیرنے کے ذیل میں ہو۔ یگانہ کی خدمات سے اردو ادب انکار نہیں کرسکتا۔

حواشی

1 میرزا یگانہ چنگیزی، مطبوعہ آجکل، یکم اپریل 1945، ص 8
2 بزم نگار نمبر، ماہنامہ 'نگار' لکھنؤ، جنوری فروری 1941، ص 222
3 یاس کی خود پرستی، مطبوعہ 'نیا دور' لکھنؤ، جولائی 1961، ص 32
4 غزل اور عصر جدید، مطبوعہ 'نگار' لکھنؤ، جنوری 1942، ص 50
5 یگانہ آرٹ، مطبوعہ 'آجکل' دہلی، مئی 1956، ص 15
6 بزم نگار، مطبوعہ 'نگار' لکھنؤ، جنوری 1942، ص 18
7 مکتوب ندا فاضلی بنام خاکسار محررہ 27 فروری 2014
8 تبصرہ بر 'ترانہ' مطبوعہ 'معارف' اعظم گڑھ، شمارہ نمبر 4 جلد 33، اپریل 1934، ص نمبر 314

Waseem Farhat (Alig)
Editor : Sah Mahi 'Urdu'
'Adabistan' Near Wahed Khan
Urdu, D, Ed, College, Walgaon Road
Amrawati - 444601 (MS)

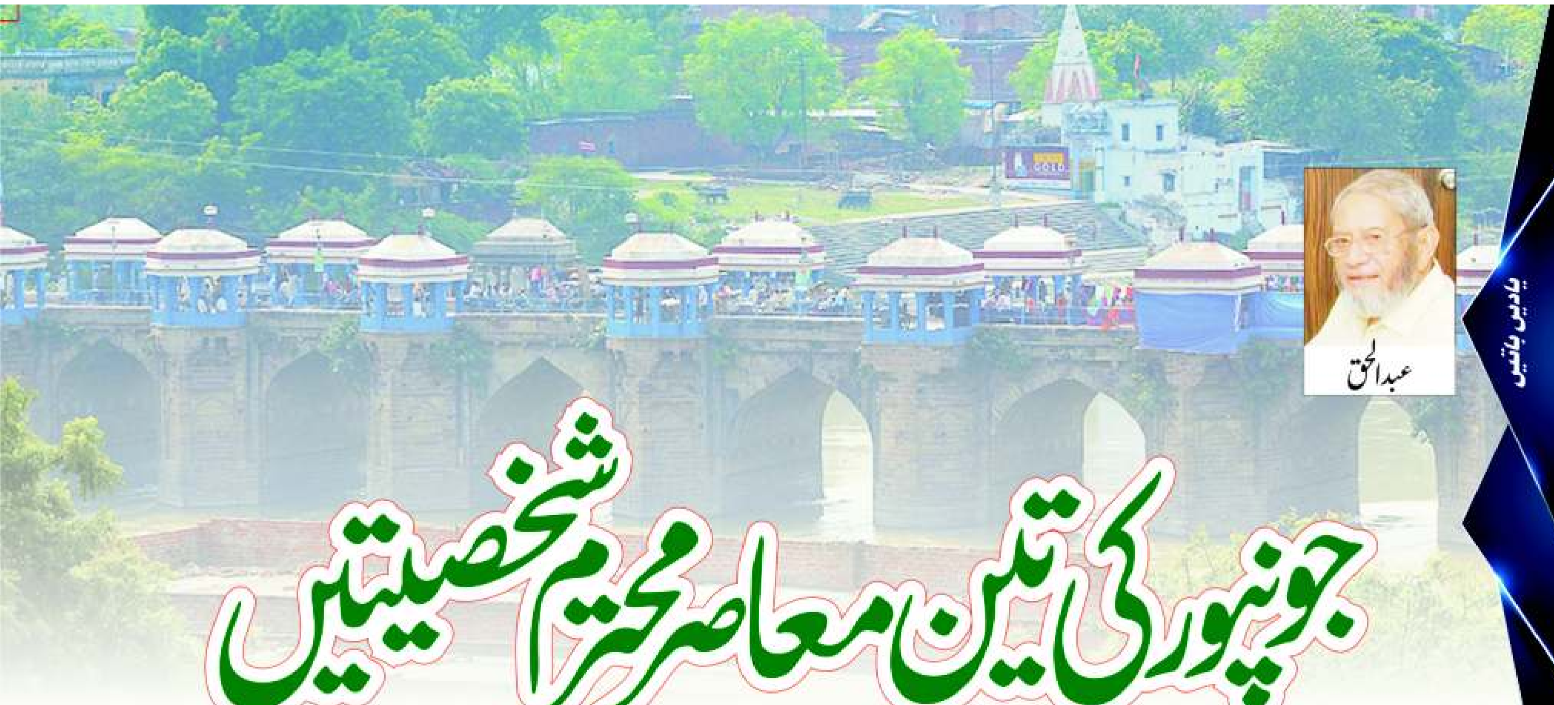

عبدالحق

جونپور کی تین معاصر محترم شخصیتیں

مولانا کرامت علی جونپوری (1796-1871)

دعوتِ دین کے بے مثل مبلغ اور مجاہد ہیں۔ دیارِ مشرق میں احیائے دین کے وہ مردِ میداں ہیں اور میرِ لشکر بھی۔ احیائے دین کے ساتھ ان کے ہدف میں انگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد بھی تھی۔ اس خانوادے کی خدمات کا اعتراف ابھی باقی ہے۔ رجب علی ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ رجب علی کے بیٹے کا نام ابوالحسن ہے۔ جو ظفر احمد صدیقی کے والد ماجد ہیں۔ مولانا ظفر احمد صدیقی 18 جنوری 1928 کو پیدا ہوئے۔ اور 7 جولائی 2021 کو اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی تدفین میں شریک نم ناک نگاہوں کا ایسا ہجوم جونپور میں کبھی نہیں دیکھا گیا لگتا تھا کہ پورا شہر سکوتِ غم کی سایہ نشینی میں پردہ پوش ہے۔ یہ ان کی بے پناہ مقبولیت کا مظہر تھا۔ ان کی علمی وروحانی شخصیت پر اہالیانِ شہر کو ناز تھا۔ خود مولانا کو جونپور اور باشندوں پر بڑا اعتماد تھا۔ جامع مسجد کی نئی تعمیر کے لیے شہر کے لوگوں نے اس اعتماد کو بحال کر کے تعاون کی بے مثال نظیر پیش کی۔ مولانا کی آواز پر شہر کے سبھی پیر و جوان نے لبیک کہا اور صدیوں سے مسمار قدیم تعمیر کو بحال کیا۔ جو کسی عجوبہ سے کم نہیں۔ مسلکی اختلاف کے باوجود عالم اور عامی سبھی ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ عصر حاضر میں جون پور کی سب سے محترم اور برگزیدہ شخصیت کے پیکر تھے۔ وہ علم و عمل کی مثال تھے وہ عرفان نظر اور گدازِ قلب کے مرکز محسوس تھے۔ خلقِ خدا کی نظر میں ان کی خدادوستی کی دوسری نظیر نہ تھی۔ صبح و شام ان کے گرد دعائے خیر کی دستیابی کے لیے عوام منتظر رہتے۔

9 اکتوبر 1982 کو انھیں پہلی بار دیکھا ایک عالم روشن نظر آیا۔ قد و قامت کی وجاہت، علم و عمل کی درازی سے ہم آہنگ تھی۔ سفید کپڑے زیب تن کیے تھے چہرے کی نورفشانی قلب و نگاہ کی بشاشت سے ہم دوش تھی۔ میری پہلی بیٹی صائمہ کا میرے سسرال بلوا گھاٹ جون پور میں عقیقہ تھا۔ میرے خسر فضل الرحمٰن مرحوم کی خصوصی درخواست پر وہ تشریف لائے تھے بیٹی کا نام صائمہ انھیں کا تجویز کردہ ہے۔ راقم مولانا محترم کے گھر اکثر حاضر ہوتا وہ مجھ پر بڑی شفقت فرماتے۔ وہ جونپور کے ماضی کی بازیافت اور بزرگوں کی بے کراں خدمات کا بھی تذکرہ کرتے۔ جون 1983 میں حافظ سراج الدین مرحوم کے ہمراہ ان کے پاس حاضر ہوا۔ راقم نے جونپور پر لکھے گئے ڈاکٹر محمد سعید کے تحقیقی مقالے کا ذکر کیا۔ انھوں نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چند ماہ کے بعد دہلی سے جونپور جانا ہوا۔ وہ کتاب ساتھ لے گیا اور مولانا کو حاضر کیا وہ بہت خوش ہوئے اور وہ کتاب کئی ماہ تک مولانا کے پاس رہی۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کا اردو میں ترجمہ ہو جائے۔ جو ابھی تک ممکن نہ ہو سکا۔ مرحوم نے اپنی ہر تصنیف و تالیف سے نوازا۔ آخری کتاب مفتاح الجنت ہے۔ یہ مولانا کرامت علی کی تصنیف ہے۔ جسے مولانا ظفر احمد صدیقی نے علمی انداز سے مرتب کیا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ اردو کی یہ پہلی فقہی کتاب ہے جو روز و شب کے معمولات اور عبادات کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اردو میں فقہ نویسی کے ادب میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ کتاب 1827 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس وقت تک اردو کا نثری ادب بہت حد تک مذہبی مبادیات و مسائل تک محدود ہے۔ یہ بات فورٹ ولیم کالج کے تراجم سے صرف نظر کر کے عرض کر رہا ہوں۔ تقویت الایمان کو جو مقبولیت ملی وہ انیسویں صدی کی کسی کتاب کو نہ حاصل ہو سکی۔ مذکورہ کتاب کو بھی دیار مشرق میں بہت پسند کیا گیا۔ بنگال و برما تک اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا ظفر احمد صدیقی مرحوم نے اپنے گراں قدر حواشی سے اسے اور بھی مفید و محترم بنا دیا ہے۔ مولانا کرامت علی کا ایک اور کام قابل ذکر ہے۔

وہ ایک مثالی عالم باعمل کے خوب رو پیکر تھے۔ روز و شب کے دینی معمولات کے علاوہ مجاہدانہ فکر و عمل کا امتزاج بھی ان کی سرشت میں شامل تھا۔ سکندر لودھی نے شاہانِ شرقی کو شکست دی اور شہر کو بھی تاراج کیا۔ فوجیوں نے جامع مسجد کو بھی کسی حد تک مسمار کیا۔ مسجد کا مشرقی دروازہ زمیں بوس کر دیا گیا تھا۔ جو کئی صدیوں تک داستان خوں ریز کے منظر کو دہراتا رہا۔ مولانا ظفر احمد صدیقی کے عزم و ارادے کو آفریں ہو کہ انھوں نے اس دروازے کی تعمیرِ نو کا ارادہ کیا اور اسے مکمل کر کے عہد حاضر میں فن تعمیر کے معجزات کی انوکھی مثال قائم کی۔

سید غلام سمنانی مرحوم (وفات 22 اپریل 1999)

سے دہلی میں ملاقات ہوئی وہ مجھے بہت عزیز لگے۔ پہلی ملاقات میں ان کی پُر وقار علمی شخصیت نے متاثر کیا۔ وہ انگریزی کے استاد تھے۔ مگر اردو، فارسی، اسلامیات اور شعر کے تخلیقی نکات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ناچیز کو جونپور کی دو بڑی شخصیتوں کی علمی عظمت اور وجاہت نے علاقائی عصبیت کے فخر بے جا کی نفسیات سے قریب تر کیا۔ اب سوچتا ہوں تو میرا احساسِ تفاخر غلط بھی نہ تھا۔ خاکسار نے سید غلام سمنانی جیسے وسیع اور جامع مطالعہ سے

مربوط شخصیت کم دیکھے۔ وہ برادرانہ شفقت فرماتے۔ ناچیز ان سے اصرار بھی کرتا کہ وہ تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوں۔ مگر پان کی گلوریاں اور شعرا کی ہم نشینی ان کے لیے حصار بن گئی تھیں وہ ہمہ وقت اس ہجوم ناز میں میر مجلس نظر آتے۔ گھنٹوں ہوسٹل کے تنگ کمرے میں اہل سخن باادب بیٹھے رہتے۔ ان سے فرصت ملتی تو حبس دم کے دوامی آزار کو انگیز کرنے کے لیے مجبور ہوتے۔ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے باوجود کچھ کام کر سکے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کی فرمائش پر امیر خسرو پر انگریزی میں ایک مونوگراف تیار کیا۔ عہد شاہ جہاں کی ایک تاریخ کا ترجمہ کیا۔ ہاشم کی مشہور تاریخی کتاب 'ہندوستان کا شاندار ماضی' کا ترجمہ شائع کیا۔ یہ ان کی علمی اور ذولسانی بصیرت کا بہترین شاہ کار ہے اس ترجمے نے علمی وقار میں اضافہ کیا۔ ترجمے کو تخلیق کا حریف بنادیا۔ علامہ اقبال سے ان کی عقیدت مندی اور پرستاری لائق ستائش تھی۔ اقبال کی مجلس شوریٰ کی پیروی میں کیفی اعظمی، پروفیسر محمد حسن کے بعد انہوں نے چوتھی مجلس شوریٰ تخلیق کی جو فکرِ اقبال سے ہم آہنگ ہے اور شعری حسن آفرینی سے دہلی کی کئی محفلوں میں شعر سناتے ہوئے دیکھا اور اکثر روبرو بھی سنا۔ شاعری فارسی ترکیبوں سے گراں قدر تھی، مگر بوجھل نہیں محسوس ہوئی۔ کیونکہ کئی ماہ تک سردیوں میں انھوں نے راقم کے غریب خانے پر قیام کیا۔ کالج سے دور قیام تھا اور بچے جون پور جاچکے تھے مجھے دہلی یونیورسٹی کے احاطے میں یونیورسٹی کا مکان ملا ہوا تھا۔ میری گذارش پر وہ میرے پاس آگئے۔ میرا بھانجہ ہر وقت ان کی خدمت کرتا۔ چند ماہ ان کے ساتھ بہت اچھے گزرے۔ سردیوں میں بھی وہ آدھی رات تک نیند کو ٹالتے رہتے۔ ان کی صبح بھی دیر سے نمودار ہوتی۔ اٹھنے کے بعد نماز ادا کرتے۔ فیضان (میرا بھانجہ) مصلے پر ہی انھیں چائے پیش کرتا۔ ان سے دعائیں لیتا۔ چونکہ وہ ذاکر حسین کے شبینہ کالج میں تھے اس لیے بہت اطمینان سے سہ پہر میں کالج کے لیے کشاں کشاں روانہ ہوتے۔ تدریسی اوقات کے بعد اکثر محفل شعر بھی منعقد ہوجاتی۔ دن بھر کی تکان سے آسودگی مل جاتی۔ تقریباً یہ معمول بن گیا تھا۔

تیرے فسانے عجیب تیرے زمانے عجیب

130 اشعار پر مشتمل ہے ابلیس کی تیری مجلسِ شوریٰ یہ نظم سمنانی مرحوم کے قدرت کلام کی یادگار ہے۔ ابلیس کی آخری گفتگو کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں کہ ہوں آتش نفس، آتش نژاد، آتش ضمیر
میری قسمت میں نہیں فیضِ نجاتِ اخروی
ہے مرا پرداختہ اس دور کا سارا نظام
ہے مری پروردۂ آغوشِ تہذیب نوی
اشتراکیت ہوئی میرے نفس سے بار ور
میرے ہی زلّہ ربا ہیں مزد کی ومانوی

سمنانی مرحوم نے نظم میں ایک دوسرا نکتہ پیدا کیا ہے کہ ابلیس کی زبان سے شاعر مشرق کے حضور خراج پیش کرنے کا منتظر بھی منظوم کیا ہے۔

وہ حکیمِ ارضِ مشرق نغمہ سازِ بے بدل
سرگروہِ عاشقاں، سرخیل ارباب ہمم
صاحب ضربِ کلیم وجانِ اسرارورموز
دیکھتا ہے دل کے آئینہ میں تقدیرِ امم

لفظیات اور آہنگ کے ساتھ اقبال کے تعارف کا اسلوب بھی انوکھا ہے۔ مرحوم کی پوری شاعری پر اقبال کی فکر اور اسالیب کا گہرا نقش نمایاں ہے۔ شخصیت کے ساتھ حلقۂ یاراں میں ایسے مرد ہنر مند کا کلام مرتب نہ ہوسکا۔ ان کی شعری تخلیق کی یہ شناخت بھی تھی۔ افسوس ہے کہ ایسے مردِ ہنر کا کلام مرتب نہ ہوسکا۔ ان کی غزلیں بھی ان کے منفرد اسلوبِ فکر کی غماز ہیں وہ کلاسیکی روایات کی حامل ہیں۔ اور جدید فکر ومسائل کی ترجمانی سے معمور بھی ہیں۔

مسجد قرطبہ کے واگذاشت ہونے کی خبر پر سمنانی صاحب نے اسی وزن اور ہیئت میں 64 اشعار کی بڑی خوب صورت نظم لکھی۔ جو رسالہ 'معارف' میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئی۔ یہ ایک مرصع اور مربوط آہنگ سے منفرد اسلوب کی حامل ہے اور اقبال کی تخلیق سے قریب تر ہے۔ اس نظم سے مشابہ ابھی تک کوئی دوسری نظم نظر سے نہیں گزری اقبال کے 'پیامِ مشرق' کے 'لالۂ طور' کی رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مسودہ مجھے دکھایا تھا اور کچھ حصہ سنایا بھی تھا۔ افسوس ہے کہ انتقال کے بعد ان رباعیوں کا کیا انجام ہوا۔ معلوم نہ ہوسکا، مرحوم کی بہت سی تحریریں اسی طرح تلف ہوئیں۔ مرحوم مزاجاً قلندری اور بے نیازی کے پیکر تھے وہ اپنا نہ بن سکے اور نہ اپنا کچھ کر سکے ہاں تن آسانوں کے کام آئے۔ وہ مردِ میداں اور میر لشکر کی آرزو بھی نہیں رکھتے تھے۔ ہاں سجادہ نشینی کی مجلسی روایت پر ہمیشہ کار بند رہے مگر شاعری میں عزم جواں اور پیکارِ زندگی کی ترجمانی ان کا شیوۂ گفتار تھا۔ سکون پسند زندگی تھی۔ علم کا جلال پُر شکوہ تھا۔ مگر نرم دمِ گفتار تھے۔ تبحرِ علمی کے ساتھ وہ مسلکی معاملات میں محدود نظر رکھتے تھے۔ چونکہ وہ خانوادۂ خانقاہی کے پروردہ تھے۔ ان کے عزیز واقارب کو بھی کچھوچھہ کی سجادگی وشہ نشینی راس آتی تھی۔

لطائفِ اشرفیہ مخطوطہ کی تدوین وترجمہ کا بار بار ذکر کرتے۔ نعتیہ ادب سے فکری مناسبت تھی۔ اس موضوع پر ان کی گفتگو وسعتِ مطالعہ کی مظہر ہوتی۔ مولانا سہیل اعظمی کا بے نظیر نعتیہ قصیدہ۔

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیِ امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

پورا قصیدہ تقریباً ازبر تھا وہ لطف وانبساط کے ساتھ اکثر پڑھتے۔ اقبال کا کلام ان کے ریشہ ہائے دل میں رواں رہتا۔ خود ان کی شاعری میں اقبال کی لفظیات اور ترکیبیں ان کی شناخت بن گئی تھیں معاصر شعرا کی محفلوں میں ان کا بڑا وقار تھا۔ ان جیسا کوئی صاحبِ مطالعہ بھی نہ تھا۔ مگر خاکساری اور عاجزی ان کی نسبی فطرت کا جوہر خاص تھا۔ انھوں نے کئی کتابوں پر مقدمے لکھے اور قطعات تاریخ بھی رقم کیں جون پور کے ایک کہنہ مشق شاعر محسن رضا کے شعری مجموعہ 'زخمہ' کا مقدمہ قابلِ ذکر ہے ان کے انتقال پر تاریخ بھی قلم بند کی۔ دہلی یونیورسٹی کے قریب اسپتال میں انتقال کی خبر ملی۔ سایۂ شفقت سے محرومی اور چراغ علم کا سرِ شام بجھ جانا، راقم کے قیامِ دہلی کا پہلا حادثہ تھا۔ دہلی میں کسی دوست کے گزر جانے کا یہ پہلا صدمہ تھا۔ بعد میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر محمد حسن جیسے محسن ومربی کے انتقال سے شہرِ علم پر تاریکی ویرانی کا احساس ہوا۔

پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام

ان حضرات کی رفاقتیں اور بے شمار یادیں اب بھی گوشۂ دل میں اضطراب پیدا کرتی ہیں۔ دیر تک سکوتِ مرگ کی خاموشی طاری رہتی ہے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

جون میں ایک تیسری شخصیت ڈاکٹر عبدالسلام (وفات 24 اکتوبر 2019) کی تھی جن کا مطب سبزی منڈی میں ہے۔ وہ ندوی عالم تھے۔ علی گڑھ سے بی یو ایم ایس کیا تھا۔ دستِ شفا رکھنے والا کرشمہ ساز طبیب سے میری رفاقت تھی۔ وہ ہم مشرب وہم راز تھے۔ جلوت وخلوت میں ان کی ہم نشینی سرمایۂ زندگی تھی۔ بقول اقبال ان کے نفس کی موج سے نشوونمائے زندگی تھی وہ بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ رفاقتیں اب سراب بن گئیں۔ وہ بے انتہا مخلص تھے اور مخیّر تھے۔ کئی مسجدوں کے انتظام وانصرام میں مصروف رہتے مریضوں کے ساتھ مسیحائی کا حسن سلوک اور ان کی دل داری شیوۂ زندگی کا دستور بن گیا تھا۔ چمکتا چہرہ اور خوش مزاجی وخوش گفتاری کا خاصہ تھا۔ کبھی کبھی ذاتی زندگی کی نارسائیوں کی پرچھائیں پل بھر کے لیے متاثر کرتیں مگر وہ اندوہِ دل نہ بن سکیں وہ خوش کلامی کے

ساتھ خوش خوراک تھے احباب کو دستر خوان پر جمع کرنے کی جبلی خواہش سے ہمیشہ سرشار رہتے۔ آئے دن دوستوں کے لیے دستر خوان مخصوص اور موسمی کھانوں سے آراستہ ہوتا۔ انھیں کھانے سے کہیں زیادہ کھلانے کا شوق ہوتا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان کی رفیقۂ حیات شہناز بیگم کو بھی اتنی ہی مسرت ہوتی وہ خود نگرانِ کار اور میزبان ہوتیں۔ ان دونوں کی رفاقتیں بھی قابلِ رشک تھیں۔ سلام صاحب نام لے کر پکارتے مگر وہ بڑی محبت سے ڈاکٹر صاحب ہی کہتیں۔ سلام صاحب مریضوں اور مطب کی مصروفیات سے فارغ ہوتے ہوئے رات کے گیارہ بج جاتے۔ محترمہ بھی ان کے کھانے کے اہتمام میں مصروف رہتیں۔ حیرت ہوتی تھی کہ صبح سے رات تک وہ مریض دیکھتے تھکتے نہ تھے۔ ناچیز نے ان سے بارہا درخواست کی یہ مصروفیت صحت کو راس نہیں آتی۔ مگر انھیں ایک جنون تھا۔ ہر لمحے کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کر چکے تھے۔ آخر کار صحت شکر کی مہلک بیماری کی نذر ہوگئی۔ مگر ان کے عزم واستقلال پر حرف نہ آیا۔

میری ان سے ملاقات 1977 میں ہوئی۔ والدہ کے علاج کے سلسلے میں میرے محترم دوست حافظ سراج الدین کاشف مچھلی شہری نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا۔ انھیں کے ساتھ سلام صاحب کے مطب میں حاضر ہوا۔ ایک جواں سال اور خوب رو مسیحا سے ملاقات ہوئی۔ گورے رنگ نے چہرے کو نور و سرور کی بشاشت بخشی تھی۔ آنکھوں کی چمک میں صبحِ نو کے ظہور کا عالم محسوس ہوا۔ گفتگو میں دلبری اور دردمندی نے بہت متاثر کیا۔ ان سب سے بڑھ کر ان کی سرگرمی اور تفاعل وتحرک کا انداز قابلِ رشک تھا۔ لباس کی سادگی حکیم حاذق کے گداز بدن پر زیب دیتی۔ ان کی شخصیت میں وقار تھا مگر یہ وقار محبت وشفقت کا مرکب یا مجموعہ بھی تھا۔ بعض معاملات میں انھیں نرم لہجے میں بگڑتے مگر آخر میں مسکراتے بھی دیکھا وہ گرم گفتاری کے بعد پشیماں ہوتے۔

جان سے ہم تو جاتے ہیں تم بھی جاؤ جانے دو

پر بات ختم ہوتی۔ مریضوں سے الجھتے نہ دیکھا۔ ہاں سرپرستوں اور تیمارداروں کو تنبیہ ضرور کرتے۔ مرض کے علاوہ مریض کی نفسیات اور طرزِ زندگی کے احوال پر نظر رکھتے۔ ان کی بے مثال مسیحائی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جب انگریزی دوا کارگر نہ ہوتی تو وہ طب یونانی کی ادویہ تجویز کرتے۔ انھیں مفردات کا خوب علم تھا۔ راقم کو اکثر بتاتے کہ شہر کے سب سے مشہور حکیم منظور احمد کے مطب میں مدتوں کام کرنے کی وجہ سے جڑی بوٹیوں کے علم سے وہ زربکف ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بہت سی یونانی دوائیں خود تیار کراتے دوستوں کے لیے بھی کارکشائی اور کارسازی کا سامان فراہم کرتے۔ خاص طور پر موسم سرما میں مقویات کی تیاری کا بڑا اہتمام کرتے۔ ایک میر شکار سے ان کا خاص تعلق تھا۔ سردیوں میں سیکڑوں کنجشک خریدتے اور خاص معجون تیار کراتے۔ کنجشک کے گوشت سے پلاؤ پکواتے اور دستر خوان پر لطفِ دوستاں کا مزہ لیتے۔ وہ بے حد خوش باش اور خوش خوانسان تھے۔ مسکراتا ہوا چہرہ ہر مرض اور ہر غم کو غلط کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ وہ ملولِ خاطری کو پسند نہ کرتے اور نہ کبھی مایوسیوں سے شکست کھائی نجی زندگی کی بعض ناہمواریوں کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے۔ یہ مکروہات شخصی نہ تھے۔ بلکہ مسلم معاشرے کے پروردہ تھے۔ جنھیں چار وناچار انگیز کرنا پڑتا ہے۔ جونپور کا مسلم معاشرہ کبھی علم وعمل کے بام گردوں سے ہم آغوش ہوا کرتا تھا مگر معاصر سماجی صورتِ حال تشویش ناک اور زوال زدہ ابتری میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کا مداوا کسی بھی چارہ ساز کے بس میں نہ تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام آئے دن معاشرے کے مختلف مسائل سے گزرتے رہے۔ انھیں منصف ومسیحا سمجھ کر لوگ مسائل کے حل کے لیے رجوع کرتے رہے۔ وہ اپنی زندگی کی ناخوش گواریوں سے بھی نبرد آزما تھے۔ پہلی شادی سے مطمئن نہ تھے۔ تمام تر شفقت وکفالت کے بعد بھی چھوٹے بھائی نے الگ رہنا پسند کیا۔ حد درجہ احترام واحتیاط کے باوجود والدین نے چھوٹے بھائی کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی وہ معذور بہن کے معالجے میں اپنی بے دست وپائی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے رہے۔ ٹانڈہ میں دوسری شادی نے انھیں مسرور ومطمئن کیا اور شہناز بیگم کی رفاقت کو ربِّ کریم کی بے پایاں نوازش کہنے لگے۔ ہاں ایک احساس اب بھی دامن گیر تھا۔ انھوں نے ایک دن سیہ رات کی تنہائی میں ایک بڑے راز کی بات کہی جو دوست کی امانت کے طور پر آج بھی سینے میں محفوظ ہے۔ یہ ہم دمِ دیرینہ کی بخشی ہوئی خلش کی بڑی نعمت ونوازش سے کم نہیں۔ اقبال نے کہا ہے کہ بزم جہاں، حور وجناں اور بادہ وساغر سے کہیں زیادہ بہتر اک ہم دمِ فرزانہ کی صحبت ہے۔

از بزمِ جہاں خوشتر از حور و جناں خوشتر

اک ہمدمِ فرزانہ و زبادہ و پیمانہ

جونپور میں ہر سال کئی راتیں ان کے گھر بسر ہوئیں گورکھپور، بنارس، اعظم گڑھ، مئو، الہ آباد، جون پور تقریباً ہر سال کسی نہ کسی ادبی یا تعلیمی کام کے لیے جانا ہوتا۔ واپسی میں جون پور انھیں کے ساتھ قیام کرتا۔ یہ شادی یعنی 1981 سے پہلے کی بات ہے۔ میری شادی میں ایک موثر محرک وہ بھی تھے۔ 1980 میں شبلی کالج میں ایم اے کے آخری سال کے زبانی امتحان (وایوا) کے لیے حاضر ہوا۔ ناہید رحمٰن بھی وہاں امتحان دینے آئی تھیں۔ ان کے خاندان کے سبھی لوگ ڈاکٹر عبدالسلام سے ہی علاج کراتے تھے۔ ان کے گھر سے ڈاکٹر صاحب کا بہت ہی بے تکلفی کا معاملہ تھا۔ شبلی کالج سے گاؤں لوٹتے وقت رات ان کے گھر ٹھہرا۔ جونپور کی تمام طالبات کا ذکر آیا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتے رہے اور طالبات کے گھر گھرانے سے اپنی شناسائی کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے فضل الرحمٰن مرحوم سے میرا ذکر کیا۔

یہ عجیب بات تھی کہ انھوں نے ایک تخلیقی ذہن پایا تھا۔ یادداشت بلا کی تھی۔ 'کلیاتِ قانون' کے صفحے کے صفحے انھیں ازبر تھے۔ اکثر مجھے سنایا بھی۔ اس کی بنا پر وہ مرکبات کے اجزا کے خواص کا تجزیہ بھی کرتے اور علاج کے دوران استعمال بھی کرتے۔ انگریزی دواؤں پر تکیہ تھا۔ مگر ساری دوائیں اعلیٰ پایے اور معتبر کمپنیوں پر ہی اکتفا کرتے جب بھی موقع ملتا کچھ رقم کرتے۔ مختصر جملے حکمت ونصیحت سے بھرپور عبارت محفوظ ہوجاتی یہ سب ان کے ذہنی مشاہدے پر مبنی ہوتے۔ مجھے اکثر پڑھ کر سناتے بھی، کبھی کبھی جملے درست بھی کیے جاتے۔ 'کشکول' کے علاوہ کئی کتابچے شائع ہوئے۔ ناچیز نے 1989 میں شائع ہونے والی کتاب 'اقبال کے شعری اسالیب' ان کے نام معنون کی۔ انتساب کے مصرع پر مجھے بے حد داد ملی مگر دونوں کی دوستی کے مراسم پر رشک بھی کیا گیا۔

تیرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو

ان کی سرخوشی اور سرشاری دیکھ کر مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی یہ عمر بھر کی کمائی نہ تھی بلکہ علم واکتساب کا آغاز ہوا تھا پھر بھی فارسی شعر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

(زندگی بھر کی کمائی کو دوست کی راہ میں لٹا دیا۔
خوش ہوں کہ اپنی زندگی میں ایک کام تو کیا)

محبوب دوست اور مشفق ومہرباں ہم نوا کی یادوں کا غبار زندگی کا زادِ راہ بن کر اکثر مغموم ومضطرب کرتا ہے۔

بے بہا موتی ہیں تیرے چشمِ گوہر بار کے

■

Prof. Abdul Haq
2315, Ground Floor, Hudson Lane
Kingsway Camp
Delhi - 110009
Mob.: 9350461394

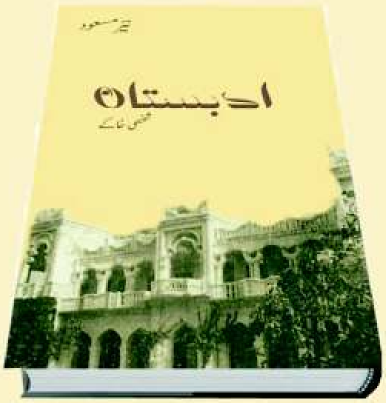

ادبستان ایک تعارف

شعیب نظام

پروفیسر نیر مسعود کے خاکوں کا مجموعہ ادبستان کے نام سے 2006 میں شہزاد پبلی کیشن کراچی سے شائع ہو چکا ہے مگر ہندوستان میں چونکہ پاکستان سے کتابوں کے آنے جانے کا سلسلہ پچھلے کئی سالوں سے بند ہے اس لیے یہ کتاب ہندوستان میں معدودے چند افراد کے پاس ہو تو ہو۔ اس میں ادبستان کے حوالے سے نیر مسعود نے بہت دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں بقول نیر مسعود:

’’کبھی کبھی میرے ذہن میں ایک پرانی حویلی کی تصویر بنتی ہے اس حویلی کا رنگ نارنجی تھا جس پر جابجا دوڑتی ہوئی سیاہی نے اسے بھیانک بنا دیا تھا اس کی برجیوں پر چھوٹے چھوٹے گنبد تھے حویلی کے سامنے والے باغ کو سڑک سے الگ کرنے والے اشوک کے اونچے درختوں نے ایک سبز دیوار قائم کر دی تھی۔‘‘

لکھنؤ کے محلہ اشرف آباد کا مذکورہ علاقہ دراصل پہلے قبرستان تھا اسی قبرستان پر یہ حویلی مرزا محمد ہادی رسوا کے جگری دوست سید جعفر حسین کے بیٹے سید حامد حسین نے بنوائی تھی یہ وہی جعفر حسین صاحب ہیں جن کا ذکر مرزا رسوا نے اپنے سوانحی ناول ’شریف زادہ‘ میں ان کے اصل نام کے ساتھ کیا ہے۔ سید حامد حسین نے حویلی کے پہلو میں اس سے ملتی جلتی لیکن نسبتاً جدید طرز کی ایک عمارت اپنے رہنے کے لیے بنوائی تھی اور حویلی کو خالی چھوڑ دیا تھا جسے سید مسعود حسین رضوی ادیب نے خرید لیا تھا۔ خریدنے کے کچھ عرصے بعد انھوں نے اس حویلی کو تقریباً از سر نو تعمیر کرا کے اس کی شکل بدل دی۔

حویلی کی تعمیر کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے انجینئر آغا امیر حسن صاحب کی خدمات مسعود صاحب نے حاصل کی تھی جنھوں نے فن تعمیر کی باقاعدہ تعلیم نہیں حاصل کی تھی مگر بہت باکمال انجینئر تھے کیونکہ وہ تعمیرات میں وہ جدتیں بھی کر دکھائے تھے جو کتابی علم کی رو سے ناممکن تھی۔ آغا صاحب نے حویلی کا ایک نقشہ مسعود حسین رضوی ادیب کے سامنے پیش کیا جو انھیں سپاٹ معلوم ہوا۔ مسعود صاحب کے مشوروں کے مطابق نقشے میں خاطر خواہ تبدیلیاں کی گئیں اور پھر اسے گویا حتمی شکل دے دی گئی۔ آغا صاحب نے اپنے نقشے میں خوبصورت نقش و نگار کا اضافہ کیا تھا مگر مسعود صاحب کو خیال آیا کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ جب یہ رنگ پھیکے پڑ جائیں گے یا اُڑ جائیں گے تب ظاہر ہے اس کی خوبصورتی بھی ختم ہو جائے گی۔ مسعود صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ یہ نقش و نگار اگر رنگ کے بجائے کٹاؤ کے کام سے کیا جائے تو بہتر ہے لیکن پلاسٹر پختہ ہو جانے کے بعد کتابی علم تعمیر کی رو سے یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک سارا پلاسٹر توڑ کر اینٹوں پر نئے سرے سے سیمنٹ نہ چڑھائی جاتی۔ مسعود صاحب نے یہ سوچ کر افسوس کا اظہار کیا مگر آغا صاحب فن تعمیر کے کتابی علم سے نابلد تھے اس لیے انھوں نے جواب دیا کہ ہو جائے گا مسعود صاحب اور پتہ نہیں کس حکمت سے آغا صاحب نے پختہ پلاسٹر پر سیمنٹ چڑھا چڑھا کر روغنی نقوش کو ابھارا اور تراش تراش کر پتھر کر دیا یہ نقوش آج بھی اسی صورت میں برقرار ہیں۔

ان ہی نقوش کے درمیان عمارت کی مشرقی اور مغربی بڑی برجیوں پر انگریزی میں اور بیچ کی چھوٹی برجی پر اردو میں عمارت کا نیا نام ادبستان ابھرا ہوا ہے۔

ادبستان کی بالائی منزل کے ستونوں پر مسعود صاحب نے بڑے بڑے حلقے بنوانے کا مشورہ دیا آغا صاحب نے یہ حلقے باڑھ بندھوا کر اوپر بنانے کے بجائے نیچے زمین پر رکھ کر ڈھال دی اور مسعود صاحب سے بالا کپی (کرین) لانے کی فرمائش کی جس کی مدد سے یہ حلقے اوپری منزل تک پہنچائے جا سکیں۔ مسعود صاحب بالا کپی کی تلاش میں دن بھر مارے مارے گھومے اور ناکام ہو کر جب جھنجھلائے ہوئے واپس آئے تو آغا صاحب محض اینٹوں کے تلے اوپر چبوترے بنوا بنوا کر حلقوں کو نہ صرف اوپر تک پہنچا چکے تھے بلکہ انھیں ستونوں پر چپکا بھی رہے تھے۔

حویلی کی بالائی منزل پر صرف اونچی نیچی چھتیں تھیں۔ مسعود صاحب نے اس پر نئے کمرے راہ داریاں اور دوسرے ضروری درجے بنوا کر اسے ایک مکمل سکونتی مکان کی شکل دے دی اور حویلی کی چھت اس مکان کے فرش میں بدل گئی۔ بالائی منزل کے چاروں نئے کمروں کی تعمیر کے وقت ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا ان کمروں کی تقسیم اور تعداد نچلی منزل والے کمروں کے مطابق نہیں تھی۔ لہٰذ نئے کمروں کی دیواروں کے سہارے کے لیے حویلی کی چھت کے نیچے کوئی دیوار نہیں تھی اس لیے پرانی چھت نئی دیواروں کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی تھی۔ مسعود صاحب کے ذہن میں ایک خیال آیا انھوں نے ڈرتے ڈرتے آغا صاحب سے پوچھا کہ آغا صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان دیواروں کو کمرے کے فرش سے اٹھانے کے بجائے ان کی چھت سے لٹکا دیا جائے اس طرح فرش پر زور نہیں پڑے گا لیکن..... آغا صاحب نے جواب دیا کہ ہو جائے گا مسعود صاحب اور لوہے کی سلاخوں کو عجیب عجیب وضعوں سے موڑ موڑ کر ان کے پردے سے بنائے اور چھتوں سے لٹکا دیے پھر ان میں سیمنٹ بھر بھر کر ان کو ٹھوس دیواروں کی صورت دے دی یہ دیواریں کمروں کے فرش کو چھوتی نہیں تھیں بلکہ ان کے کچھ اوپر معلق تھیں تا کہ صناع کا کمال ظاہر کر سکیں لیکن اس طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جھانکا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے جھانکنے کا کام دیوار کے اوپر سے نہیں بلکہ نیچے سے کیا جا سکتا تھا لہٰذا کچھ عرصے بعد وہ خالی جگہیں بھر دی گئیں اب یہ دیواریں عام دیواروں کی طرح نظر آتی ہیں اور دیکھنے والا یہ نہیں بتا سکتا

کہ اوپر سے نیچے آ رہی ہیں یا نیچے سے اوپر جا رہی ہیں۔

اس طرح ادبستان کی تعمیر مکمل ہوئی مکان کے اندر ڈائنگ ہال، ڈرائنگ روم، خواب گاہ اور متعدد دوسرے کمرے کئی دالان، صحن چیاں، کوٹھریاں، گودام اور سات غسل خانے ڈیوڑھی باہر شاگرد پیشہ موٹر گیراج کنواں باغ میں مالی کے رہنے کا کوارٹر چبوترہ، برآمدہ منشی جی کا کمرہ ان سب میں بجلی کی روشنی اور نل کے پانی کے انتظام کے بعد مسعود حسین رضوی ادیب کا خواب ادبستان کی صورت میں اہل لکھنؤ کے سامنے تعبیر کی صورت میں اپنا جلوہ دکھانے لگا۔

جالیوں پر دوڑتی سدابہار بیلوں سے ڈھکے ہوئے سمر ہاؤس میں ایک بڑا حوض تھا جس میں نازک سی کشتی تیرتی رہتی تھی باغ میں پھولوں کے درختوں کے علاوہ تقریباً تمام معروف پھولوں کی کیاریاں اور روشیں تھیں۔ چبوترہ اور برآمدے میں گملوں اور نادوں کی قطاریں رہتی تھیں جس میں کروٹن اور دوسرے آرائشی پودے لگے ہوئے تھے۔

مسعود صاحب کی زندگی میں ڈرائنگ روم وکٹوریائی صوفوں آبنوسی رنگ کی گدے دار کرسیوں اور ایرانی قالینوں سے آراستہ تھا لیکن ملاقاتیوں کے لیے شاذ و نادر ہی کھولا جاتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے سامنے والے برآمدے میں کرسیاں رہتی تھیں انھیں میں ایک بڑی آرام کرسی تھی جس پر مسعود صاحب بیٹھتے تھے ان میں سے زیادہ تر کرسیاں اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں مگر کبھی ان کرسیوں پر یگانہ، آرزو، حسرت موہانی، یلدرم، پریم چند اور صفی وغیرہ بیٹھا کرتے تھے۔ مسعود صاحب موسم کے لحاظ سے ادبستان میں اپنے سونے اور پڑھنے کی جگہیں بدلتے رہتے تھے شروع شروع میں زیادہ تر وہ لکھنے پڑھنے کا کام برآمدے کے مغربی پہلو والے چھوٹے کمرے میں جسے دفتر کہا جاتا تھا کرتے تھے اس دفتر میں ایک منشی جی بھی بیٹھتے تھے جن کا کام مسعود صاحب کے مسودے وغیرہ کی نقل تیار کرنا تھا۔ گرمی اور برسات میں مسعود صاحب گھر کے بڑے صحن میں اور شدید گرمی میں کوٹھے پر سوتے تھے نیر صاحب بتاتے ہیں کہ اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ:

''ہم اس گھر میں رہتے نہیں بلکہ رہتے پھرتے ہیں''

مسعود صاحب کے پاس ایک موٹر کار بھی تھی اور ایک تانگہ بھی کبھی وہ یونیورسٹی موٹر کار سے جاتے اور کبھی تانگہ سے۔ مسعود صاحب نے ادبستان میں اپنے ذوق کے مطابق اتنی کتابیں اور مسودات جمع کر لیے تھے کہ ان کی لائبریری ان کی زندگی میں ہی ملک بھر میں مشہور ہوگئی تھی۔ مسعود صاحب کا ایک اصول تھا کہ وہ اپنے کتب خانے سے کسی کو کوئی کتاب مستعار نہیں دیتے تھے ان کا اصرار ہوتا تھا کہ آپ جب تک چاہیں غریب خانے پر بیٹھ کر کتاب سے استفادہ کریں مگر میرا اصول ہے کہ کوئی کتاب گھر سے باہر نہیں جائے گی۔

مکان جتنا بھی عالیشان ہو اس کی رونق اس کے مکینوں سے ہی ہوتی ہے، نیر صاحب لکھتے ہیں:

''وہ (مسعود صاحب) پورے ادبستان پر ایک گھنے درخت کے سایے کی طرح چھائے ہوئے تھے لیکن اس سایے کے ساتھ ایک پر سکون روشنی بھی تھی جو ادبستان کو منور رکھتی تھی یہ ان کی رفیقۂ حیات کی شخصیت کی روشنی تھی جو ڈھائی سو افراد کے بکھرے ہوئے خاندان کی شیزازہ بند تھیں دور و قریب کے عزیزوں میں کہیں بھی کسی کو ذہنی پریشانی لاحق ہوتی تو سیدھا ادبستان کا رخ کرتا اور کچھ دن کے لیے سارے دکھ بھول جاتا۔''

مسعود صاحب اپنی رفیقۂ حیات سے بہت محبت کرتے تھے وہ سخت ترین مصروفیات کے عالم میں بھی اپنے تھکے ہوئے ذہن کو سکون دینے کے لیے کچھ وقت ان سے باتیں اور ہنسی مذاق میں ضرور گزارتے، دن میں ایک آدھ بار لکھنا پڑھنا چھوڑ کر وہ گھر کے اندر ضرور آتے اور پکارتے 'ارے بھائی کہاں ہو' وہ جب کسی ضرورت سے کہیں باہر چلی جاتیں تب مسعود صاحب پر عجیب مایوسی طاری ہو جاتی تھی۔ ایک بار ستمبر 1969 میں وہ دو تین ہفتے کے لیے اپنی بڑی بیٹی کے پاس الہ آباد چلی گئیں جب وہ واپس آئیں تو مسعود صاحب نے ان سے شکایت کرتے ہوئے بقول نیر مسعود کہا تھا کہ:

''اب ہمیں اتنے اتنے دن کے لیے چھوڑ کر نہ جایا کرو''

23/اکتوبر 1969 کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا مرحومہ کی وصیت کے مطابق گھر میں غسل دے کر 4 بجے فضل حسین خاں کی کربلا میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مسعود صاحب نے اپنی ڈائری میں اس سانحے کا ذکر کرتے ہوئے اس شعر کا بھی اندراج کیا تھا۔

مٹی سے بچاتے ہیں سدا جس کا تن پاک
اس گل پہ گرا دیتے ہیں خود سیکڑوں من خاک

مسعود صاحب کو اچار بنانے کا بہت شوق تھا وہ جب کبھی باورچی خانے میں اچار بنانے کے لیے گھس جاتے تو بقول نیر مسعود اندر سے صدائیں آنے لگتیں ارے بھائی کلونجی منگالی ان مرچوں میں کوئی جان نہیں ہے۔ رائی اور بھجبویہ بہت کم ہے اور جب اچار تیار ہو جاتا تو وہ بچوں کی ہتھیلیوں پر تھوڑا تھوڑا اچار ٹپکا کر یہ ضرور پوچھتے کہ کیسا بنا ہے۔ نیر صاحب بتاتے تھے کہ جب اچار بہت ذائقہ کا بنا ہوتا تو میں دوبارہ ہتھیلی آگے کر دیتا کہ ابا تھوڑا سا اور دیجیے کہ ابھی سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ ذائقہ کیسا ہے دوبارہ چکھنے کے بعد ہم لوگ اچار کے خوش ذائقے ہونے کا اعلان کر دیتے۔

مسعود صاحب کی ایک عادت اور تھی کہ جب باہر سے کوئی مہمان آ جاتا تو وہ اپنے دوستوں کو اس سے ملانے کے لیے کھانے پر ضرور مدعو کرتے اس طرح گھر میں خوب چہل پہل رہتی یوں بھی لکھنؤ اور باہر کے ادیب مسعود صاحب سے ملاقات کو آتے رہتے تھے سب کی گفتگو کا محور زیادہ تر ادب ہوتا تھا سب کا اپنا اپنا انداز گفتگو تھا۔ مولانا عرشی اور مولانا ضیاء الدین بدایونی کی گفتگو میں ایک حجاب آمیز انکسار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں خود اپنے علمی تبحر کی خبر نہیں ہے۔ مرزا یگانہ باتیں کرتے کرتے بلاسبب برہم ہو کر اپنے آپ ٹھیک ہو جاتے تھے۔ چودھری محمد علی ردولوی اور مرزا محمد عسکری گرم گرفتار ہوتے تو محفل پر پھول سے برستے معلوم ہوتے۔ قاضی عبدالودود فیصلہ کن انداز میں بات کرنے اور ادبی معاملات میں رو رعایت اور مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ ڈاکٹر صفدر آہ سے گفتگو کے دوران عجیب جوش و خروش کا عالم طاری رہتا تھا اپنی طویل زندگی میں ادیب کی ملاقاتیں اپنے عہد کے تقریباً سبھی ادبی مشاہیر سے ہوئیں، بقول نیر مسعود:

''اگر صرف ان ملاقاتوں کی مختصر روداد یں وہ (مسعود صاحب) قلم بند کرتے تو ایک ضخیم، دلچسپ اور معلومات افزا کتاب تیار ہو جاتی۔''

ادیب کی اپنے آخری دنوں میں یادداشت بہت کمزور ہوگئی تھی یہاں تک کہ وہ ادبستان کا نقشہ بھول جاتے تھے اور مکان کا نقشہ طلب کر کے اسے دیر تک دیکھتے رہتے اور نیچے سے اوپر تک کی منزل کے سب کمروں کو ذہن نشین کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔

29 نومبر 1975 کو مسعود صاحب کی وفات ہوئی۔ مسعود صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے پاکستان چلے گئے اور ادبستان میں پروفیسر نیر مسعود اور ان کے چھوٹے بھائی اظہر مسعود کے خاندان رہنے لگے۔

نیر مسعود صاحب اپنے والد کے کتب خانے میں زندگی بھر اضافہ کرتے رہے نیر صاحب کے پاس ملک اور بیرون ملک سے تحفتاً بہت سی کتابیں آتی تھیں وہ ضرورت کی کتابیں الگ کر کے باقی کتابیں باہر کے

برآمدے میں ایک لکڑی کی الماری میں رکھتے جاتے تھے۔ اور چند شائقین کتب کو اطلاع کردیتے کہ اب کتابیں اور رسائل خاصے یکجا ہوگئے ہیں وہ آکر الماری خالی کرجاتے ان میں نمایاں نام کانپور کے چاندمیاں طیب صاحب کا تھا جواپنے ساتھ بوریاں اوررسی لے کر آتے تھے اور کتابیں بوریوں میں رکھ کر رسی سے باندھ کر باہر لے جاتے تھے اور پھر رکشے وغیرہ پر رکھ کر چار باغ تک لے جاتے تھے۔

نیر مسعود صاحب اردو اور فارسی دونوں مضامین میں پی ایچ ڈی کرچکے تھے تھوڑے دن کے لیے ان کا تقرر بحثیت لیکچرار شاید بریلی میں ہوگیا تھا مگر وہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا اور پھر کچھ مدت بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں انھوں نے لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ نیر صاحب کو ادبستان چھوڑ کر کہیں جانے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی انھوں نے زندگی میں صرف ایک بار ایران کا سفر کیا تھا اس سفر کے بعد انھوں نے ایک سفرنامہ بعنوان ''خنک ملک ایران'' لکھا ہے اس کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے گہری دوستی ہونے کی وجہ سے ایک آدھ بار وہ دہلی کے سیمیناروں میں شریک ہوئے اور دو چار بار علی گڑھ کے سیمیناروں میں گئے ہوں گے اس کے علاوہ ایک بار وہ طارق چھتاری (جوان دنوں ریڈیو میں افسر تھے) کے اصرار پر گورکھپور گئے تھے ورنہ انھیں برابر دعوت نامے آتے رہتے تھے مگر وہ سیمیناروں میں شریک ہونے سے معذرت کرلیتے تھے وہ ادبستان چھوڑ کر کہیں جانے سے گھبراتے تھے۔

میرے لکھنؤ یونیورسٹی پہنچنے سے پہلے شہنشاہ مرزا جن کی نیر مسعود صاحب سے بہت قربت تھی انھوں نے انیس اشفاق، قمر احسن، محمد مسعود اور شاہنواز قریشی وغیرہ کو نیر صاحب سے ادبستان لے جاکر ملایا ان لوگوں نے ایک تنظیم بزم حملہ آوراں بنا رکھی تھی جس میں جو بھی تخلیق پڑھی جاتی اس پر خاصی گرما گرم بحثیں ہوتیں اور سخت سے سخت تنقید بھی کی جاتی۔ میں جب اردو میں ایم اے کررہا تھا تب ایک دن انیس اشفاق صاحب نے مجھے اور شافع قدوائی کو لے جاکر نیر مسعود صاحب سے ملایا تھا اب انیس اشفاق اور شہنشاہ مرزا کے ساتھ ہم لوگ بھی نیر صاحب کے یہاں جانے لگے وہاں جانے کے اوقات طے شدہ تھے صبح نو بجے سے گیارہ بجے دن تک نیر صاحب اپنے ڈرائنگ روم میں ہوتے تھے اور شام کو مغرب کے بعد سے تقریباً نو بجے رات تک وہ ڈرائنگ روم میں ملتے تھے اتنے بڑے مکان میں نیر صاحب نے کوئی گھنٹی نہیں لگوائی تھی۔ گیارہ بجے دن کے بعد یا رات نو بجے کے بعد گیٹ پر آنے والا کتنی بھی آوازیں لگائے وہ اندر تک نہیں پہنچتی تھیں۔ نیر صاحب سے ملنے والوں کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ ان سے کس کس وقت ملاقات ہوسکتی ہے کبھی کبھی ان کے سب سے قریبی دوست شمس الرحمٰن فاروقی صاحب آجاتے تھے اور عابد سہیل یا زیب غوری سے کسی موضوع پر بحثیں ہونے لگتیں تو رات میں وقت کی قید ہٹ جاتی اور کبھی کبھی ڈیڑھ دو بجے رات تک ان بحثوں کا سلسلہ چلتا رہتا اور فاروقی صاحب واپس ریور بینک کالونی جانے کے بجائے نیر صاحب کے یہاں ہی سوجاتے۔

نیر صاحب کے گھر کی محفلوں میں ہمیشہ صرف ادب پر ہی گفتگو ہوتی تھی وہ ہم سب سے فرمائش کرکے جو بھی نیا لکھا جاتا سنتے ادبی موضوعات پر نیر صاحب کا ذہن اتنا صاف تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ موضوع پر بھی وہ اتنی نپی تلی اور سادہ زبان میں روشنی ڈالتے کہ موضوع ہم سب کے سامنے آئینہ ہوجاتا۔ دھیرے دھیرے مجھے اندازہ ہوتا گیا کہ نیر صاحب ادب کے علاوہ بھی بہت سے موضوعات پر کامل دسترس رکھتے ہیں مثلاً علم طب، عطر سازی، زہر کے اقسام، پرندوں اور جانوروں کے خصائل پر وہ بہت دیر تک بہت ہی عمدہ گفتگو کرتے تھے اور جب اسلم محمود صاحب جو ریلوے میں ڈی آر ایم تھے وہ آجاتے تو انگریزی ناولوں اور ہالی ووڈ کی فلموں پر نیر صاحب کو گفتگو کرتے دیکھ کر مجھے شروع شروع میں بہت حیرت ہوتی تھی انھوں نے جیمس ہیڈلی چیز اور ابن صفی کے تمام ناول پڑھ رکھے تھے کرکٹ سے بھی انھیں خاصا شغف تھا۔ ان سے برابر ملاقاتوں کے دوران ہر بار مجھ پر ایک نیا انکشاف ہوتا تھا کہ ارے نیر صاحب کو سائنس سے بھی دلچسپی ہے۔ دھیرے دھیرے مجھے یقین آتا گیا کہ نیر صاحب کا ہر موضوع پر مطالعہ غضب کا ہے میں یہ ضرور سوچتا کہ انھیں اتنا پڑھنے کا وقت کہاں سے مل جاتا ہے۔

نیر صاحب کو میں نے ادبستان میں چبوترے پر لحاف اور گدوں میں دھاگا ڈالتے بھی دیکھا، انھیں نواڑ کے پلنگ بنتے بھی دیکھا وہ اپنی کتابوں کی جلد بندی خود کرتے تھے اور گھر میں بجلی کی کوئی بھی خرابی ہو تو اسے ٹھیک کرلیتے تھے وہ لکڑی کی سجدہ گاہیں اور چھوٹے موٹے سامان خود بناتے تھے اور اپنے قریبی دوستوں کو تحفتاً پیش کردیتے تھے۔

ہندوستان کے باہر سے جو بھی اہم ادبی شخصیت لکھنؤ وارد ہوتی وہ نیر صاحب سے ملنے ادبستان ضرور جاتی وہیں میری ملاقات انتظار حسین، افتخار عارف، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور آصف فرخی سے ہوئی۔ عرفان صدیقی صاحب کے کلام کے نیر صاحب خاصے معترف تھے اور ان سے فرمائش کرکے ان کا کلام ضرور سنتے تھے۔

میں نے جب پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا تو تحقیق کے لیے میں نے یاس یگانہ چنگیزی کا انتخاب کیا مگر میں اس موضوع پر شعبۂ اردو کے کسی پروفیسر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی نہیں کرنا چاہتا تھا ڈرتے ڈرتے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر شبیہ الحسن سے گذارش کی کہ میں نیر مسعود صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں وہ حیرت سے مجھے دیکھتے بلکہ گھورتے رہے اور بولے کہ اگر نیر صاحب تحریری طور پر یہ لکھ کر دے دیں کہ وہ آپ کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرانے پر تیار ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا میں نے جھجھکتے ہوئے نیر صاحب سے پورا واقعہ بیان کردیا اور وہ مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے اور واپس اپنا لیٹر پیڈ لاکر اس پر تحریری طور پر اپنا اجازت نامہ لکھ کر ایک لفافہ میں رکھ کر مجھے دے دیا۔ یہ شاید اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کہ اردو کے کسی طالب علم کو شعبۂ فارسی کے پروفیسر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت ملی ہو۔ اس کے بعد بھی آج تک اس طرح کی صورت حال کبھی نہیں پیدا ہوئی۔

مجھے یگانہ کے مجموعے تلاش کرنے میں بہت دشواری پیش آئی لکھنؤ والوں نے تلاش کرکرکے یگانہ کا کلام ایک زمانے میں شائع کردیا تھا اور دوبارہ ان کے مجموعے شائع بھی نہیں ہوئے تھے اس کا پہلے سے مجھے اندازہ نہیں تھا خاصا مواد میں نے پرانی لائبریریوں سے حاصل کرلیا اور خاصا کچھ مواد مجھے ادبستان سے یعنی نیر بھائی کے ذریعے مل گیا۔

میرے اور شافع قدوائی کے ساتھ محسن خاں بھی نیر صاحب کے یہاں جانے لگے اس زمانے میں محسن تواتر سے افسانے لکھ رہے تھے اور شافع قدوائی بھی تنقیدی مضامین لکھتے تھے میں زیادہ تر شاعری کرتا تھا بیچ بیچ میں مضامین بھی لکھتا رہتا تھا۔ نیر بھائی ہم لوگوں کی چیزیں بہت غور سے سنتے تھے اور کوئی کمی ہوتی تھی تو اس پر بہت نرم لہجے میں اشارہ بھی کردیتے تھے ورنہ جی کھول کر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ نوجوانوں میں سید محمد اشرف اور شاہد اختر بھی ان کے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں تھے۔ کچھ دنوں بعد محمود ایاز نے سوغات (بنگلور) جاری کیا یہ رسالہ اپنی نوعیت کا بڑا منفرد اور معیاری رسالہ تھا نیر صاحب کی تحریریں برابر اس رسالے میں شائع ہورہی تھیں۔ محسن خاں کا ایک افسانہ زہرہ سوغات میں شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ نیر صاحب نے بھی محسن خاں کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی۔ شافع قدوائی نے سلیم احمد کی شاعری پر ایک بہت عمدہ مضمون لکھا تھا جو نیر صاحب کے گھر کی نشست میں پڑھا گیا میں نے غلام عباس کے افسانے

آنندی اور بیدی کے افسانہ گرم کوٹ کا تجزیہ کیا تھا اس پر نیر بھائی نے خاصی حوصلہ افزائی کی تھی۔ مہینے دو مہینے میں ہم لوگ نیر بھائی کے گھر پر کسی نشست کا اہتمام کر لیتے تھے جس میں ناشتہ، پانی اور چائے کا انتظام نیر بھائی کرتے تھے۔ تمثال میاں (نیر صاحب کے صاحبزادے) تب چھوٹے تھے وہ اندر سے پلیٹیں وغیرہ لاتے لے جاتے تھے ان نشستوں میں شہنشاہ مرزا، انیس اشفاق، وقار ناصری، محمود مسعود، عرفان صدیقی، شافع قدوائی، محسن خاں اور میرے علاوہ کبھی کبھی تصور حسین زیدی اور عثمان غنی صاحب بھی شریک ہوتے تھے بعد میں انیس انصاری صاحب بھی ان نشستوں میں شریک ہونے لگے۔

نیر صاحب ہر ضرورت مند کی مقدور بھر مدد کرتے رہتے تھے کئی ہندی اور انگریزی کے طالب علم لکھنویات پر نیر صاحب کے پاس برابر آتے رہتے تھے اور ان سے اس موضوع پر نوٹس لیا کرتے تھے بعد میں وہی مواد جو نیر صاحب نے فراہم کیا تھا اس کی بنیاد پر کتابیں لکھ کر اتہاس ود اور ہسٹورین بن گئے مگر یہ خبر سن کر نیر صاحب صرف مسکرا دیتے تھے۔ ایک صاحب نیر صاحب کے یہاں اکثر اتوار کو آجاتے تھے ایک اتوار کو میں اور شافع قدوائی جب نیر صاحب کے یہاں پہنچے تو وہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے تھوڑی دیر بعد وہ اجازت لے کر چلے گئے۔ نیر صاحب نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ صاحب یہ صاحب جب آتے ہیں تو میں ایک حد متعین کر لیتا ہوں کہ یہ اتنے بے وقوف ہیں مگر جب دوسری بار آتے ہیں تو وہ یہ حد توڑ دیتے ہیں۔ مشہور محقق کاظم علی خاں بھی نیر صاحب کے یہاں برابر آتے تھے کبھی کبھی نیر صاحب کے دانتوں میں شدید درد ہوتا تھا جو ناقابل برداشت ہو جاتا تھا ہم لوگ نیر صاحب کے گھر پہنچے تو نیر صاحب نے ڈرائنگ روم پہنچتے پہنچتے بتایا کہ آج دانت میں شدید تکلیف ہے ہم لوگ نیر صاحب کے اصرار کے باوجود اجازت لے کر نکلنے لگے کہ بھائی آپ آرام کیجیے اتنی دیر میں کاظم علی خاں صاحب تشریف لے آئے میں نے گیٹ کھول کر انھیں بتایا کہ آج نیر بھائی کے دانت میں شدید تکلیف ہے مگر وہ ڈرائنگ روم تک مزاج پرسی کے لیے آ ہی گئے اور یہ کہتے ہوئے کہ نیر صاحب آپ آرام کیجیے ہم لوگوں کے ساتھ واپس آنے لگے نیر صاحب گیٹ بند کرنے ساتھ ساتھ آئے اور گیٹ پر کھڑے ہو کر کاظم صاحب نے تحقیق کا ایک پیچیدہ مسئلہ چھیڑ دیا اور تقریباً پینتیس چالیس منٹ تک اپنی فتوحات سے نیر صاحب کو واقف کراتے رہے وہ ایک ہاتھ سے ایک طرف کا گال دبائے سکون سے کاظم صاحب کی باتیں سنتے رہے کئی بار کے ٹوکنے کے بعد ہم لوگوں نے کاظم صاحب سے نیر صاحب کا پیچھا چھڑایا ورنہ لگتا یہی تھا کہ آج وہ تحقیق کا مسئلہ حل کیے بغیر جانے والے نہیں ہیں۔

ایک بار بقرعید کے دنوں میں نیر صاحب امین آباد سے کاظم علی خاں صاحب کے ساتھ رکشے پر آ رہے تھے رکشے پر بیٹھتے ہی کاظم صاحب نے آغا حجو شرف کا ذکر چھیڑ دیا رکشہ رکاب گنج تک پہنچا تو وہاں بکروں کا بازار لگا ہوا تھا نیر صاحب نے پوچھا خان صاحب آپ کو بکروں کے بارے میں کچھ معلومات ہے خاں صاحب بولے کیوں نہیں نیر صاحب نے کہا کہ ایک بکرا میرے لیے بھی دیکھ لیجیے جب خان صاحب بکروں کے درمیان گم ہو گئے تو نیر صاحب نے رکشے والے سے چلنے کا اشارہ کیا اور آرام سے گھر واپس آگئے بعد میں انھوں نے خان کو مطمئن کر ہی دیا ہوگا۔

ایک دن عرفان صدیقی صاحب میرے ساتھ نیر بھائی کے یہاں گئے چائے وغیرہ کے بعد عرفان صاحب بولے کہ نیر صاحب چائے تو نفیس ہوتی ہی ہے کراکری بھی بہت نفیس ہے نیر صاحب مسکرا دیے اور عرفان صاحب سے اصرار کر کے ان کا کلام سنا اگلے اتوار کو نیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ آجائیے گا تو ساتھ میں عرفان صاحب کے یہاں چلیں گے میں نے عرفان صدیقی صاحب کو بھی مطلع کر دیا تھا ہم لوگ عرفان صاحب کے یہاں پہنچے تھوڑی دیر بعد نیر صاحب نے تھیلے سے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک بھاری چیز نکال کر میز پر رکھ دی عرفان صاحب نے استفسار کیا کہ نیر صاحب یہ کیا ہے۔ تب انھوں نے کہا کہ اتفاق سے کراکری کا وہی سیٹ مل گیا تھا جس کی آپ نے تعریف کی تھی تو آپ کے لیے لیتا آیا نیر صاحب کے جانے کے بعد عرفان صاحب دیر تک نیر صاحب کی وضع داری کی تعریف کرتے رہے۔

نیر صاحب جب بیمار ہو کر تقریباً صاحب فراش ہو گئے تب بھی ہم ظفر غازی اور شاہد اختر برابر نیر صاحب کے گھر جاتے رہے اس سے پہلے جب بھی کوئی افسانہ مکمل کر لیتے تھے تو چھپنے سے پہلے میں اس کی فوٹو کاپی لے آتا تھا اس طرح ان کی ہینڈ رائٹنگ میں کئی افسانے میرے پاس محفوظ ہیں ان کی ہینڈ رائٹنگ اتنی منفرد تھی کہ وہ صرف ان ہی سے مخصوص تھی اس سے مشابہ بھی کسی کی ہینڈ رائٹنگ آج تک نہیں دیکھی وہ اکثر مجھ سے ایڈگر ایلن پو کے افسانوں کا وہ مجموعہ جسے ابن انشاء نے ترجمہ کیا تھا مانگتے اور اس پر عمدہ کور چڑھا کر ٹیپ سے چپکاتے اور جلی حروف میں میرا نام لکھ کر رکھ دیتے جب میں جاتا تو وہ کتاب اس نفاست سے مجھے واپس کر دیتے یہ نفاست ان کے مزاج کا حصہ تھی جب نیر صاحب پہلی بار فالج کا شکار ہوئے تو میڈیکل کالج میں بھرتی کے دوران جب مزاج پرسی کے لیے ان سے ملنے گیا تب انھوں نے میر انیس پر اپنی تحقیق پوری نہ ہونے پر تشویش کا اظہار کیا۔ اصل میں یہ کام ان کے ابا یعنی سید مسعود حسین رضوی ادیب کے سپرد کیا گیا تھا مگر اپنی زندگی میں وہ یہ کام مکمل نہیں کر سکے اس لیے نیر صاحب کو اس کام سے جذباتی لگاؤ تھا اور مرض میں افاقہ ہونے کے بعد جب وہ واپس ادبستان لوٹے تو پورے انہماک کے ساتھ یہ کام مکمل کر دیا کتاب خاصی ضخیم ہو رہی تھی اس لیے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ (1) سوانح انیس (2) مرثیہ خوانی کا فن (3) موازنۂ انیس و دبیر۔

حیرت ہوتی ہے کہ نیر صاحب نے اتنے مستند حوالے کیسے جمع کیے ہوں گے کہ پوری کتاب کسی معتبر حوالے کے بغیر آگے نہیں بڑھتی تحقیق کے شائقین کے لیے یا نو آموزوں کے لیے یہ مثالی کتابیں ہیں جن کو درسی کتابوں کی طرح پڑھنا چاہیے کہ تحقیق کیسے کی جاتی ہے۔

میں جب شروع شروع میں ادبستان جاتا تھا تو سڑک اور ادبستان کے درمیان ایک باؤنڈری وال تھی جس کے اوپر سے ادبستان کی بلڈنگ صاف دکھائی دیتی تھی لیکن بعد میں باؤنڈری ہٹا کر سامنے دکانیں بنوا دی گئیں جس کی وجہ سے اب سڑک سے ادبستان دکھائی نہیں دیتا میں تمثال سے ملنے جب وہ امریکہ سے واپس آتے ہیں اب بھی ادبستان جاتا ہوں مگر ہمیشہ ایک محرومی کے ساتھ میری واپسی ہوتی ہے اور تمثال اور ان کی بیوی سے ملنے کے بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ گیس سلنڈر والے واقعے کے دن نیر صاحب نے ایزا کہا تھا کیونکہ ان کی بہو کا نام ایزابل ہے جو امریکن خاتون ہیں میں نے غلطی سے اسے عیسیٰ سمجھ لیا تھا تمثال میاں کے ساتھ میں نے گھر کو اندر تک دیکھا ہے ادبستان آج بھی ایک بہت بڑی حویلی ہے اب خدا کرے تمثال میاں کسی طرح اتنے بڑے کتب خانے کی حفاظت کر سکیں میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں اور بس۔ تمثال میاں تو امریکہ میں پروفیسر ہیں اور وہ نیر مسعود صاحب کے وارث بھی ہیں مگر لکھنؤ میں پروفیسر انیس اشفاق کو ان کا جانشین کہا جا سکتا ہے۔

■

Shoeb Nizam
105/591 Hafiz Hleem Compound
Bhannana Purwa, Chaman Ganj
Kanpur- 208001 (UP)
Mob.8960416841

سرفراز جاوید

اردو ماس میڈیا میں ترجمہ کی ضرورت

دنیا میں ترجمہ نگاری کی ضرورت، زمانہ قدیم سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔وہ افراد،اس کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے رہے ہیں جومختلف امور کے پیش نظر دیگر اقوام سے ارتباط کے خواہاں رہتے ہیں۔خاص طور سے تجارتی اورحکومتی امور میں دنیا کی دیگر قوموں سے تعلقات قائم کرنے کی شدید ضرورت پڑتی ہے۔تحریری ترجمہ نگاری کا چلن زبانی چلن کے بہت بعد میں ہوا۔ کیونکہ انسانوں کے مابین باہمی طور پر زبانی خیالات کا تبادلہ قدیم زمانے سے ہوتا رہا ہے۔چونکہ انسان فطری طور پر اپنے نظریے اور اشیا کی تشہیر واشاعت کا ہمیشہ خواہشمند رہا ہے۔جس کے لیے ترجمہ ہی ناگزیر سہارا بنا۔ بعدازاں ماس میڈیا کی اصطلاح منظر عام پر آئی۔جس نے حیرت انگیز انداز میں عوام وخواص پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب دنیاوی سطح کے تمام امور، خاص طور سے صحافت کی ضرورتوں کے باعث ترجمہ بھی چوتھے ستون میں بڑی حیثیت کا مجاز بنا ہوا ہے۔

ترجمہ کے تعلق سے تین اہم پہلو یعنی معلوماتی، تہذیبی وثقافتی اقدار اور جمالیاتی خصوصیات تسلیم کی جاتی رہی ہیں۔انھی تین پر ترجمہ نگاری کا دارومدار ہے۔عصر حاضر میں ماس میڈیا سے دنیا کی تمام زبانیں اورعوام وابستہ ہیں۔اس لیے دنیا کی کوئی بھی قوم اپنی اوردوسری زبان کے ترجمے کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی ہے۔جس کے مدنظر اردو ماس میڈیا میں بھی ترجمہ نگاری کی اشد ضرورت ہے۔

دراصل ترجمہ انسان کی بین الاقوامی ضرورتوں کے ساتھ علم وادب کی ترسیل کا سب سے بڑا ذریعہ رہا ہے۔ کیونکہ ترجمہ لسانی، تخلیقی اور ثقافتی عمل ہے۔ترجمہ میں کسی زبان کی لسانی، تخلیقی وثقافتی چیزوں کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ہم ترجمے کے ذریعے کسی زبان وقوم کی سماجی اور سائنسی چیزوں کو سمجھتے ہیں۔ ہر مترجم کے لیے ترجمہ خاص چیلنج کا حامل ہوتا ہے۔جس سے وہ براہ راست نبردآزما ہوتا ہے۔وہ زبان کے ابلاغ وترسیل کی ضرورت کے مدنظر اس کی تسہیل کرتے ہوئے قارئین کو دوسری زبان کے مفہوم ومعنی سے روبرو کراتا ہے۔ترجمے کے عمل کا تعلق کسی حد تک لسانیات سے ہے۔کیونکہ ترجمہ صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی سطحوں پر متبادلات کی کھوج کا عمل بھی ہے۔ ترجمے کے ذریعے ایک زبان کے متن میں بظاہر خیالات کوصرف دوسری زبان میں منتقل کرنے کا ہی عمل نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو احساس، کیفیت، لہجہ اور طرز کے بھی ترجمے کا طالب ہوتا ہے۔ ہندوپاک میں اردو ماس میڈیا کی ضرورتوں کا انحصار ترجمے پر ہے۔اردو ماس میڈیا میں ترجمے کی ضرورت کے متعلق چند اصولی مباحث بھی پیش نگاہ رکھنا بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔جن کے بغیر ترجمے کے عمل میں غلطیوں کے مزید امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

ترجمہ کی تعریف اور مفہوم:

دراصل ترجمہ کسی زبان کے متن کے معنی ومفہوم کو دوسری زبان کے رسم الخط کے متن میں منتقل کرنے کا عمل ہے۔ جونہایت پیچیدہ اور تخلیقی عمل ہے۔ترجمے کی مختلف تعریفوں کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ہم ترجمے کے معنی ومفہوم پرغور کرتے ہیں۔ترجمہ لفظ کا انگریزی زبان میں مترادف لفظ Translation ہے،جس کا مفہوم اردو میں 'پارلے جانا' ہے۔ گویا مترجم کسی زبان کے خیال ومعنی کو دوسری زبان میں پارلے جاتا ہے۔ترجمہ میں بہت سی خوبیاں اورخامیاں راہ پانے کا قوی امکان بنا رہتا ہے۔اس سے قطع نظر کسی بھی فن پارے کے ترجمہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ فن پارہ اپنی کامیابی یاناکامی کے باوجود دیگر زبان میں زندگی پاجاتا ہے۔ ہاں یہ گمان غالب ہے کہ اصل متن کی زبان کی حلاوت وشیرینی ہدفی زبان کے متن میں منتقل ہوپائے گی یانہیں۔یایوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نئی زبان کے پیکر میں ڈھل کراصل زبان کی روح باقی رہے گی یافوت ہوجائے گی۔سوزن بیسنٹ کے خیال کے سیاق میں یہ بات بجا لگتی ہے کہ ترجمہ ایک متن کی موت کے بعد دوسری زندگی کا ضامن ہوتا ہے۔ یوں ترجمہ کسی زبان کے متن کے معنی ومفہوم کی بقا کا سبب بن جاتا ہے۔

ترجمہ کی ضرورت:

دنیاوی تمام علوم بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث ہیں۔زبانوں کے مابین تفریق سے قطع نظر ہر دور میں دنیا کی جملہ زبانوں میں کم وبیش دارالترجمے موجود رہے ہیں۔علوم وفنون کی توسیع کے ساتھ سائنسی علوم اور جدید ٹکنالوجی میں پیش رفت کے بغیر ترقی ایک دیوانے کے خواب کی مانند ہے۔مشاہدے کی رو سے یہ نظر آتا ہے کہ جوقوم جتنی ترقی یافتہ ہے وہاں ترجمے کے تعلق سے اتنی ہی زیادہ سرگرمیاں ہوتی ہیں تاکہ وہ قوم اس کی بدولت دیگر اقوام کے علوم وفنون اورافکارونظریات کواپنی زبان میں منتقل کرسکے۔

عصر حاضر میں عالمگیریت (Globalisation) کے باعث ترجمے کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے۔ایک دورتھا جب سفری وسائل اورسہولتیں کم ہونے کے باعث لوگ سفر کم ہی کرتے تھے۔لیکن معاصر دور میں سفری سہولتیں میسر آگئیں تولوگ روزی روٹی کی تلاش میں،اور دنیاوی سیاحت کے واسطے ایک دوسرے ملک کا سفر بہ آسانی کررہے ہیں۔یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مہاجرت کا دور ہے۔دراصل ترجمہ بھی ایک قسم کا مہاجرتی عمل ہی

ہے۔ جس کے سبب انسان علاقائی اورقومی زبان کے بہت سے اجزا منتقل کرلیتا ہے مگر اپنی مٹی وتہذیب کی بوباس منتقل نہیں کرپاتا، مگر صارفیت کے اس دور میں آدمی سرحد عبور کرکے دور دراز جگہوں پر نقل مکانی کررہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دوقوموں کے افراد کا باہمی ارتباط زبان کے ترجمے کاوسیلہ بن رہا ہے۔ معاصر ترقی یافتہ دور میں بھی مختلف ملکوں اورخطوں میں اپنی قومی اورعلاقائی زبانیں ضرور رائج ہیں۔مگر اس کے باوجود زبانوں کی آپس میں اثر پذیری روزافزوں ہے۔ بظاہر ہم مشاہدہ کررہے ہیں کہ عالمی سطح پر زیادہ بولی جانے والی زبان اور طاقتور قوموں کی زبان کے الفاظ علاقائی زبانوں اور بولیوں میں شمولیت پارہے ہیں۔ بلکہ وہ لہجہ اورتلفظ کے افتراق کے ساتھ علاقائی زبان اور بولی کا حصہ بھی بن رہے ہیں۔ کیونکہ معاصر عہد سائنسی ترقی اور ایجادات کا ہے۔جس میں روزانہ کی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ خود اردو زبان کے الفاظ بن چکے ہیں۔ ہم چند ایسے الفاظ پر توجہ مرکوز کررہے ہیں۔ جوعلمی حلقوں میں قطع عملی طور پر اردو داں طبقہ لکھتا اور بولتا ہے جیسے موبائل، کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، سیمینار، کانفرنس، ریلوے، پلیٹ فارم، ایئرپورٹ، کار، ہال، فلم...وغیرہ۔ بلاشبہ سائنسی ایجادات کی برکتوں کے باعث دنیاایک گلوبل ولیج بن چکی ہے اورعلم بھی کسی خاص قوم کی میراث نہیں رہا ہے۔جس سے ہرشخص استفادے کا مجاز ہوسکتا ہے۔موجودہ صدی میں فن ترجمے کا معاملہ محض فکروخیال کی ترجمانی نہیں رہا، بلکہ مترجم کے لیے ترجمہ میں اس کے خلاقانہ شعور کی عکاسی بھی ضروری ہوگئی ہے:

”1990 کی دہائی میں ماتحت / تابع فرمان مترجم کی بجائے ایک تخلیق کار اور ثالث مترجم کا تصور آیا جو ثقافتوں اورزبانوں میں ثالثی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔“

(مرزاحامد بیگ، ڈاکٹر، مغرب سے نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، 1988،ص14)

عالمگیریت کے اس دور میں ترجمے کی ضرورت کے مدنظرامریکن مترجم لارنس وینوٹی نے ترجمے کو تاریخی اورثقافتی سیاق میں دیکھنے کی اہمیت پر زور دیا۔انھوں نے اس کی مختلف جہات پرغوروخوض کیا۔انھوں نے یہ مانا کہ ترجمہ ایک زبان کے الفاظ کو Decode کرکے دوسری زبان میں ازسرنو Encode کرتا ہے۔ نئی لسانیاتی وضاحت کی رو سے زبان Signified اور Signifiers کاایک مربوط نظام عمل ہے۔ دراصل ترجمہ ایک زبان کے Signifiers کی دوسری زبان کے Signifiers سے تبادلہ کرتا ہے اور مترجم صرف ایک آزاد راوی بن جاتا ہے۔ جوکسی اصل زبان کے متن کومتعینہ نشانات سے آزادی دلاکر دوسری زبان کے علامتی الفاظ کے پیکر میں ڈھالتا ہے۔جس کے ذریعے وہ ایسی خلیج پر پل بناتا ہے۔ جو مصنف کی زبان کو نہ جاننے والے قارئین کے مابین اصل زبان کے رسم الخط کے متن کی صورت میں حائل ہوتی ہے۔

عصر حاضر میں ترجمہ میں کسی زبان کے متن میں موجود پیغام کی ترسیل پر توجہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ عالم میں قوموں کے مابین ترجمے کے ذریعے علمی، تہذیبی اورثقافتی سرمایے کوایک دوسرے تک پہنچانے کے ساتھ ان سے آگاہی حاصل کرانے کا کام بھی سرانجام دیا جارہا ہے۔ آج ترجمے کاعمل علم وادب کی تمام تر سرگرمیوں کی دریافت اور دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور حادثات کی معلومات پر محیط ہے۔ انسان اپنی علمی میراث سے ترجمے کے ذریعے بھرپور استفادہ کررہا ہے۔ مزید کسی زبان وادب کے افکار عالیہ کے علم کے ساتھ احساسات و جذبات میں بھی شریک کارہوتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کسی بھی زبان میں خاص طور سے ماس میڈیا کے میدان میں ترجمے کی ضرورت سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے۔ جو اردو ماس میڈیا کی بھی ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ حقیقت بڑی توجہ طلب ہے کہ عالمی سطح پر ترجمے کافن اورضرورتیں اپنے دور سے وابستگی کا اہم عمل بھی ہے۔

دنیا کی جملہ زبانوں میں ماس میڈیا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ معاصر دور میں تو عوام وخواص میں اس کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ اردو ماس میڈیا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہندوستان کی سطح پر تو اردو ماس میڈیا میں ترجمے کی نہایت ہی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اردو ثانوی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ سرمایہ دار طبقہ بغیر کسی منافع کے کوئی کاروبار نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ماس میڈیا کے حوالے سے خطیر رقم لگانے والے ہندوستانی سطح پر کوئی اردو کا ایسا بڑا اخبار نہیں ہے، جو دنیا کی بڑی زبانوں کا مقابلہ کرسکے۔

ہم ترجمے کے تعلق سے یہ عرض کرسکتے ہیں کہ کسی زبان کے متن کے معنی ومفہوم کو دوسری زبان کے رسم الخط میں منتقل کرنا ہے۔ مگر یہ حقیقت پیش نگاہ رکھنی چاہیے کہ ’ماس میڈیا‘ کا اطلاق تمام قسم کی اطلاعات سے ہے اور یہ اطلاعات ہرفرد وشخص کی ذاتی دلچسپی سے تعلق رکھتی ہیں۔ عوامی ذرائع ابلاغ میں عام طور پر ریڈیو، ٹیلی ویژن خاص ہیں، جس میں خبر اہم ہے اور خبر کسی شے کے تعلق سے اطلاع کے ساتھ معلومات فراہم کرتی ہے۔ اخبار کے ذریعے ہمیں دنیا جہان میں ہونے والے حادثات وواقعات، سائنسی ایجادات اورعلمی وادبی کارکردگی کا پتہ چلتا ہے۔اسی لیے ہم ترجمے کی متی اقسام کو پیش نظر رکھ کر ان کی اردو ماس میڈیا میں اہمیت وضرورت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

ترجمہ میں کسی زبان کی لسانی، تخلیقی وثقافتی چیزوں کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ ہم ترجمے کے ذریعے کسی زبان و قوم کی سماجی اور سائنسی چیزوں کو سمجھتے ہیں۔ ہر مترجم کے لیے ترجمہ خاص چیلنج کا حامل ہوتا ہے۔ جس سے وہ براہ راست نبرد آزما ہوتا ہے،وہ زبان کے ابلاغ وترسیل کی ضرورت کے مد نظر اس کی تسہیل کرتے ہوئے قارئین کو دوسری زبان کے مفہوم ومعنی سے روبرو کراتا ہے۔ ترجمے کے عمل کا تعلق کسی حد تک لسانیات سے ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ علمائے مترجم کی اکثریت نے ترجمے کے حوالے سے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ادب میں ہرصنف کا ترجمہ اپنی نوعیت کی رو سے جداگانہ ہوگا، کیونکہ ہرصنف اپنے سیاق وسباق میں الگ مزاج کی متقاضی ہوتی ہے۔ تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک ہی ادبی صنف کے مختلف فن پاروں کے ترجمے اپنی نوعیت کے اعتبار سے قدرے الگ ہوجائیں گے۔ عام طور پر ترجمے کی تین اقسام موضوع بحث آتی رہی ہیں:

(1) علمی ترجمہ (2)ادبی ترجمہ (3) صحافتی ترجمہ

مذکورہ ترجمے کی قسموں کے تعلق سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ تو ایک عمل ہے۔ یوں بھی کسی زبان میں رسم الخط کی منظوم اور منثور دوقسمیں ہوتی ہیں۔ ہاں متن کا مواد کس نوعیت کا ہے، وہی اس کو الگ قسم کے زمرے میں شامل کرتا ہے۔ اس لیے بالااقسام کو ہمیں متون کے لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔

علمی متن کا ترجمہ،ادبی متن کا ترجمہ اورصحافتی متن کا ترجمہ قابل غور ہیں۔اردو ماس میڈیا میں بھی بالاقسموں کے تعلق سے ترجماتی مواد کی اشد ضرورت درپیش رہتی ہے۔ کیونکہ ہرزبان کے عوام میں اپنی طبیعت ومزاج سے سامعین و قارئین کی تعداد ہوتی ہے۔ جس کے باعث ہرزبان کا میڈیا اپنے سامعین، ناظرین اورقارئین کے

مزاج کے مطابق مواد فراہم کرتا ہے۔ اردو ماس میڈیا سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا طبقہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے دنیا کی بڑی زبانوں کے عوام کے علمی، ادبی اور صحافتی مواد کو اردو داں طبقے تک پہنچانے کے لیے اردو ماس میڈیا میں ترجمہ نگاری کے عمل کی از حد ضرورت ہے۔

علمی متن کا ترجمہ:

علمی متن کے ترجمے میں عام طور پر لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ مترجم کسی زبان سے ترجمہ ہونے والی زبان میں متبادل الفاظ پر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ اس قسم کے ترجمے میں ماخذ زبان کی رو سے ہدفی زبان میں اس وقت دقت پریشانی ہے جب اس زبان کے کسی لفظ یا اصطلاحی لفظ کی کوئی علمی وفنی اصطلاح ہدفی زبان میں ترجمہ نہ ہو پارہی ہو اسی لیے ترجمہ بڑی مشاقی اور تجربے کا عمل بھی ہے۔ کیونکہ دقیق اور پیچیدہ علم کو فصیح وبلیغ انداز میں پیش کرنا بغیر تربیت کے آسان نہیں ہے۔ ہاں تربیت اور تجربہ مترجم کو اعتماد ضرور عطا کرتا ہے۔

عام طور پر علمی کتابیں منطقی انداز میں لکھی جاتی ہیں، جن میں فکر وخیال کی پیچیدگی کو سہل روپ سے پیش کیا جاتا ہے کہ حقائق واضح ہو جائیں۔ ہم یہ عرض کر سکتے ہیں کہ علمی متون کے ترجمے میں بھی افکار وخیالات کی ترسیل کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ اقتباس قابل غور ہے:

''موضوع سے واقفیت بنیادی شرط ہے۔ اس کے بعد اصل زبان سے اور پھر اپنی زبان سے یہی وجہ ہے کہ ڈبٹ رائٹ (امریکہ) کی Men Translation Project میں یہ طریقہ برتا گیا ہے۔ Translator, Quality Controle، Language Editor، Technieal Editor، مترجم، معیار کا نگراں، ٹیکنیکل ایڈیٹر، زبان کا ایڈیٹر۔ اس لیے میری رائے میں ترقی اردو بورڈ کو خالص علمی کتابوں کے ترجمے میں پہلے تو موضوع کے ماہر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ترجمے کے معیار کو پرکھنے کے لیے ایک دوسرے ماہر کو دکھانا چاہیے جسے تراجم کا بھی تجربہ ہو۔ اس کے بعد ٹیکنیکل ایڈیٹر سے مدد لینا چاہیے، جو صرف یہ دیکھے کہ مواد کی ترتیب، اعداد و شمار، چارٹ وغیرہ درست ہیں۔ آخر میں زبان کے ماہر کی بھی نظر ضروری ہے تا کہ ترجمہ زبان کی جی نی ایس (Genius) کے مطابق ہو اور الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت اجنبی نہ معلوم ہو'' (آل احمد سرور، تراجم اور اصطلاح سازی کے مسائل، مشمولہ ترجمہ روایت اور فن، مرتبہ نثار احمد قریشی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص، 165)

ترجمے کے تعلق سے یہ بات پیش نگاہ رہنی چاہیے کہ علمی متن کے تراجم کی بھی مزید کئی قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم کے ترجمے کی زبان الگ الگ ہوگی۔ مثلاً قدرتی علوم جن میں فطری اور حیاتیاتی علوم آتے ہیں۔ ان میں اصطلاحات اور حقائق کی پیش کش درکار ہوگی۔ زبان کے اسلوب وآہنگ کے اعتبار سے مترجم کی کوئی غرض نہیں ہوگی۔ سماجی علوم میں سیاسیات، اقتصادیات، لسانیات، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ آتے ہیں اور انسانی علوم کے حوالے سے ادبیات، فنون لطیفہ اور فلسفہ آتے ہیں۔ ان میں سائنٹفک طریقہ کار پر توجہ دی جاتی ہے۔

ادبی متن کا ترجمہ:

دنیا کی ہر زبان وادب میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ادب انسان کی معاشرتی زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب انسان کے جذبات اور احساس کی ترجمانی کا وسیلہ ہے۔ دنیا میں قومی اور علاقائی سطح پر بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر زبان میں کم وبیش علمی وادبی سرمایہ بھی موجود ہے، جس سے استفادے کی گنجائش ہمیشہ بنی رہتی ہے۔ عصر حاضر میں تو عالمی سطح پر قوموں اور افراد کے مابین باہمی طور پر میل جول میں از حد اضافہ ہوا ہے۔ انسان اس میل جول میں ضروریات زندگی کے پیغامات کی ترسیل عمومی طور پر زبان کے ذریعے ہی کرتا ہے۔ جب اس کو اجنبی قوم وزبان سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ زبان کے طور پر ترجماتی عمل سے گزرتا ہے۔ دنیاوی سطح پر ہر خطے میں ادب سے خاص شغف رکھنے والے اشخاص بھی پائے جاتے ہیں۔ جو دیگر زبانوں کے ادب کے جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ کسی قوم کے ادب کا ترجمہ اس کے فکر وفن اور بوباس کو دوسروں تک منتقل کرنا ہے۔ مزید نئی زبان کے ادبی مزاج سے بھی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ ادبی متن کا ترجمہ نہ محض ترجمانی، خیال اور اسلوب تک محدود ہے بلکہ وہ خالق کی شخصی انفرادیت اور معاشرے کے معاصر شعور کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ جس میں قوس قزح کی مانند الگ، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کو بھی قائم رکھتے ہیں اور نئے رنگوں کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی متن کا ترجمہ نہایت ہی مشکل مگر پر لطف عمل ہے۔

ادبی متن کے ترجمے کے تعلق سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ مترجم پر دوہری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ مترجم کو تخلیق کار کے خیال ومنشا تک رسائی پانے کی سعی کرنی پڑتی ہے۔ نیز تخلیقی فن پارے کے نفس مضمون کو جمالیاتی خوبیوں کے ساتھ ہدفی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ یہ فن تلوار کی دھار پر چلنے کی طرح مشکل ہے۔

ادبی متن کے ترجمے میں ہدفی زبان کے محاورے، ضرب الامثال، روزمرہ، استعارات، تشبیہات اور رموز وعلائم پر خاطر خواہ توجہ دی جائے، جس سے ادبیت پیدا ہو جائے اور ترجمہ طبع زاد محسوس ہونے لگے۔ ایسے تراجم دوسری زبان کو مالا مال بناتے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت مترجم کے سامنے ایسے الفاظ آتے ہیں کہ ہدفی زبان میں ان الفاظ کے مترادف نہیں ہوتے مگر مترجم پر یہ ذمے داری آن پڑتی ہے کہ اس کو زبان کے اظہار کے متبادل الفاظ کے ذرائع ڈھونڈنے ہوں گے، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ایک جانب تو زبان کی لفظیاتی کمیوں کی نشان دہی، تو دوسری جانب ان مشکلات سے نجات کے لیے تحریک بھی ملے گی۔ ابتدا میں یہ کاوش ہراساں ضرور کرے گی، لیکن اس چیلنج کو قبول کرنے سے نئے افق تک رسائی ممکن ہوگی۔ ادبی تراجم کی ضرورت ہر عہد میں رہی ہے مگر اب مزید بڑھ گئی ہے۔ خاص طور سے اردو ماس میڈیا میں ترجمے کی ضرورت بڑھی ہے۔

صحافتی متن کا ترجمہ:

ترجمے کی یہ قسم مضمون میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے کہ اردو ماس میڈیا میں ترجمے کی ضرورت وافادیت کیوں ناگزیر ہے؟ دراصل ماس میڈیا میں دنیا جہان میں رونما ہونے والے حادثات وواقعات کی خبروں کی اطلاع جلد از جلد عوام کو پہنچانی ہوتی ہے۔ عصر حاضر میں برقی میڈیا کی رفتار نے مترجم کی ذمے داریوں میں اضافہ کر دیا ہے کہ دنیا کی کسی بھی قوم کے تعلق سے خبری اطلاعات کا، اپنی زبان میں بڑی سرعت کے ساتھ ترجمہ کرنا ہوتا ہے کیونکہ آج الیکٹرانک میڈیا کسی خبر کو چند سکینڈ کے وقفے میں دنیا کے ہر کونے پہنچانے کی حامل ہے۔ صحافتی زبان میں ترجمے کا مکمل زور مفہوم اور اطلاع پر ہوتا ہے۔ صحافتی زبان کا استعمال عوامی ذرائع ابلاغ میں ہوتا ہے، لہٰذا اس میں از حد ضروری ہو جاتا ہے کہ معلومات کو عام فہم الفاظ میں واضح طور پر ادا کیا جائے۔ اس میں زبان و بیان کی مرصع کاری کے بجائے سلیس اور سادہ زبان پر دھیان دیا جاتا ہے۔ یعنی مروجہ زبان میں مناسب الفاظ کے ساتھ مفہوم کو پیش کر دیا جاتا ہے۔

صحافتی متن کے ترجمے میں مترجم کو اس بات کی آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی خبر کے مفہوم کو آزادی سے درست اطلاع کے ساتھ اپنے انداز میں ترسیل کر سکتا ہے۔ یعنی وہ کسی بات کی ترسیل کے لیے اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ کا انتخاب کر سکتا ہے۔ مگر اس پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ گنجلک اور پیچیدہ لفظوں اور طویل

جملوں سے گریز کرے اور عام فہم الفاظ اور چھوٹے جملوں پر توجہ مرکوز کرے۔ صحافتی متن کے ترجمے کے تعلق سے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے ہمیں اس زبان کے الفاظ کی نزاکت اور لسانی خوبیوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں الفاظ کے پیکر میں پوشیدہ معنی ومفہوم اور اطلاع سے غرض رکھنی چاہیے۔ یہ بات صحافتی متن کے ترجمے کے لیے درست ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے۔ کہ انگریزی خبروں سے اردو میں صحافتی ترجمے کی ضرورت کیوں اور کیسے پیش آئی؟ دراصل اردو صحافت میں ترجمے کے مسائل خاص طور سے برصغیر میں انگریزی دور اور انگریزی زبان کے تسلط کے باعث پیدا ہوئی۔ کیوں کہ اس دور میں صحافیوں کو ایک زبان سے دوسری زبان میں معلومات فراہم کرنی پڑتی تھی۔ ہر ملک میں عموماً خبررساں اداروں اور دیگر ذرائع اطلاعات کو خبریں قومی زبان میں ہی موصول ہوتی ہیں۔ اور مدیر کی خاصی توجہ اس خبر کو بہتر بنانے پر صرف ہوتی ہے۔ عام طور پر ہندوستان میں اردو ماس میڈیا میں خبریں ترجمے کے عمل سے گزر کر منظر عام پر آتی ہیں۔ کیونکہ خبررساں اداروں کی زیادہ تر رپورٹیں اور پریس ریلیز ہندی انگریزی میں جاری ہوتی ہیں۔ اردو ذرائع ابلاغ کے اداروں میں خبریں اور رپورٹیں ترجمے کے عمل سے گزرتی ہیں۔

صحافتی متن کے حوالے سے ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ صحافتی متن کے ترجمے میں معیار کے تعین سے متعلق ایسا کوئی مرکزی ادارہ نہیں ہے۔ جس سے بروقت استفادہ کیا جاسکے اور نہ ہی اتنے وقت کی گنجائش ہی ہوتی ہے۔ خبریں فوری طور پر ترجمہ کرنی پڑتی ہیں اسی لیے اس موقع پر جو لفظ سمجھ میں آتا ہے اسی سے کام چلانا پڑتا ہے۔ کیونکہ خبریں موصول ہونے سے نشر ہونے تک محدود وقت میں ہی یہ کام انجام دینا ناگزیر ہوتا ہے۔ جس میں کام کے لیے مستعدی اور چستی ہی لازمی امر ہوتا ہے کیونکہ مدیران کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی لفظ کے معنی ومفہوم کے مترادفات میں ترجیحی لفظ کی بنیاد پر ترجمے کے لیے غور وفکر کریں۔ ایسی ہنگامی صورت حال میں صرف مترجم کی واقفیت، علم وشعور، تربیت اور تجربہ کام آتا ہے۔ یعنی محض صلاحیت کی بنیاد پر ترجمے کی بہتری کا انحصار ہوگا۔ اخباری ترجمے میں سب سے مقدم ابلاغ ہوتا ہے۔ جو سادگی، سلاست اور روانی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ اخبار کے منیجر کو یہی خوبیاں پیش نظر رکھنی مناسب ہوتی ہیں۔ کیونکہ ایسے موقع پر علمیت کے اظہار سے سامعین وقارئین کو پریشانی میں نہیں ڈالا جاتا بلکہ ابلاغ پر توجہ صرف کرنی درکار ہوتی ہے۔

عصر حاضر میں ماس میڈیا یعنی صحافت محض اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن تک محدود نہیں بلکہ اس شعبے میں ٹکنالوجی کی ترقی کی بدولت اب فلم، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا وغیرہ سب شامل ہیں۔ صحافتی متن کا ترجمہ ان سب ذرائع سے تعلق رکھتا ہے۔ صحافتی ترجمے کے تعلق سے ان تین طریقوں کا استعمال کیا جاتا ہے:

(1) مکمل متن کا ترجمہ (2) منتخب متن کا مترجمہ
(3) اپنے نیوزی عملے کی رپورٹ کا ترجمہ

شعبہ ہائے صحافت کی ضرورت کے مطابق منتخب متن کے ترجمے پر ہی عمل ناگزیر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیشۂ صحافت میں ترجمے کا تعلق چولی دامن کے مترادف ہے۔ کیونکہ صحافی بطور ترجمان ہی اپنے فرائض سے وابستگی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی تقریر اور واقعے کی خبر کسی زبان میں ہوتی ہے۔ جب ان کو دیگر قومی اور علاقائی سطح کی زبان کے میڈیا میں نشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کی زبان وبیان میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ جب اس کو بین الاقوامی میڈیا میں نشر کیا جائے گا تو ہر ذریعہ ابلاغ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا ترجمہ سرانجام دے گا۔ یعنی اس بیان اور واقعے کو بعینہٖ ترجمہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ہدفی زبان میں صرف نفس مضمون کے ادائے مطلب کی کوشش کی جائے گی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ صحافتی متن کے ترجمے میں ہدفی زبان کے متبادل الفاظ سے قطع نظر خیال اور مقصد پر زور ہوتا ہے۔ جس کے لیے ضرورت کے مطابق اپنی مرضی کے الفاظ سے مقصد کی تبلیغ کی جاتی ہے۔

عصر حاضر میں صحافت کے تعلق سے یہ بات بڑی قابل غور ہے کہ صحافت کے بدلتے ہوئے کردار نے صحافتی متن کے ترجمے پر خاصا منفی اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ اب میڈیا کا کردار محض آگاہی اور ابلاغ نہیں ہے بلکہ کسی قوم، پارٹی اور گروپ کے طے شدہ مفاد اور نظریات کی بنیاد پر مخصوص معلومات اور تصویر کے کسی ایک ترجیحاتی رخ کی سامعین اور ناظرین تک ترسیل کرنا ہے۔ چنانچہ ترجیحات کی بنیاد کے مدنظر صحافتی متن کا انتخاب کیا جاتا ہے اور متن میں موجود دیگر معلومات سے دانستہ طور پر صرف نظر کیا جاتا ہے۔

عصر حاضر میں انسانی حیات وزیست کے ہر شعبہ ہائے زندگی میں انفارمیشن ٹکنالوجی کے ارتقائی مراحل اور انٹرنیٹ کے وسیلے نے زبردست تبدیلی لادی ہے۔ صحافت کے پیشے کو بھی تبدیلی سے ہم کنار کردیا ہے۔ اب صحافی کے پاس کام کرنے اور کام دکھانے کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔ معاصر دور میں یہ تسلیم کیا جانے لگا ہے کہ اب صحافی محض اخبار میں کام کرنے والا نہیں ہے بلکہ وہ شخص بھی ہے جو کسی عملے یا نیوز روم میں کام کے ساتھ خبر کا انتخاب، اس کی تحقیق اور ایڈیٹنگ کا کام بھی انجام دے اور قومی سیاسی مفاد کی خاطر مبالغہ آمیزی سے بھی کام لے، اور قومی طے شدہ مقاصد اور پالیسیوں کے پیش نظر دوستی ودشمنی کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

عصر حاضر میں صحافی کے پیشہ ورانہ چار اہم کام یعنی خبر کا انتخاب، تحقیق، ایڈیٹنگ اور تحریر کرنا ہے۔ جس کے باعث وہ اپنی مرضی کی خبر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن، روز اخبار اور ٹی وی چینلز پر بہت سی اہم شخصیتوں کا یہ عذر سامنے آتا رہتا ہے کہ ان کے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمے کی اسی تکنیک کے ذریعے کام انجام دیا جاتا ہے۔ دراصل میڈیا ہی اپنی مرضی سے ہیرو اور ولن بناتا ہے۔

ہم بالا مباحث کے سیاق میں یہ بات عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ صحافی کا کام بھی مترجم ہی کا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو نہ مترجم تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی کرانا چاہتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ صحافت عمل کا میدان ہے۔ اس میں جو بھی صحافی بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق خود کو جتنا زیادہ بہتر ترجمان بنائے گا، وہ اتنا ہی اچھا صحافی مانا جائے گا۔ عصر حاضر کے تقاضوں کی رو سے اردو ماس میڈیا میں بہت زیادہ سنجیدہ اور بہتر مترجمین کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اردو ماس میڈیا میں مالی سرمایے کی کمی کے باعث فیلڈ میں کام کرنے والے صحافیوں کی بے حد کمی ہے۔ اس لیے اردو ماس میڈیا میں بیشتر خبروں کا انحصار ترجمے پر ہی کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی سطح پر دیگر زبانوں، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی خبروں کے ترجمے کی ہمہ وقت ضرورت پیش پیش رہتی ہے۔

معاون کتب

1. اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اعجاز راہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1994
2. ترجمہ روایت اور فن، نثار احمد قریشی، اسلام آباد، 1985
3. ترجمہ کا فن اور روایت، قمر رئیس، تاج پبلشنگ ہاؤس دہلی 1976
4. ترجمہ کا فن، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، کتابی دنیا دہلی 2005
5. فن ترجمہ نگاری، خلیق انجم، سرسید بکڈپو علی گڑھ 1990
6. مغرب سے نثری تراجم، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1988

■

Dr. Safaraz Javed
R-155, Gali No.: 6, Sir Syed Road
Jogabai Ext, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 9971895740

نیاز سلطان پوری

پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور اردو

پنڈت رام نریش ترپاٹھی (پ: 4 مارچ 1889، و: 16 جنوری 1962) کا شمار 'دویدی یگ' کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بیک وقت بلند پایہ شاعر، مستند ادیب، سماجی کارکن مجاہدِ آزادی تھے، حصولِ آزادی کے لیے آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، برٹش حکومت نے 18 ماہ قید سخت اور سو روپے جرمانے کی سزا سنائی۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنی پرشکوہ نظموں کے ذریعے ابنائے وطن کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ اور آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ منشی پریم چند کی طرح آپ نے بھی اپنا ادبی سفر اردو کے ذریعے شروع کیا لیکن جلد ہی ان کو احساس ہو گیا کہ ہم عصر شعرا و ادبا کے آگے ان کا چراغ نہ جل سکے گا، غالباً اسی لیے آپ نے ہندی زبان کو اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کا مؤثر وسیلہ بنایا اور جلد ہی دنیائے ادب ہندی میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندی تحریک بھی ابنائے وطن کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی اور حصولِ آزادی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی تحریک شباب پر تھی۔ انھوں نے کھڑی بولی میں نثر و نظم کے اعلیٰ نمونے پیش کر کے ہندی کویوں اور لیکھکوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام کیا اور برج بھاشا کی جگہ کھڑی بولی کو ہندی ادب کے راج سنگھاسن پر بٹھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی کا جنم 4 مارچ 1889 کو موضع کوئری پور ضلع جون پور موجودہ سلطان پور میں ایک غریب برہمن خاندان میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں حاصل کی، پہلے اردو پھر ہندی کی طرف راغب ہوئے، سن شعور تک پہنچتے پہنچتے ان کے دل میں حب الوطنی اور خدمتِ خلق کا جذبہ کوہِ آتش فشاں کا لاوہ بن کر پھوٹ پڑا۔ وہ گاندھی جی سے ازحد متاثر ہوئے اور دیگر ابنائے وطن کی طرح تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نتیجتاً 1922 میں سرکارِ انگلشیہ نے انھیں گرفتار کر کے آگرہ میں داخلِ زنداں کیا۔ جہاں بقول پروفیسر محمود الٰہی: ''آگرہ جیل صرف پولیٹکل قیدیوں کے لیے خالی کر دیا گیا۔ چنانچہ اس وقت تقریباً تین سو پچاس سیاسی قیدی اس جیل میں موجود ہیں۔ اس زندانی مجمع میں جہاں بہت سے وکیل، بیرسٹر، ایڈیٹر، پروفیسر اور ڈاکٹر اور درجنوں ایم اے، اور بی اے ہیں وہیں ہندی اردو شعرا کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ یہ تمام اسیرانِ زندانِ فرنگ مختلف مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ چنانچہ منجملہ اور مشغلوں کے ایک ہفتہ وار مشاعرہ بھی ان لوگوں کے پروگرام میں داخل ہے اور پہلا مشاعرہ 20 جنوری 22 کو بعد نماز جمعہ (جیل خانے میں باقاعدہ نماز ہوتی ہے اور ہندو پوجا کرتے ہیں) شروع ہوا۔ میرِ مشاعرہ مولانا عارف ہنسوی کو منتخب کیا گیا، مصرع طرح یہ تھا۔

ہے یہ وہ درد جو شرمندۂ احساں نہ ہوا[1]

حسرت موہانی

اس مشاعرے میں تقریباً دو سو آدمی شریک تھے جن میں مسٹر مہادیو دیسائی، پرائیویٹ سکریٹری مہاتما گاندھی، مسٹر جارج جوزف ایڈیٹر انڈی پنڈنٹ الٰہ آباد، سوامی سچیتا نند، بابو ہرنام سنگھ بی اے، پنڈت گووند مالوی فرزند پنڈت مدن موہن مالوی الٰہ آباد، مسٹر گنپت سہائے سلطان پور بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس زندانی مشاعرے میں ایسی غزلیں پڑھی گئیں جو موجودہ تحریک کے سلسلے میں

قومی جوشِ عمل اورحب الوطنی کے جذبات سے مالامال تھیں،مسٹرعبدالمجید خواجہ کاشعر بہت پسند کیا گیااور بار بار پڑھوایا گیا،بابورگھوپتی سہائے کی پوری غزل بہت پسند کی گئی اوراہلِ سخن نے خوب دادادی،مسٹرمہابیرتیاگی نے بے ساختہ دادطلب کی،سیدمحمد شاہد کے دوشعر پسند کیے گئے مولاناخجندی کی پوری غزل قادرالکلامی کی مظہرتھی،حافظ عثمان کاشعر پسند کیا گیا،حفیظ الرحمٰن صاحب کی پوری غزل بہت توجہ اورشوق سے سنی گئی،پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے ایک شعر پڑھاجوحسبِ ذیل ہے:

اس نے سمجھاہی نہیں حبّ ِ وطن کیاشے ہے
جیل میں آکے جو سرکار کامہماں نہ ہوا[2]

پنڈت جی مہاتما گاندھی سے از حد متاثر تھے،ان کی فکر پر گاندھی جی کے اثرات مرتب ہوئے۔وہ ہندی کے مقتدر کوی ولیکھک (ادیب) بھی تھے اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں اردو زبان وادب سے بھی والہانہ عشق تھا۔ 1918 انھیں ہندی ساہتیہ سمّیلن ممبئی کے اجلاس میں پرچارمنتری (سکریٹری نشرواشاعت) منتخب کیا گیااور جنوبی ہندوستان میں ہندی کی اشاعت کا کام سونپا گیا،اس وقت سبھا کے صدر گاندھی جی تھے،ترپاٹھی جی اردو کوایک الگ زبان نہیں مانتے تھے بلکہ ہندی اوراردوکوایک ہی زبان تسلیم کرتے تھے،چنانچہ لکھتے ہیں:

ہندی سے میرا ابھپرائے (مقصود) پرانی ہندی سے نہیں ہے بلکہ اس کھڑی بولی سے ہے جس کا سانچہ وہی ہے جواردوکا ہے۔"[3]

انھوں نے ہندی زبان میں کویتا کومدی حصہ چہارم، اردوشاعری کی تاریخ سپردِقلم کی جوادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی،وہ اردوکومسلمانی ہندی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔چنانچہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

خسرواورکبیر کی کویتا کے اداہرنوں (مثالوں) کے رہتے ہوئے آب حیات کے فاضل مصنف مرحوم پروفیسر آزاد کا یہ لکھنا کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے،صحیح نہیں ہے،اردوکبھی کسی بھاشا سے نکلی ہی نہیں، ہندی ہی کانام اُردورکھ لیا گیا ہے۔اس کانام اردونہ رکھ کرمسلمانی ہندی رکھاجاتاتوادھک سارتھک (زیادہ بامعنی) ہوتا۔"[4]

جب ہماری ہندی کاویاکرن (قواعد) ایک ہے، دونوں کا سانچہ ایک ہے تب اردو الگ سوتنتر(آزاد) بھاشا (زبان) کیسے کہلاسکتی ہے؟ ہندی اوراردو میں صرف اتنا انتر(فرق) ہے کہ ہندی دیوناگری لپی (رسم الخط) میں لکھی جاتی ہے اوراس میں سنسکرت کے شبد (الفاظ) ادھک (زیادہ) رہتے ہیں اوراردو فارسی لپی میں لکھی جاتی ہے اوراس میں عربی فارسی کے شبدوں کی ادھکتا (کثرت) رہتی ہے۔گجراتی بھاشاکے بھی دوروپ ہیں:ایک پارسیوں کی گجراتی اوردوسراناگری برہمنوں کی گجراتی۔ پارسیوں کی گجراتی میں عربی فارسی کے شبد ادھک رہتے ہیں اور ناگری برہمنوں کی گجراتی میں سنسکرت کے تتسم اورتدبھوشبد۔ پر دونوں روپوں کا نام ایک ہے۔یہی ہندی میں بھی ہوناچاہیے۔ پر دربھاگیہ سے اردوایک الگ زبان قراردی گئی ہے۔ہندومسلمانوں کے جھگڑے کا وہ بھی ایک کارن (وجہ) بنادی گئی ہے۔ ہندی توسروانگ پورن (سراپامکمل) اس دن ہوگی جس دن غالب، ذوق، حالی، داغ، اکبر اوراقبال کوبھی وہ اپناکوی کہنے لگے گی۔[5]

متذکرہ بالاشعرا میں حالی، داغ اور اکبر کا کلام ناگری حروف میں منتقل کیا جاسکتا ہے،لیکن غالب،ذوق اور اقبال کے فارسی آمیز کلام کو ناگری حروف کا جامہ پہنانے کے بعد کیا ہندی کے عام قاری صحیح طورپراس کی قرأت کرپائیں گے؟کسی بھی زبان کے رسم الخط سے اس کی شناخت ہوتی ہے،کیاجسم سے کھال اتر جانے کے بعد آدمی کی شناخت قائم رہ سکے گی؟ اگر پنڈت جی کے مشورے کومان لیاجائے تواردوادب کے ایک بڑے حصّے کوقلم زد کرنا پڑے گااوراردوادب کی بھرپورنمائندگی نہ ہوپائے گی۔ذراغالب کایہ شعرملاحظہ فرمایئے۔

کاو کاوِسخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کالاناہے جوئے شیر کا

یادوسراشعر۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدرچاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

یاڈاکٹرسرمحمداقبال کایہ شعر۔

آں کلیم بے تجلّی آں مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن دربغل دارد کتاب

بجا کہ بول چال کی سطح پرہندی اوراردو زبان میں کوئی فرق نہیں لیکن ادبی سطح پر دونوں زبانوں میں کافی فرق ہے۔اردوزبان کارسم الخط تبدیل کرنے سے اردوزبان کاوجودخطرے میں پڑجائے گااوراس کا سرمایہ اچھی طرح سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔

جیسا کہ متذکرہ بالاسطور میں کہاجاچکا ہے کہ ترپاٹھی جی ہندی کے پرجوش حامی اورہندی ادب کی قدآور شخصیت تھے،انھوں نے تقریباًہرصنفِ ادب میں ہندی زبان وادب کے قابلِ قدرنمونے پیش کیے ہیں۔بقول

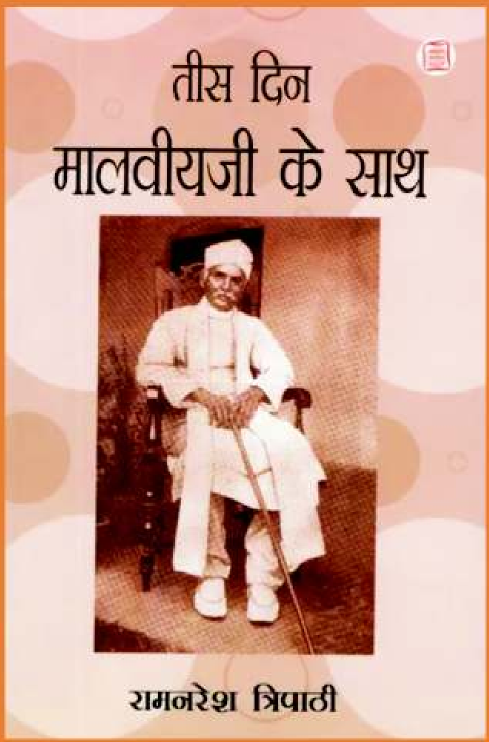

اودھ بیراگی ہندی ساہتیہ کی سبھی ودھاؤں میں انھوں نے نہ کیول لکھا بلکہ ابھنوپریوگ (نت نئے تجربے) بھی کیا ہے۔ان کے بتائے زردیشوں (ہدایات) پرچل کرانیک کویوں،لیکھکوں نے ہندی ساہتیہ کو وپُل سمپدا(بڑی دولت) سے بھرپورکیا۔[6]

علاوہ ازیں پنڈت جی اچھے محقق اورتنقید نگاربھی تھے،ان کی ادبی وتنقیدی بصیرت کا عالم قائل تھا۔انھوں نے اپنی تحقیقی کتاب 'تلسی داس اوران کی کویتا' کے ذریعے گوسوامی تلسی داس کی جائے ولادت کاتعین بھی کیا۔عام طور پرتلسی داس کی جائے پیدائش کولے کر علمائے ادب میں اختلاف پایاجاتا ہے۔ایک گروہ ان کی جائے پیدائش باندہ ضلع کے راجہ پورنامی گاؤں کومانتاہے، دوسراگروہ گونڈہ ضلع کے کسی مقام پراورتیسراگروہ ایٹہ ضلع کاسوکر کا علاقہ تلسی داس کی جائے پیدائش قراردیتا ہے۔ ترپاٹھی جی نے تلسی داس کی جنم بھومی سوروں (ایٹہ) کو بدلائل ثابت کیا ہے اوربطورثبوت تلسی داس کا مندرجہ ذیل دوہاپیش کیا ہے۔

کھیلت اودھ کھوری،گولی بھونراچک ڈوری

لفظ چک ڈور کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ برج اوراس کے قرب و جوار کے اضلاع میں بھونرااورچک ڈورکھیلنے کارواج بہت ہے۔اجودھیا،بنارس یاراجہ پورمیں یہ کھیل نہیں کھیلاجاتاجبکہ سوروں (ایٹہ) میں اس کابڑارواج ہے۔ترپاٹھی جی کاماننا ہے کہ تلسی داس کاجنم ایسے مقام پر ہواتھاجہاں بھونرااورچک ڈوری کھیلنے کابہت رواج تھا۔ رام چرت مانس اورتلسی داس کے بارے میں جتنی رائیں

اب تک موصول ہوئی ہیں ان میں کوی ور رام نریش ترپاٹھی کا نظریہ ابھی نو ہے۔ 7

پنڈت جی نے تقریباً سارے ہندوستان کا دورہ کر کے لوک گیتوں کو جمع کیا۔ ان لوک گیتوں کو اکٹھا کرنے میں انھیں کافی محنت اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کھیتوں میں چھپ کر اور مکانوں کی دیواروں کے پیچھے بیٹھ کر شادی بیاہ اور خوشی کے تہوار وغیرہ کی تقریبات میں گائے جانے والے لوک گیتوں کو قلم بند کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے لوک ادب کے معتدبہ حصے کو برباد ہونے سے بچالیا۔ اگر پنڈت جی نے کچھ بھی نہ لکھا ہوتا تو ان کا یہی کارنامہ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

ترپاٹھی جی نے ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سیر و سیاحت کی ہے اس لیے ان کے کلام میں فطرت کا جو روپ ملتا ہے وہ بڑا ہی ہمہ گیر و متنوع ہے، بھارتیندو کے عہد سے حبّ الوطنی کا جو جذبہ چلا آتا ہے اسے ذات پات کے بجائے وطن کی پہنائیوں میں عام کرنا ترپاٹھی جی کا کام تھا، ان کے لیے وطن کا لفظ پوری وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ آتا ہے۔ 8

ترپاٹھی جی نے کویتا کومدی حصہ چہارم ص 229 میں اردو شاعری کی عہد بہ عہد تاریخ بزبانِ ہندی رقم کی ہے جسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اس کتاب کی تیاری میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

1 اردو ساہتیہ کا اتہاس، دو حصے، مصنفہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ناشر ہندوستانی اکادمی الہ آباد۔

2 شعر و شاعری و شعر و سخن آدی۔ مصنفہ شری ایودھیا پرشاد گولیہ، ناشر بھارتیہ گیان پیٹھ، کاشی۔

3 اردو شاعری، مصنفہ شری نارائن پرشاد جین، ناشر ہندی گرنتھ رتناکر کاریالیہ، بمبئی۔

4 اردو کے کوی اور ان کا کاویہ، لیکھک پنڈت گرجادت شکل گریش ناشر پستک بھنڈار، بنارس

5 اردو کاویہ کی ایک نئی دھارا، لیکھک اوپیندر ناتھ اشک، ناشر ہندوستانی اکادمی الہ آباد

علاوہ بریں انھوں نے تاریخ ادب اردو کے متعلق متعدد کتابوں کا مطالعہ بھی کیا لیکن وہ مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات سے زیادہ متاثر ہوئے۔

ترپاٹھی جی نے ہندی زبان میں اردو شاعری کی تاریخ سپردِ قلم کر کے ہندی ادب کے پریمیوں کے روبرو پیش کیا۔ اس طرح بلاواسطہ طور پر انھوں نے اردو شاعری سے ہندی کے عام قارئین کو روشناس کرایا۔ پنڈت جی اردو عہد میں پیدا ہوئے، اردو کی انگلی پکڑ کر انھوں نے ادب کی خدمت کرنا سیکھا لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں خود کو انھوں نے ہندی زبان وادب کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ شاید ان کی دور بیں نگاہوں نے آزادی کے بعد اردو کے تاریک مستقبل کو دیکھ لیا تھا، اسی لیے انھوں نے اردو سے منہ موڑ کر اپنی ساری توانائی ہندی ادب کی تخلیق میں صرف کردی اور کئی قابلِ ذکر تخلیقات ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں جن میں ملن پتھک، سوپن، جیسی مایۂ ناز شعری تخلیقات شامل ہیں، علاوہ ازیں انھوں نے فکشن، تنقید و تحقیق، بچوں کا ادب، سوانح، فلکیات اور لوک ادب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور کئی شاہکار تخلیقات کے ذریعے ہندی ادب کے سرمایے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ راقم الحروف کی دانست میں دنیائے ادب میں ان کا ہمسر کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اگر ترپاٹھی جی نے کویتا کومدی حصہ چہارم کو اردو زبان کا جامہ پہنایا ہوتا تو اس کتاب کی بھی اردو حلقوں میں خوب خوب پذیرائی ہوئی ہوتی، مگر ترپاٹھی جی ہندی کے اتنے پر جوش حامی تھے کہ رفتہ رفتہ اردو زبان کی تصنیف وتالیف سے دست کش ہو گئے۔

اس کتاب میں ترپاٹھی جی نے اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دَور کے مخصوص شعرا ولی، آرزو، ناجی، یک رنگ، حاتم، آبرو، اور فغاں، دوسرے دَور کے خاص شعرا جانِ جاناں، سودا، سوز، درد، اور میر ہیں۔ اس دَور میں بہت سے قدیم الفاظ نکال دیے گئے اور بہت سے نئے بھرتی کر لیے گئے۔ تیسرے دَور کے مخصوص شعرا جرأت، حسن، انشا، مومن، ذوق، غالب، امیر، انیس، دبیر، داغ اور آسی ہیں۔ اس عہد میں زبان پہلے کی بہ نسبت زیادہ آراستہ ہوگئی ہے۔ پانچویں دَور کے شعرا میں حالی، اکبر، اقبال اور چکبست وغیرہ شامل ہیں۔ اس عہد کی زبان پہلے کی بہ نسبت زیادہ معنی خیز اور بامحاورہ ہوگئی ہے۔

اس کتاب میں چار مختلف اصنافِ سخن کو متعارف کرایا ہے جن میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، مثلث، مخمس، مسدس وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں ساٹھ اردو شعرا کا مختصر تعارف اور ان کے فکر وفن پر پرمغز تبصرہ اور منتخب اشعار پیش کیے گئے ہیں جن میں شاہ عالم، نواب آصف الدولہ آصف، نواب وزیر علی خاں وزیر، بہادر شاہ ظفر، نواب واجد علی شاہ اختر، امیر خسرو، ولی، آبرو، آرزو، حاتم، مجنوں، جانِ جاناں، میاں چرکیں، جعفر زٹلی، میر، درد، سوز، میر حسن، انشا، جرأت، مصحفی، نظیر، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، مومن، انیس، دبیر، نسیم، امیر مینائی، داغ، آسی، شیفتہ وغیرہ شامل ہیں۔

شاہ عالم کا تعارف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

شاہ عالم دلّی کے بادشاہ تھے، رات دن آپس کی لڑائی جھگڑے اور سلطنت چھن جانے کے ڈر سے پریشان رہتے تھے۔ 1733 میں ایک روہیلہ نے دیوانِ خاص میں چھاتی پر چڑھ کر آپ کی آنکھیں نکال لی تھیں، آپ نے سارا جیون (زندگی) تکلیف میں کاٹا۔ شاعری کا شوق آپ کو بھی تھا، آفتاب تخلص تھا، آپ فرماتے ہیں۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے
شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

کویتا کومدی 9

نواب واجد علی شاہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

نواب واجد علی شاہ لکھنؤ کے آخری نواب تھے۔ 1847 میں بیس برس کی عمر میں گدّی پر بیٹھے۔ ان کا دربار رنڈیوں، بھانڈوں بھڑوؤں، مسخروں، گویّوں اور شاعروں سے بھرا رہتا تھا، انگریزوں نے انھیں 31 جنوری 1856 کو قید کر کے کلکتے بھیج دیا۔ یہ شاعری بھی کرتے تھے۔ اختر تخلص تھا، 40 کے قریب ان کے دیوان ہیں۔ لکھنؤ سے جاتے جاتے یہ آہ نکلی تھی۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
نہیں چاہیے قصرِ فردوس زاہد
مجھے ہے فقط کوئے جاناں سے مطلب 10

اردو شاعری کا ہندوؤں پر بھی غیر معمولی اثر پڑا۔ اس ضمن میں ترپاٹھی لکھتے ہیں:

اردو شاعری کا ہندوؤں پر بھی ایسا پربھاؤ (اثر) پڑا کہ شاعروں میں اکرام پانے کے لیے وہ بھی چتا کو چھوڑ کر قبر میں جانے لگے اور اپنے چاروں دھام چھوڑ کر کعبہ کو سجدہ کرنے لگے۔ نسیم ہندو شاعر تھے، وہ کہتے ہیں۔

بتوں کو چھوڑ کر کون جائے
یہیں سے کعبے کو سجدہ ہمارا

چکبست کشمیری برہمن تھے وہ بھی چتا کو بھول کر قبر کو یاد کرتے تھے۔

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا، قبر کو آباد کیا

ہندو شاعر وایشور تک کو بھول گئے اور خدا اور اللہ کو رٹنے لگے۔ چکبست کہتے ہیں۔

ترپاٹھی جی نے ہندی زبان میں اردو شاعری کی تاریخ سپردِ قلم کرکے ہندی ادب کے پریمیوں کے روبرو پیش کیا، اس طرح بلاواسطہ طور پر انھوں نے اردو شاعری سے ہندی کے عام قارئین کو روشناس کرایا، پنڈت جی اردو عہد میں پیدا ہوئے، اردو کی انگلی پکڑ کر انھوں نے ادب کی خدمت کرنا سیکھا لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں خود کو انھوں نے ہندی زبان وادب کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔

مجھ سے روشن اِن دنوں دیر وحرم کا نام ہے
پائے بُت پر ہے جبیں، لب پر خدا کا نام ہے

اِن ہی کا ایک شعر اور۔

پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرامیں
اگر نہائے تو اپنی لہو کی گنگامی ں

بسمل الہ آبادی بھی ہندوشاعر ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

دیر میں پڑھتے ہیں پانچوں وقت کی بسمل نماز
ایسا ہندو دیکھیے، ایسا مسلماں دیکھیے [11]

ترپاٹھی جی نے مرثیے کی معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ مرثیے کا تعارف وہ اِن الفاظ میں کراتے ہیں:

مرثیہ شوک گیت کو کہتے ہیں پرایا بھی مرثیوں میں حسن حسین کا شوک پرد برتانت کہا گیا ہے۔ لکھنؤ میں انیس اور دبیر کے مرثیے بہت پرسدھ ہیں۔ مرثیے کی بنیاد پہلے پہل دکنی ہندی میں پڑی پر لکھنؤ آکر وہ سرو رنگ پورن ہوا۔

ایک جگہ حالی اور اکبر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظیر، انیس اور دبیر کے بعد حالی اور اکبر یہی دو شاعر ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے شاعری میں نئے موڑ لیے، حالی نے تو عاشقانہ شاعری کے وِرودھ ایک نیا ہی راستہ نکالا اور ان کی منزل بھی وہی ختم کر گئے۔ حالی اور اکبر عشقیہ شاعری کو جھک جھوڑ کر جگا دیا۔ [12]

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے فکروفن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

فراق صاحب آزاد خیال انسان ہیں، عہدِ شباب میں ملک کی پکار پر انھوں نے بہت بڑا ایثار پیش کیا، گورنر نے آئی سی ایس میں ان کو نامزد کر دیا تھا پر انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور مہاتما گاندھی کے سہیوگ اندولن میں انھوں نے بڑے ساہس سے بھاگ لیا، اور 1921 میں جیل چلے گئے۔ جیل میں اس پستک کا لیکھک ان کے ساتھ تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد یہ کرشچین کالج لکھنؤ میں ادھیاپک نیوکت ہوئے، اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں آ گئے۔ فراق بڑے زندہ دل شاعر ہیں، ان کی شاعری میں امیر مینائی، حسرت، اصغر اور اقبال کی شاعری کا لطف آتا ہے۔ یدّپ حسن اور عشق کا دامن انھوں نے نہیں چھوڑا پر نئے نئے بھارتیہ وِشے بھی بہت لیے اور اُن پر چبھتے ہوئے وِچار بھی باندھے۔

یہاں فراق کی شاعری کے کچھ نمونے دیے جاتے ہیں۔

تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے، اے کاش
تجھے دنیا کو بدل دینے کا عرفاں ہوتا
نہ سمجھنے کی ہیں باتیں نہ یہ سمجھانے کی
زندگی اجڑی ہوئی نیند ہے دیوانے کی [13]

ترپاٹھی جی اگرچہ ہندی کے پرجوش حامی تھے لیکن انھوں نے اردو کی خوبیوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اردو کے کوی محاوروں میں ہی باتیں کہتے ہیں۔ محاوروں کو لے کر اردو شاعروں میں کافی بحث پیڑھیوں تک چلتی رہی، جھگڑے ہوئے، کتابیں لکھی گئیں، کھوج کھوج کر محاورے جمع کیے گئے... وہ استعمال میں لائے گئے اور اردو کی شاعری کی بھاشا (زبان) محاوروں سے جگمگا اٹھی۔ اردو کے شاعر سماج کے اندر ہی رہے، انھوں نے سماج کو وہی باتیں دیں جن کو ان کے سمے کا سماج چاہتا تھا۔ ہندی کویوں نے انترکش (خلا) کو اپنا ابھیسار استھان بنالیا جو کسی کو دکھائی نہیں پڑتا اور نہ جہاں تک کسی شروتا (سامع) کی پہنچ ہی ہوتی ہے، یہی کارن ہے کہ اردو شاعروں کے جتنے شعر لوگوں کی زبان پر ہیں ان کا شتانک (عشر عشیر) بھی ہندی کویوں کی پنکتیاں (مصرعے) کسی کو یاد نہیں۔ [14]

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہندوستانی زبانوں کے شعرا اور ادبا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے، انھوں نے باہم ایک دوسرے سے اثر قبول کیا۔ ترپاٹھی جی ہندی کویوں کو پرخلوص مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

شاعروں کا جھکاؤ اب ہندی کی اور ہو رہا ہے، ہندی کویوں کو بھی آگے بڑھ کر انھیں گلے لگانا چاہیے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے لابھ اٹھا سکیں۔'' [15]

اردو نثر کے ارتقا پر اظہار خیال کرتے ہوئے ترپاٹھی جی کہتے ہیں:

شروع شروع میں مسلمانوں میں اردو شاعری کی لوک پریتا بڑھی جس کا ادگم استھان (جائے ولادت) دکھن تھا۔ اسی طرح اردو گدیہ کی شروعات بھی پہلے پہل دکھنی ہندی ہی سے ہوئی، یدّپ ان ہی دنوں اتر بھارت میں بھی اردو گدّیہ کا وِکاس ہونے لگا تھا۔ اردو گدّیہ کو سب سے بڑا سہارا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ملا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرمچاریوں کو شاسن کے کام میں سوِدھا لانے کے لیے دیسی بھاشاؤں کا جاننا بہت ضروری سمجھ کر 1803 میں اُوکت کالج کا ایک وبھاگ (شعبہ) کھولا گیا تھا جس کے سنیوجک گلکرسٹ صاحب تھے جو سوئم کئی بھاشاؤں کے اچھے جانکار تھے۔ اس محکمے کے دوارا ڈاکٹر گلکرسٹ کی دیکھ ریکھ میں جو پرسدھ ہندوستانی لیکھک داں نیوکت ہو گئے تھے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

میر امن، افسوس، حسینی، لطف، حیدری، جوان، للولال جی، نہال چند، اکرام علی وِلا، سید محمد منیر، شیر علی افسوس اور مداری لال گجراتی، صدل مصر، اتیادی (وغیرہ) [16]

اگر ترپاٹھی جی نے کویتا کومدی کو فارسی رسم الخط میں منتقل کیا ہوتا تو ان کا شمار بھی اردو کے اوّلین مورخوں میں ہوتا اور اردو دنیا میں ان کا نام بھی ادب واحترام کے ساتھ لیا جاتا۔

حواشی

1 مشاعرہ، زنداں، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ص 28-27
2 ایضاً ص 30
3 کویتا کومدی چوتھا بھاگ اردو ص 111
4 ایضاً ص 28
5 ایضاً ص 30-29
6 راشٹریہ سہارا لکھنؤ 13 جنوری 1999، ص 7
7 ایضاً ص 7
8 ہندی ادب کی تاریخ، از ڈاکٹر محمد حسن ص 229
9 کویتا کومدی چوتھا بھاگ اردو ص 80
10 ایضاً ص 8384.
11 ایضاً ص 50
12 ایضاً ص 9
13 ایضاً ص 526-525
14 ایضاً ص 110
15 ایضاً ص 110
16 ایضاً ص 111

■

Niyaz Sultanpuri
Bhatti Jarauli, Post: Kataun
Distt.: Sultanpur- 227408 (UP)
Mob.: 8756228058

تسلیم عارف

مظفر حنفی کی خودنوشت

'شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے رات'

مظفر حنفی کو عمومی طور پر ایک شاعر بالخصوص غزل گو کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور شاعری کے سلسلے سے ایک کلیات کے علاوہ ان کی 16 کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے نثری سرمائے میں تحقیق و تنقید سے متعلق 19 کتابیں، ترتیب و تدوین سے متعلق تقریباً 15 کتابیں، چار افسانوی مجموعے اور ایک درجن کے قریب تراجم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک عدد سفر نامہ اور ایک مختصر خودنوشت بھی ان کے نثری سرمائے میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس طرح بلا مبالغہ اس بات کا اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ مظفر حنفی بہ یک وقت نظم و نثر دونوں کی مختلف اصناف پر اچھی قدرت رکھتے تھے۔ ان کے وسیع نثری سرمائے کی ورق گردانی ہی کوئی جوئے شیر لانے سے کم نہیں چہ جائے کہ ان کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا جائے۔ لہٰذا اِس مضمون میں میری گفتگو صرف مظفر حنفی کی خودنوشت 'شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت' تک ہی مرکوز رہے گی۔

میں نے اس خودنوشت کو اس لیے بھی گفتگو کا موضوع بنایا ہے کہ اس کے ذریعے ہم مظفر حنفی کی زندگی کے سفر میں ان کے ہم راہ چلتے چلے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کے 80 برسوں کی داستان کو ان کی زبان میں سُن کر اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس خودنوشت میں ہم مظفر حنفی کو ان کی پوری زندگی سے ذرا دور رہ کر اُس کا تجزیہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کرداروں اور کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ ایک سادہ، سلیس اور رواں زبان سے اس خودنوشت کا نگار خانہ تیار ہوتا ہے اور قاری اس سے خود کو بڑی جلدی جوڑ لیتا ہے۔ مظفر حنفی نے اپنے ایک شعر کے مصرعۂ اولیٰ سے اس خودنوشت کا عنوان قائم کیا ہے جو اس تحریر کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم اس خودنوشت کی روانی کو دیکھتے ہوئے شیشۂ ساعت کی سر دُھنتی ہوئی ریت کا تصور کرتے ہیں تو مظفر حنفی کے حسنِ انتخاب پر رشک آتا ہے۔ خودنوشت کے آخری حصے میں یہ شعر استعمال کیا گیا ہے اور اُس مقام پر اس عنوان کی معنویت مزید مُبرہن ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

خودنوشت 'شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت' کی اشاعت پہلی مرتبہ بزمِ صدف انٹرنیشنل کے بین الاقوامی رسالۂ 'صدف' کے جون 2016 کے شمارے میں ہوئی۔ رسالے میں یہ خودنوشت صفحہ 24 سے لے کر 37 تک پھیلی ہوئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی اشاعت علاحدہ سے عمل میں آئے گی تو اس کے صفحات تقریباً پچاس سے پچپن تک پہنچ جائیں گے۔ اس خودنوشت کی ابتدا مظفر حنفی اپنے خاندانی پس منظر کے بیان سے کرتے ہیں اور جس اختصار اور روانی کا مظاہرہ وہ ابتدائی سطور میں کرتے ہیں، اسے ہی پوری خودنوشت میں برقرار رکھتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ فطری طور پر کسی انسان کی زندگی کے کچھ واقعات اس کے دل کے قریب ہوتے ہیں اور کچھ سے اسے بے حد تکلیف اور کوفت ہوتی ہے، ایسے میں جب ان واقعات

'شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت' ایک مکمل کہانی کی صورت میں پیش تو کی گئی ہے لیکن موٹے طور پر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں پیدائش سے لے کر مڈل اور ہائی اسکول تک کے واقعات ہیں جو تقریباً سات سوا سات صفحات تک پھیلے ہیں۔ دوسرے حصے میں ملازمت کی کوششیں، ملازمت، گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی، رشتۂ ازدواج، ادبی و تعلیمی سرگرمیاں، مختلف جامعات میں بہ طور استاد مظفر حنفی کے تجربات، اپنے شعبے کے دیگر اساتذہ سے اختلافات جیسی دیگر چیزیں سمیٹ دی گئی ہیں۔

کے تعلق سے وہ اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے تو فطری طور پر کچھ واقعات میں اختصار اور کچھ میں طوالت کا پہلو غالب آ جاتا ہے لیکن مظفر حنفی کی پوری خودنوشت پڑھ جائیے، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی واقعے کی پیش کش میں انھوں نے طول بیانی کا مظاہرہ کیا ہے یا کچھ واقعات کو مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ پوری خودنوشت میں واقعات کی پیش کش میں ایک بہترین توازن نظر آتا ہے جس سے شروع سے آخر تک ایک ہی رفتار سے ان کی خودنوشت اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اسی سبب سے قاری بیان کے اس جادو میں از اول تا آخر ہمہ تن محو رہتا ہے۔

واقعات کے بیان میں اجمال واختصار اور رواں اور سلیس اندازِ بیان اس خودنوشت کے بنیادی اوصاف ہیں۔ اسی برس کی پختہ عمری اور شعری اور نثری تحریروں میں اچھی خاصی مشق کا شعور حاصل ہونے کے بعد اس تحریر کا نزول ہوا ہے۔ اپنے پچھلے تجربات سے مظفر حنفی نے یہاں خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا ہے۔ 'شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت' کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مظفر حنفی واحد متکلم کے صیغے میں ایک طویل افسانہ بیان کر رہے ہیں جس کے مرکزی کردار وہ خود ہیں اور باقی کردار کچھ وقت کے لیے ان کی کہانی کا حصہ بنتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھانے کا کام کرتے ہیں۔ حالی نے 'یادگارِ غالب' میں غالب کی زندگی کے منتخب واقعات پیش کیے تھے جس سے اختصار کے باوجود غالب کی زندگی آئینہ ہو جاتی ہے۔ مظفر حنفی نے بھی اپنی خودنوشت میں اختصار کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً تمام اہم واقعات کو اس خودنوشت میں جگہ دے دی ہے۔ لہٰذا کسی واقعے کی تفصیل یا وضاحت کی جانب انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ جس طرح کوئی شاعر شعر پیش کر کے اس کے معنی و مفاہیم تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے، مظفر حنفی اس خودنوشت کے ذریعے ہمیں ان کی زندگی میں صرف جھانکنے کی اجازت دیتے ہیں اور اسی سے واقعات و حادثات کو تفصیلی طور پر سمجھنے کا قاری سے مطالبہ کرتے ہیں۔

اس خودنوشت میں مظفر حنفی نے کچھ مختصر خاکے بھی پیش کیے ہیں جو اُن کے حلقۂ احباب سے ہمارا تعارف کراتے ہیں۔ والدِ بزرگ وار جنھیں وہ 'چچا میاں' کہا کرتے تھے، ان کا ذکر انھوں نے یہاں کافی جی لگا کر کیا ہے۔ ان کے والد کافی رکھ رکھاو اور ٹھسے سے رہتے اور ایک خاندانی زمین دار مزاج کے کردار تھے، ان کا مختصر خاکا خودنوشت میں یوں کھینچا گیا ہے:

''چچا میاں کافی ٹھسے کے آدمی تھے۔ موروثی زمین داری ڈوب چکی تھی لیکن خو باقی تھی۔ سلیقے اور رکھ رکھاو سے رہتے تھے۔ اِستری ٹوٹی نہیں کہ کپڑے نا قابلِ استعمال ہو جاتے تھے۔ قمیض، پائجامہ، لمبی شیروانی اور تُرکی ٹوپی پہنتے تھے۔ پاجامے میں گھٹنا نکلا کہ دھوبی کے یہاں گیا۔ دوسرے کپڑے تو کجا، شیروانی میں بھی کہیں چھوٹا سا سوراخ ہو جاتا تو وطن کے پُرجوں میں بانٹنے کے لیے اُتار دی جاتی۔ بُوٹ جوتے ہمیشہ چمچماتے رہتے اور تُرکی ٹوپی ہر دو تین سال میں بدل دی جاتی۔''

(شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت)

والدہ جنھیں وہ ''آپا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''گھر میں آپا کی شخصیت بڑی دل چسپ تھی۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، صوم وصلوٰۃ کی پابند بہت سادہ لوح بی بی تھیں۔ خود بیس کے آگے گنتی نہیں گن سکتی تھیں لیکن بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ مستعد واقع ہوئی تھیں۔ ہم سب کو ٹوٹ کر چاہتی تھیں لیکن پڑھائی کے سلسلے میں جم کر سختی کرتی تھیں۔'' (شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت)

ہر چند کہ اختصار اس خودنوشت کی خوبی ہے لیکن کہیں کہیں اس کی وجہ سے بہت سی ضروری اور دل چسپ باتیں تشنہ رہ جاتی ہیں۔ انھی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کس وجہ سے انھوں نے اپنے والدین کو 'چچا میاں' اور 'آپا' کہنا شروع کیا یا کولکاتا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ سے ان کی رَسا کشی کے اسباب و وسائل کیا تھے؟ مظفر حنفی ان کے خلاف سپریم کورٹ تک کیسے پہنچے؟ وغیرہ وغیرہ؛ یہ اور ان جیسی دیگر تفصیلات سے یہ خودنوشت قدرے بہتر ہو سکتی تھی۔

'شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت' ایک مکمل کہانی کی صورت میں پیش تو کی گئی ہے لیکن موٹے طور پر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں پیدائش سے لے کر مِڈل اور ہائی اسکول تک کے واقعات ہیں جو تقریباً سات سوا سات صفحات تک پھیلے ہیں۔ دوسرے حصے میں ملازمت کی کوششیں، ملازمت، گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی، رشتۂ ازدواج، ادبی و تعلیمی سرگرمیاں، مختلف جامعات میں بہ طور استاد مظفر حنفی کے تجربات، اپنے شعبے کے دیگر اساتذہ سے اختلافات جیسی دیگر چیزیں سمیٹ دی گئی ہیں۔ دونوں حصے کافی دل چسپ ہیں۔ ایک تیسرا حصہ بھی اس خودنوشت میں شامل ہے جسے 'کچھ باتیں اور...'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے جسے اس خودنوشت کے آخر میں ضمیمے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ڈیڑھ صفحات میں مظفر حنفی کی ادبی فتوحات، ایوارڈس، مختلف اداروں سے وابستگی اور کتابوں کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ خودنوشت کے کچھ مقامات پر حوالے کے طور پر اس حصے سے رجوع کرنے کی بات کی گئی ہے۔ اس سے مصنف کو یہ سہولت ہوئی کہ وہ ایک سلسلے سے بغیر کسی رُکاوٹ کے اپنی خودنوشت کے بہاو کو جاری رکھ سکے اور قاری کو اپنی گرفت سے آزاد نہ ہونے دے۔

مظفر حنفی این سی ای آر ٹی اور دیگر جامعات سے بھی منسلک رہے ہیں اور اُن تجربات کو بھی اس خودنوشت کا حصہ بنایا ہے۔ درس و تدریس اور پڑھنے لکھنے سے انھیں کس قدر لگاو تھا اس کا اندازہ ان کے اس واقعے سے ہوتا ہے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لکچرر شپ کے انٹرویو کے دوران آلِ احمد سرور نے ان سے یہ سوال کیا:

''تم تو لکچرر کے اسکیل پر کام کر ہی رہے ہو۔ این سی ای آر ٹی نے کار اور فلیٹ بھی دے رکھا ہے، پھر جامعہ کیوں آنا چاہتے ہو؟

عرض کیا: دفتری کام تو میں محکمۂ جنگلات میں چودہ برس کر آیا ہوں، تمنا ہے کہ یک سوئی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کا موقع ملے۔'' (شیشۂ ساعت میں سر دُھنتی ہے ریت)

انھوں نے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے جامعات اور ان کے تعلیمی معیار کے سلسلے سے اپنی خودنوشت میں کچھ اشارے کیے ہیں جن پر توجہ ضروری ہے۔ کولکاتا یونی ورسٹی میں اقبال چیئر کے لیے بہ طور پروفیسر جب ان کا تقرر ہوا تو اس سلسلے سے واقعات نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''جب میں نے شعبے میں قدم رکھا تو فضا بہت خراب تھی۔ کل پانچ اساتذہ تھے۔ ایم اے (اردو) میں صرف پچیس طلبہ کو داخلہ ملتا تھا، مہینوں کوئی کلاس نہیں ہوتی تھی۔ اساتذہ کہتے تھے طلبہ کلاس میں نہیں آتے، کیسے پڑھانے جائیں؟ طالب علموں کا رونا تھا کہ دن بھر کمرے میں بیٹھ کر واپس چلے آتے ہیں، کوئی استاد کلاس لینے کی زحمت نہیں کرتا۔ ایم اے اور بی اے کا نصاب آزادی کے بعد سے وہی پرانا چلا آ رہا تھا اور دوسری دانش گاہوں کے مقابلے میں معیار بے حد پست تھا۔ اساتذہ میں ٹیوشن کی لعنت عام ہو گئی تھی۔ امتحانات کے پرچے تیار کرنے سے لے کر کاپیاں جانچنے اور نتائج تیار کرنے کا سارا کام مقامی اساتذہ نے اپنی حد تک سمیٹ رکھا تھا۔ امتحانات تین سال پچھڑے ہوئے تھے اور امتحان ہال میں نقل کھلے ڈلے کی جاتی تھی۔ عموماً امیدواروں کا ممتحنین پر اعتماد متزلزل تھا۔ پی ایچ۔ ڈی کے لیے رجسٹریشن بہت

سطحی اور بسا اوقات ایسے فضول موضوع پر ہو جاتا تھا جن پر اخبار میں ایک آدھ مضمون لکھ دینا کافی ہوتا ہے۔ استاد شاگرد کے مابین ہم آہنگی اور پُرخلوص رشتوں کا فقدان تھا۔‘‘

(شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

حالانکہ مظفر حنفی نے اپنی استطاعت کے مطابق حالات کو بہت بہتر بنایا لیکن ایسے مقامات جہاں ان جیسے افراد نہ پہنچے ہوں وہاں کی حالت کس معیار کی ہوگی، یہ سوچ کر وحشت ہوتی ہے۔ مَیں ذاتی طور پر ایسی چند جامعات کا مشاہدہ کر چکا ہوں جہاں ایم اے کے طالب علم اردو ادب کی بنیادی باتوں کو چھوڑ دیجیے، خود اپنا نام صحیح املا کے ساتھ اردو میں نہیں لکھ سکتے اور اساتذہ درس و تدریس کے علاوہ دیگر تمام سرگرمیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی اصلاح کی غرض سے کھڑا ہو اور درس و تدریس، تصنیف و تالیف کے سلسلے سے کام کرے تو باقیوں کے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے اور وہ اس کی ٹانگ کھینچنے میں جس اجتماعیت اور تن دہی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یونی ورسٹی کو بھی نہ معیارِ تعلیم سے غرض ہے اور نہ طلبہ کی علمی لیاقت بڑھانے میں کوئی دل چسپی۔ ایسے میں مظفر حنفی جیسی شخصیات سے روشنی حاصل کر کے ایسے مقامات پر کام کرنے کا ایک حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم کی بات چل نکلی ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس خودنوشت سے پتا چلتا ہے کہ مَولویوں کے رویے اور مدرسوں کے طریقۂ تعلیم سے مظفر حنفی خاصے نالاں ہیں۔ ہمارے مدرسوں کا نظام زمانۂ قدیم سے ایسا چلا آرہا ہے کہ اس میں تجدید کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بچوں کو جس طرح پٹائی اور خوف و دہشت کے ماحول میں تعلیم دینے کا رواج ہے، اسے تبدیل کرنے کی طرف بھی ہمارے علمائے کرام کو توجہ دینی چاہیے۔ مظفر حنفی اپنی ابتدائی تعلیم کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’مجھے اسکول کے علاوہ عربی پڑھنے ایک مکتب بھی جانا پڑتا تھا علاوہ ازیں مجھے گھر پر وہی مولوی صاحب عربی پڑھاتے تھے اور ذہنی طور پر ایک آدھ چوُل ڈھیلی رکھتے تھے۔ صبح سات بجے سے نو-دس بجے تک اور شام کو پانچ بجے سے سات بجے تک ان کی خدمت میں حاضر رہ کر توتے کی طرح مختلف دعائیں رٹتا اور قرآن مجید پڑھتا۔ ان بزرگ نے مار مار کر ابتدائی دو تین پاروں کا حافظ بھی بنا دیا... شاید اس مکتب کی سختیوں کا اثر ہے کہ ثوابِ طاعت و زہد کا علم ہونے کے باوجود رسمی عبادتوں کے سلسلے میں میری دل چسپی واجبی واجبی سی رہ گئی۔‘‘

(شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

بھلے ہی مظفر حنفی یہاں ہمیں اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنا رہے ہیں لیکن اس سے جو مسئلہ ابھر کر سامنے آرہا ہے، وہ کافی سنگین ہے۔ مذہبی تعلیم کا ایسا طریقہ جس سے انسان مذہب بے زار ہو جائے، کہاں تک قابلِ قبول ہے۔ دنیاوی تعلیم میں نئے نئے طریقے ایجاد کیے جا رہے ہیں کہ بچے متعلقہ مضامین کو دل چسپی سے پڑھیں اور ہمارے مدارس لکیر کے فقیر بن کر اس جانب توجہ دینے سے مستغنی ہیں۔

حالانکہ اس تحریر میں مظفر حنفی کئی سنجیدہ موضوعات کی جانب اشارے کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھوں نے اپنی تحریر کو بوجھل پن سے دوُر رکھنے میں کامیابی پائی ہے اور کہیں کہیں تو واقعات کے بیان میں اپنے اسلوب سے مِزاح بھی پیدا کیا ہے جس سے تحریر میں سنجیدگی کے باوجود خشکی کا پہلو نہیں آتا۔ وہ اپنے ایک استاد جن کے بہ قول مظفر حنفی ’ایک آدھ چوُل ڈھیلی‘ تھی، کا ایک واقعہ یوں نقل فرماتے ہیں:

’’کبھی کبھار کڑاکے کی سردی میں مولوی صاحب کی رگِ تدریس پھڑکتی تو رات کے گیارہ بجے گھر پر نازل ہو جاتے، مجھے بیدار کر کے مردانے میں ہانک دیا جاتا۔ جہاں حسبِ فرمائش سی پارے قرآت کے ساتھ بہ آوازِ بلند سنانے پڑتے۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

حالانکہ یہ واقعہ مظفر صاحب کی زندگی کے تکلیف دہ لمحات میں سے ایک ہے لیکن اس کے باوجود اس مولوی صاحب کی تدریس کے اس عجیب و غریب انداز اور دیوانے پن کو جان کر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ہسوہ مڈل اسکول کے تعلق سے اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ہسوہ مڈل اسکول میں میرے قریب ترین دوست شریف الحسن عرف مچھن تھے۔ موصوف کی چگی داڑھی برامد ہو چکی تھی جسے وہ باقاعدگی سے پال رہے تھے۔ وہ اسکول میں سب سے بڑے تھے اور میں سب سے چھوٹا۔ تتلاتے نہیں ٹھلاتے تھے یعنی تے کی جگہ ٹے بولتے تھے... مولوی شبراتی مجھے میاں چیں پٹاخ اور مچھن بھائی کو مولی صاب کہتے تھے، اسی طرح تمام طلبہ کے انھوں نے بڑے دل چسپ نام رکھ چھوڑے تھے۔‘‘

(شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

اسکول میں ہی اپنی شاعری کی ابتدائی کوششوں کے سلسلے سے تحریر فرماتے ہیں:

’’ہم سے نہ صرف اشعار کی تقطیع کرائی جاتی بلکہ کبھی کبھار مصرعِ طرح دے کر اُن پر ڈنڈے کے زور سے طبع آزمائی کے لیے مجبور کیا جاتا۔ دوسری عالم گیر جنگ ختم ہوئی تو ہمارے سامنے مصرعِ طرح تھا:

’’سمندر میں گرے گا خون کا دریا رواں ہو کر‘‘

میں نے اونے پونے چند شعر کہے تھے جس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے، عرض کرتا ہوں ۔

جوانی کی دعا بچوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی بچے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر

یاد رہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس پر برسرِ مشاعرہ (کلاس روم) میری خوب مرمت کی گئی تھی کہ اکبر الٰہ آبادی نام کے جج کے یہاں سے سرقے کا جرم مجھ سے سرزد ہو گیا تھا۔‘‘

(شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

اس خودنوشت میں مظفر حنفی اپنی صاف گوئی اور بے باکی کا بڑے شد و مد سے تذکرہ فرماتے ہیں اور مختلف مقامات پر اپنی اس خوبی کو افتخار کے طور پر بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ اہلِ کولکاتا سے انھیں جو محبت ملی، اسے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’کلکتہ کے عوام اور خواص نے صحیح معنوں میں مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا... وہاں بارہ سال قیام کے دوران اردو کا کوئی جلسہ، مشاعرہ یا تقریب ایسی نہیں ہوئی جس میں مجھے بہ طور صدر یا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو نہ کیا گیا ہو۔ میری بے لوث صدق بیانی کا کسی نے وہاں بُرا نہیں مانا حالاں کہ میں برسرِ جلسہ اور مشاعروں کے اسٹیج پر لوگوں کو ان کی فنی اغلاط اور تلفظ کی کمزوریوں پر ٹوک دیا کرتا تھا۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تجربات رقم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

’’جامعہ میں اپنی باقاعدگی، اصول پسندی، خودداری اور بے لوثی کے لیے طلبہ اور اساتذہ میں مشہور ہوا۔‘‘

(شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

اس صاف گوئی، حق پرستی اور کج کلاہی کی قیمت بھی انھیں ادا کرنی پڑی۔ کولکاتا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں کام کرنے کے تجربات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

’’1984 میں ریڈر بھی ہو گیا لیکن رفتہ رفتہ ہاں میں ہاں نہ ملانے، صاحبانِ اقتدار کے یہاں حاضری نہ دینے اور اپنی بے باک صدق بیانی کی وجہ سے غیبتوں اور منافقتوں کا شکار ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ جامعہ کے ساتھ سپریم کورٹ تک مقدمہ بھی لڑنا پڑا۔‘‘

(شیشۂ ساعت میں سرد ھنتی ہے ریت)

خودنوشت کے اختتام پر ’کچھ باتیں اور...‘ کے تحت پہلی بات اسی موضوع پر کہی گئی ہے:

> **کسی ادبی یا سیاسی گروہ سے بہ راہِ راست وابستگی نہیں ہے اس لیے ہر گروہ مجھے اپنے مخالف گروپ کا آدمی سمجھتا ہے۔ جدیدیت سے منسلک کیا جاتا ہوں لیکن میری تخلیقات میں بھتوں سے زیادہ حقیقی ترقی پسندانہ عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ تخلیق کے ساتھ پیشہ ورانہ تقاضوں کے تحت تنقید سے بھی دل چسپی تھی اور اسی کے ساتھ صاف گوئی کریلے کی طرح نیم چڑھ گئی چنا ں چہ کئی بڑے نقادوں کی تخلیقی بے بضاعتی کی نشان دہی کی۔ نتیجے میں ایسے نقادوں نے میری جانب سے دانستہ بے توجہی برتی۔**

’’کسی ادبی یا سیاسی گروہ سے بہ راہِ راست وابستگی نہیں ہے اس لیے ہر گروہ مجھے اپنے مخالف گروپ کا آدمی سمجھتا ہے۔ جدیدیت سے منسلک کیا جاتا ہوں لیکن میری تخلیقات میں بہتوں سے زیادہ حقیقی ترقی پسندانہ عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔ تخلیق کے ساتھ پیشہ ورانہ تقاضوں کے تحت تنقید سے بھی دل چسپی تھی اور اسی کے ساتھ صاف گوئی کریلے کی طرح نیم چڑھ گئی چناں چہ کئی بڑے نقادوں کی تخلیقی بے بضاعتی کی نشان دہی کی۔ نتیجے میں ایسے نقادوں نے میری جانب سے دانستہ بے توجہی برتی۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت)

یہ صاف گوئی پوری خودنوشت میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مظفر حنفی خود اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے بھی تحریر میں جذباتیت کو حاوی نہیں ہونے دیتے اور نہ کسی دوسری چیز سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں بھرتی کے اشعار یا فلسفیانہ موشگافیوں کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔ دوستوں اور حلقۂ احباب کا تذکرہ کچھ مقامات پر ملتا تو ہے لیکن تمام کے ساتھ وہ یکساں سلوک روا رکھتے ہوئے محض ان کے نام کا تذکرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان ادبا و شعرا کی شان میں ایک اضافی جملہ بھی رقم کرنا وہ مناسب نہیں سمجھتے۔ چند اقتباسات مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

’’بھوپال میں میرا قیام بدھوارہ کی رتھ خانہ اسٹریٹ میں تھا۔ پڑوس میں کوثر چاند پوری، ابو محمد سحر، عشرت قادری، شفا گوالیاری، اور واحد پریمی وغیرہ مقیم تھے جن سے روزانہ ادبی امور پر گفتگو ہوتی۔ تھوڑے فاصلے پر تاج بھوپالی کا احد ہوٹل شہر بھر کے ادیبوں اور شاعروں کی آماج گاہ تھا۔ حلقۂ دانش وراں، بزمِ فن کار اور انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ میں میری ملاقات اختر سعید خاں، گیان چند جین، تاج بھوپالی، شفیقہ فرحت، کیف بھوپالی، گوہر جلالی، فضل تابش، ایم عرفان، شفا گوالیاری، واحد پریمی، وفا صدیقی، آفاق احمد، نعیم کوثر، اظہر راہی، وکیل بھوپالی، مرتضٰی شاد اور درجنوں دوسرے شعرا اور ادبا سے ہوتی رہتی تھی۔ اس ماحول میں میری تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کے خوب مواقع ملے۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت)

’’یونیورسٹی میں ظفر اوگانوی، منال شاہ القادری، وغیرہ اور شہر میں عین رشید، خواجہ محمد یوسف، سالک لکھنوی، اعزاز افضل، علقمہ شبلی، ناظم سلطان پوری، قیصر شمیم، احمد سعید ملیح آبادی، فیضان احمد، منور رانا وغیرہ سے دوستانہ مراسم تھے۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت)

’’خوش بختی سے کھنڈوہ میں باعمل اور پُرخلوص ساتھیوں کی بہت اچھی ٹیم مل گئی۔ حسن رضا، علی احمد قریشی، حسن بشیر، قاضی انصار، منشی جلیس، ناصر حسین وغیرہ بڑے پرخلوص حوصلہ منداور قوم وملت کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے نوجوان تھے۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت)

خودنوشت کے اخیر میں جب وہ اپنی پوری زندگی اور مجموعی خدمات کے ماحصل کو محض ایک پیراگراف میں سمیٹتے ہیں اور خداوندِ قدوس سے دعا گو ہوتے ہیں تو اس وقت بھی اپنی صاف گوئی اور لوگوں سے بے نیازی کو مرکز میں رکھتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اسی برس کی طویل مُدت تک علمی و ادبی کام کرنے والا اور تقریباً ساٹھ سے زائد کتابیں لکھنے والا یہ شخص کتنی حسرت سے یہ دعوا کر رہا ہے کہ اسے اس بات سے بے اطمینانی ہے کہ اسے بہت سے بڑے ادبی کام کرنے کی خواہش تھی جو ادھورے رہ گئے۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے صحیح معنوں میں علم کا عرفان حاصل ہو چکا ہو۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’عمر کی 81 ویں منزل سے پلٹ کر گذشتہ برسوں پر نظر کرتا ہوں تو ہر چند کہ اس اعتبار سے بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے کہ بہت سے بڑے ادبی کام کرنے کی خواہش تھی جو رہ گئے۔

شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت
عمر کے اسی برس گم ہو گئے

لیکن یہ سوچ کر قدرے تسکین ہوتی ہے کہ بے حد غریب خاندان اور نامساعد حالات میں رہ کر بھی زندگی یکسر رائیگاں نہیں گئی۔ ہمیشہ پڑھنے لکھنے اور پڑھانے سے واسطہ رہا۔ خدا کے سوا کسی اور کے آگے سر نہ جھکایا۔ نہ اہلِ اقتدار کی خوشامد کی، کسی قسم کی سفارش کو اپنے آگے بڑھنے کا زینہ نہیں بنایا، لوگوں کے احسانات قبول نہیں کیے۔ قرض سے ہمیشہ دامن بچایا۔ حتی الوسع والدین کی خدمت کی، بہنوں کی اعانت اور اعزا کے ساتھ صلہ رحمی کا رویہ اختیار کیا۔ باصلاحیت اور مستحق شاگردوں کی مدد کی بلکہ دو تین کو اپنے ساتھ رکھ کر پی ایچ۔ ڈی میں کامیابی سے ہم کنار کیا۔ چھوٹی بہن، بھانجے، بھانجیوں کی شادیاں کیں۔ بیٹوں اور بیٹی کو اعلا تعلیم دلائی اور سب کے دلوں میں اردو سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ اپنی محنت کی کمائی سے دہلی میں بچوں کے لیے دو مکان تعمیر کیے۔ دوستوں اور اعزا میں محبت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہوں اور ادبی حلقوں میں صاف گوئی اور بے نیازی کے لیے مشہور ہوں۔ خداوندِ قدوس سے دعا کرتا ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک مجھے علمی و ادبی کام کرتے رہنے کی توفیق اور استطاعت عطا فرمائے اور اپنے علاوہ کسی غیر کے آگے سر نہ جھکنے دے۔ آمین۔‘‘ (شیشۂ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت)

بہ یک ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ زندگی کے نہ جانے کتنے سبق وہ ہمیں اس ایک اقتباس کے ذریعے پڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہر جملے میں ایسی باتیں ہیں جن پر صفحات کے صفحات سیاہ کیے جاسکتے ہیں۔ چاہے وہ والدین، بھائی بہنوں اور رشتے داروں کے حقوق کی ادائگی ہو یا قرض سے دامن بچانے کی بات ہو، اہلِ اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنا ہو یا ایک مثالی استاد کی طرح اپنے لائق شاگردوں کے کام آنا ہو۔ آخری سانس تک علمی و ادبی کام کرتے رہنے اور اپنے علاوہ کسی کے آگے سر نہ جھکانے کی دعا پر یہ خودنوشت ختم ہو جاتی ہے اور ہمیں اہلِ علم کا شیوہ بتاتی ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں بھی ان میں علم وادب کی خدمت کا ہی جذبہ ہوتا ہے۔ خدا ہمیں ان تمام خوبیوں کا مالک بنائے۔ آمین ثم آمین۔

اردو زبان میں ادبا و شعرا نے کئی اچھی اور معیاری خودنوشتیں لکھی ہیں لیکن ایسی مختصر تحریر خودنوشت کے طور پر شاید ہی پیش کی گئی ہو۔ خودنوشت سے امید ہوتی ہے کہ اس سے متعلقہ شاعر یا ادیب کے ذاتی احوال، زندگی کے اتار چڑھاو وغیرہ جیسی باتیں تفصیل کے ساتھ سامنے آئیں گی جس سے ہم اس شخصیت کی زندگی کی کڑیوں کو جوڑ سکیں لیکن مظفر حنفی نے اس خودنوشت میں اپنی زندگی کے تمام حالات اور واقعات کو افسانوی انداز میں پیش کرنے کا ایک نیا تجربہ کیا ہے جسے ہمیں خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔

■

Dr Tasleem Arif
Assistant Professor,
Department of Urdu, GLA College,
Medininagar, Palamu- 822102
E.mail : tasleem171@gmail.com, Mobile & Whatsapp No: 7004846692

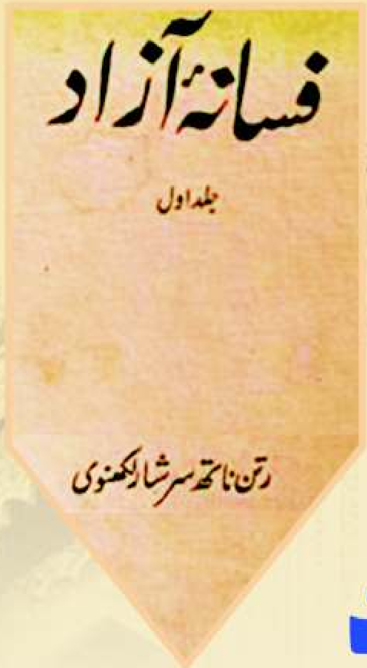

ساجد ذکی فہمی

ہندوستانی ثقافت

لکھنؤ اور فسانۂ آزاد

اردو ادب میں ثقافت کا لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ لفظ عربی سے اردو میں منتقل ہوا۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اردو کی پرانی لغت میں ثقافت کا لفظ موجود نہیں۔ مثلاً نور اللغات، فرہنگ آصفیہ وغیرہ۔ ثقافت سے پہلے جو لفظ اردو ادب میں مستعمل دکھائی دیتا ہے وہ 'تہذیب' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ تمام لغت نگاروں نے ثقافت کے ذیل میں تہذیب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مندرجہ بالا لغات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ لیکن ان دونوں الفاظ کے ہم معنی ہونے پر بعض حضرات مختلف الرائے ہیں۔ اس مسئلے پر بحث کرنے کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت درپیش ہوگی۔ لہٰذا اس بحث سے قطع نظر تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی زمرے میں رکھ کر اپنی بات آگے بڑھاتا ہوں۔

کلچر یعنی ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے ای۔ بی ٹائیلر (Edward Burnett Tylor) نے رقم کیا ہے:

''ثقافت (کلچر) وہ پیچیدہ عنصر ہے جس میں علم، اخلاق، قانون، رسم و رواج اور وہ تمام صلاحیتیں اور عادات وخصائل شامل ہوتے ہیں، جن کو انسان سماجی حیوان ہونے کی بنا پر حاصل کرتا ہے۔''[1]

اسی ضمن میں میلنا وسکی تحریر کرتی ہیں:

''ثقافت ایک معاشرتی ورثہ ہے۔ جس میں روایتی طور پر پائی ہوئی ہنر مندی، مواد، مشینی عمل، خیالات، عادات واطوار اور اقدار شامل ہیں۔''[2]

رالف لنٹن تہذیب کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

''تہذیب عقائد، جذبات، عادات، اداروں اور علامات کا ایک مجموعہ ہے جو ایک گروپ کے افراد کے کردار اور ان کے ردِعمل کو متعین کرتا ہے۔ اس پر جغرافیائی اور تاریخی حالات کا نیز معیار زندگی، تعلیم، زبان اور ادب سب کا اثر پڑتا ہے۔''[3]

مندرجہ بالا اقتباسات کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ثقافت میں بڑی وسعت ہے۔ اس کے ذیل میں علم، اخلاق، قانون، خیالات، رسم وروج، عادات واطوار، زبان وادب، فکر وفن، عقائد، جذبات، سیاست، فلسفہ، مذہب وغیرہ تمام چیزیں آجاتی ہیں۔

ثقافت کسی جامد شے کا نام نہیں کہ اس میں تبدیلی ناگزیر ہو۔ کسی قوم، ملت اور قبیلے کی ثقافت جب کسی دوسرے قبیلے، ملت اور قوم پر اثر انداز ہوتی ہے یا ان کے درمیان ربط وضبط کا عرصہ طویل ہوتا ہے تو دونوں کے اشتراک سے ایک نئی ثقافت جنم لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جو مختلف مذاہب، رنگوں اور نسلوں کا گہوارہ ہے ثقافتی اعتبار سے نہایت دل چسپ اور دل کش دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کے رسم ورواج، طور طریقے، رہن سہن، عقائد ونظریات اور زبان وادب وغیرہ کو کسی ایک گروہ یا قبیلے کے ساتھ جوڑ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی بھی خطے یا علاقے میں فاتح اور مفتوح قوم کے درمیان تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، سیاسی وغیرہ سطح پر رد وقبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں آریاؤں سے ماقبل کی ثقافت پر آریائی تہذیب کے اثرات، ہند آریائی تہذیب پر اسلامی تہذیب کے اثرات یا موجودہ زمانے میں مغربی تہذیب کے اثرات وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ وقت اور حالات کے پیش نظر ان تمام تہذیبوں کے اثرات ایک دوسرے پر اپنے نقوش ثبت کرتے رہے اور بالآخر ان تہذیبوں کے اختلاط سے ثقافت کے ارتقا کی ایک نئی صورت جلوہ گر ہوئی۔ تہذیبوں کے اسی اختلاط اور امتزاج باہمی نے آگے چل کر ہندوستانی ثقافت کی صورت اختیار کرلی۔

لکھنؤ اسی ہندوستانی ثقافت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ فن تعمیر، موسیقی، لباس وزیورات، طرز معاشرت کے ساتھ علم وادب کے میدان میں بھی لکھنؤ نے گہرے نقوش ثبت کرنے کی کوشش کی۔ دلّی کی تباہی کے بعد وہاں کا تمام تہذیبی سرمایہ آہستہ آہستہ لکھنؤ منتقل ہونا شروع ہوا۔ لیکن لکھنؤ نے ان تمام پر ایسی رنگ آمیزی اور نقاشی کی کہ بہ نسبت دلّی کے وہ زیادہ لطیف، نفیس اور شاندار دکھائی دینے لگیں۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں تہذیب یا ثقافت کوئی ایسی شے نہیں جسے فوراً وجود بخش دیا جائے، بلکہ یہ ایک ایسا نقش ہے جس کو ابھرنے میں طویل مدت درپیش ہوتی ہے۔ ثقافتی ارتقا کے دوران کئی نقوش بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ بالآخر تمام مد وجزر سے گزرنے کے بعد ایک ایسا نقش ابھر کر سامنے آتا ہے جسے زمانہ قبول کرلیتا ہے۔ لیکن لکھنؤ والوں نے دلّی کی تباہی کے بعد دلّی سے الگ ایک نئی تہذیب وثقافت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش شروع کردی۔ ظاہر ہے یہ طریقہ قانون فطرت کے خلاف تھا۔ لہٰذا ظاہری طور پر لکھنوی تہذیب چمک دار اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی تو بن گئی، لیکن بنیاد کمزور ہونے کی وجہ سے وہ دیرپا اثرات کی حامل نہ ہوسکی۔ اس کی مزید وضاحت عبدالحلیم شرر کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

''...دہلی کے مقابلے میں ایک نئی متمائز معاشرت اختیار کرنے کی شعوری کوششوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی چیزیں پیدا کرنی شروع کیں، جن میں نمود تو بہت تھی، تہہ داری نہیں تھی۔''[4]

البتہ جہاں تک مذہب کی بات ہے اس نے لکھنوی تہذیب پر گہرے نقوش مرتسم کیے۔ لکھنؤ جب تک دلّی سلطنت کے ماتحت رہا (خواہ برائے نام ہی سہی) اس وقت تک لکھنوی معاشرت میں مذہبیت کا غلبہ اس درجہ حاوی نہیں تھا، حالانکہ اس زمانے میں بھی لکھنؤ کے

فرماروایان شیعیت کے قائل تھے۔لیکن جوں ہی انگریزوں کی شہ پر غازی الدین حیدر نے بادشاہت کا اعلان کیا تو مذہب میں بھی اختراعات کا سلسلہ شروع ہوا۔خود مختاری کا احساس،حکومت کا زعم،مغلوں سے نجات اور مذہبی جوش نے غازی الدین حیدر سے مذہبی معاملات میں بھی ایسے ایسے کام کروائے جو لکھنؤ سے پہلے عالمی منظرنامے پر کبھی دیکھے نہیں گئے تھے۔زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح مذہبی معاملات میں بھی باطن سے زیادہ ظاہر پر زور صرف کیا گیا۔

بہر حال تغیر و تبدل کا یہ سلسلہ جب زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر رہا تھا، تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ زبان و بیان پر اس کے اثرات مرتب نہ ہوتے۔لہٰذا 'اصلاح زبان' کے نام پر ایک تحریک کی شروعات ہوئی، جس میں ناسخ اور شاگردان ناسخ پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔نثر و نظم دونوں میں لفظوں کی تراش خراش، تشبیہات و استعارات، رمزیات و کنایات، محاورات و ضرب الامثال کے ساتھ نازک خیالی منتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔جو عبارت تھی مقفع و مسجع، جو اشعار تھے رنگینی، معاملہ بندی، رعایت لفظی، فحاشی اور عریانیت کی اعلیٰ مثال۔غرض کہ ادبا و شعرا نے سادگی اور زندگی کے حقائق کے برعکس رنگینی اور سطحی جذبات کی عکاسی کو اپنا مطمحِ نظر سمجھ رکھا تھا۔یہی وجہ تھی کہ جب میر صاحب نے دلّی کی تباہی اور معاشی تنگی سے پریشان ہو کر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تو لکھنؤ اپنی تمام تر رنگینی، دل کشی اور دل فریبی کے باوجود ان پر دیرپا اثرات مرتب نہ کر سکا اور بالآخر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں
برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزم سفر ہنوز
آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

میر اور لکھنؤ کے متعلق محمد حسین آزاد نے بھی آب حیات میں چند واقعات نقل کیے ہیں جن سے میر کی لکھنؤ کے تئیں بے زاری کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ تمام باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لکھنؤ؛ اپنی تمام تر خارجیت کے باوجود رثائی ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔فن مرثیہ گوئی کو جس قدر فروغ لکھنؤ میں حاصل ہوا یا جس اعلیٰ پایے کے مرثیہ گو لکھنؤ میں موجود تھے ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے یا خطے میں نہیں تھے۔لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کی ترقی کی بنیادی وجہ بادشاہ اور عوام کے دلوں میں مذہبیت کا غلبہ تھا۔جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مذہب ہی ایک ایسی شے ہے جس کا تعلق ظاہر سے کم باطن سے زیادہ ہوتا ہے۔اس لیے اس کے اثرات بھی دیرپا ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی لکھنؤ اسی ثقافت کے رنگ میں گرچہ پوری طرح نہیں لیکن رنگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔گفتگو کا سلسلہ دراز تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے برعکس گریز کا پہلو اختیار کرتے ہوئے فسانۂ آزاد کی طرف رجوع کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

'فسانۂ آزاد' از پنڈت رتن ناتھ سرشار دسمبر 1878 تا دسمبر 1879 تک 'اودھ اخبار' میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔بعدازیں یہ فسانہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ مکمل فسانۂ آزاد قسط وار شائع ہوا تھا یا اس کی کون سی جلد کب شائع ہوئی۔البتہ جہاں تک فسانۂ آزاد میں موجود ہندوستانی ثقافت کی بات ہے اس کے متعلق یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اس فسانے میں لکھنوی ثقافت پورے آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔بعض حضرات یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ فسانۂ آزاد میں سرشار نے لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب و ثقافت کا نقشہ کھینچا ہے۔لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اسی زوال آمادہ تہذیب و ثقافت کو دراصل لکھنوی ثقافت کا درجہ حاصل ہے۔کیوں کہ جو حضرات اس قسم کے اعتراضات کرتے ہیں دراصل ان کی نگاہ مغل دور حکومت پر مرکوز ہوتی ہے۔لہٰذا جب وہ مغلیہ عینک سے لکھنوی ثقافت کا جائزہ لیتے ہیں تو مایوسی ان کے حصے آتی ہے۔ان کے دلوں میں نئی ثقافت کے نمو کی خوشی نہیں بلکہ پرانی ثقافت کے منہدم ہونے کا افسوس زیادہ ہوتا ہے۔

'فسانۂ آزاد' میں سرشار نے لکھنؤ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تعلیمی اور تمدنی غرض کہ ہر شعبے کا عکس دکھائی دیتا ہے۔درج ذیل میں 'فسانۂ آزاد' سے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

زبان و بیان

دو راہ گیر جو ایک دوسرے سے واقف نہیں اس کے باوجود گفتگو میں بے تکلفی کس درجے کی ہے ملاحظہ کیجیے:

مثال نمبر1

نازک بدن: میاں جانے والے! او میاں جانے والے! اے ذری ادھر تو دیکھو! الٰہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔میرا کلیجہ بلیوں اچھلتا ہے۔بھری برسات کے دن اے ہے! کہیں پھسل نہ پڑیں، تو قہقہہ اڑے۔یار لوگوں کو دل لگی ہاتھ آئے۔ان بے چارے کی کھوپڑی پر جائے۔حضرت سنبھلے ہوئے۔

جانے والا: (ٹھہر کر) ارشاد، آپ اپنا مطلب فرمائیے۔ میرے پھسلنے کی فکر نہ کیجیے۔

نازک بدن: گر پڑے گا تو مجھ سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔

جانے والا: بہت خوب، ضرور پوچھ لوں گا، بلکہ آپ کو ساتھ لے کر گروں تو سہی۔نیچے آپ ہوں، اوپر بندہ انشاء اللہ۔

نازک بدن: آپ نے یہ کیسی نیم ٹرقطع بنائی ہے۔کہیں گڈا میری پھبتی آپ ہی پر تو لوگ نہیں کہتے ہیں۔

جانے والا: آپ کو یہ زنانوں کی وضع کیسی بھائی۔یہ چھمی جان آپ ہی تو نہیں مشہور ہیں۔

چھمی جان: (وہی نازک بدن) خدا کی قسم آپ کے کالے کپڑوں سے میں سمجھا، کہ بنڈیلا کسم کے کھیت سے نکل پڑا...

جانے والا: قسم حضرت عباسؓ کی میں آپ کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ کوئی زنانہ منکنا جاتا ہے یا پنجہ کش ساقن مردانہ بھیس میں آتی ہے۔[5]

مثال نمبر2

آزاد: (گھڑی جیب سے نکال کر) آئیں آٹھ پر اکیس منٹ آئے۔اس خوش گپی نے آج ستم ڈھایا۔لکچر سننے میں نہ آیا۔مفت کی بک بک، جھک جھک۔لاحول ولا قوۃ۔واللہ لکچر لائق شنید تھا۔لعنت بکار شیطان۔

چھمی جان: اللہ جانتا ہے۔اس وقت کلیجے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔نہ جانے تڑکے تڑکے کس منحوس کا منھ دیکھا ہے، کہ بھیروں کے مزے ہاتھ سے گئے۔

حبیب لبیب: یہ ضعیف الاعتقادی، بھلا کسی کے منھ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔آپ بھی نرے چونچ ہی رہے۔اتنی دیر تک سمجھایا، سرمغزن کی، مگر واہ رے کتے کی دم، بارہ برس بعد بھی ٹیڑھی ہی نکلی۔جو کہیں چھ مہینے ہماری جوتیاں سیدھی کرو تو اونٹ سے آدمی بن جاؤ۔

چھمی جان: واہ! بس چلیے چلیے۔یہ زبانی داخلہ بہت سنا ہے۔ایسے ہی بڑے صوفی صافی ہو، تو ذرا ساتھ چلے چلو نہ، بغلیں کیوں جھانکتے ہو۔[6]

مذہبی عکاسی

نوابین اودھ نے جب بادشاہت اختیار کی تو شیعیت کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔نئے نئے رسوم ایجاد ہونے لگے۔امام باڑے اور مزارات وغیرہ پر عقیدت مندوں کا ہجوم امڈا چلا آتا تھا۔'فسانۂ آزاد' میں سرشار نے لکھنؤ کے ان مناظر کی عکاسی نہایت دلچسپ انداز سے کی ہے۔مثلاً شاہ مینا صاحب کی مزار کا ایک منظر یوں بیان کرتے ہیں:

مثال نمبر1: ''...شاہ مینا صاحبؒ کی درگاہ سب میں انتخاب زیارت گاہ خاص و عام ہے۔اللہ اکبر گرد مزار کہیں

نوجوانوں کی وہ دھوم دھام ہے کہ جس طرف دیکھیے اژدہام عام ہے۔ غٹ کے غٹ، جوق کے جوق چلے جاتے ہیں۔ غول کے غول اُمڈے آتے ہیں۔ وہ بھیڑ بھڑکا، وہ دھکم دھکا، وہ ریل پیل وہ شور وشر کہ الامان ! الحذر! ایک دوسرے کو ریلتا ہے، دوسرا تیسرے کو ڈھکیلتا ہے، ڈولیوں پر ڈولیاں اور فنس پر فنس چلی آتی ہیں۔ مہ جبینان ماہرو، تماشہ بینوں کے بدولت چھرے اڑاتی ہیں۔...دوسری جانب قوال حقانی غزلیں گاتے صوفیوں کو وجد میں لاتے ہیں۔ کسی اہل دل کو حال آیا۔ کوئی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ہوحق کا نعرہ بلند ہے۔ سرور وغنا کا لطف دو چند ہے۔ ایک سمت ساقنوں کا گرم بازار، دکانیں دھواں دھار، چلم پر چلم بھری جاتی ہے۔ دم پردم پڑتے ہیں۔ ناتواں نوجوان نشہ کے زور میں عجیب لوچ سے اکڑتے ہیں۔''7

مثال نمبر2: ''...گھر گھر شیون وشن، گھر گھر بکا وبین، گریہ و زاری، اشک باری، جم غفیر، مجمع کثیر، ...مجالس عزا کی دھوم دھام ہے۔ لکھنؤ کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی، لکھنؤ کی خوش بیانی، لکھنؤ کی عزاداری، لکھنؤ کی سوگواری، از شام تا روم، مشہور ... ہے۔ تعزیہ خانوں میں دھوم، امام باڑوں میں ہجوم ہے اور ان سب میں حسین آباد مبارک کا بدر فی النجوم ہے۔''8

طرز معاشرت

مثال نمبر1

حسن آرا جو بنیادی طور پر لکھنؤ میں پلی بڑھی اور ایک مہذب خاندان سے تعلق رکھتی ہے، آزاد کے ساتھ نکاح کی خواہش مند ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آزاد کے کسی رشتے دار کا پتہ نہ خاندان والوں کا۔ لہٰذا حسن آرا، آزاد کو درج ذیل باتوں کی پابندی کرنے کا مشورہ دیتی ہے تا کہ وہ لکھنوی معاشرت کا حصہ معلوم ہو اور کسی غیر کو حرف گیری کا موقع نہ ملے۔

1 پندرھویں دن آپ کے یہاں مشاعرہ ہو، تا کہ اس صحبت سے آپ کا نام ہو اور لوگ آپ کو جانیں کہ آپ کوئی ہیں۔

2 کوئی عمدہ اور خوشنما بنگلہ یا کوئی کوٹھی کرایے پر لیجیے مگر سرراہ اور اس کو نفاست سے آراستہ کیجیے تا کہ لوگ سمجھیں کہ خوش سلیقہ آدمی ہے اور روٹیوں کو محتاج نہیں۔

3 شریف زادوں، رئیس زادوں اور علما و فضلا کے سوائے اور کسی ایسے ویسے سے صحبت نہ گرمایئے۔ شہدوں، اوباشوں اور بدمعاشوں کو نہ آنے دیجیے۔

4 نماز جمعہ پڑھنے کے لیے ہر بار مسجد جایا کیجیے جس سے مسلمان یہ نہ کہیں کہ پابند صوم وصلواۃ نہیں ہے۔ لامذہب آدمی کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ خیالات چاہے جو ہوں، لیکن دنیا پرستی اور ظاہر پرستی بھی کسی قدر ضروری ہے۔

5 ایک سواری رکھیے اور صبح شام ہوا کھانے جایا کیجیے۔

6 اماں جان سے کبھی کبھی ملا کیجیے۔ اگر ان باتوں کو آپ پسند کریں اور میرا کہا مانیں تو مجھے شادی کرنے میں اصلاً عذر نہیں۔''9

مثال نمبر2: ''عدالت کے قریب...وہ چہل پہل کا میلا لگا ہوا ہے۔ خوانچے والے پکار رہے ہیں۔ گلاب، ریوڑیاں، دہی بڑے مصالحے کے، مٹر ٹر ایک طرف، ساقی چلمیں بھر بھر کر مشکبور دھواں دھار پلا رہا ہے۔ سامنے لکڑ والا مداریے حقے جمائے ایک ایک کے دو دو کر رہا ہے۔ کوئی ڈکڑی پر سے اترا اور دن سے کمرے میں داخل۔ کسی نے بگھی روکی اور غڑاپ گواہ گھر میں موجود...کوئی سبزہ بیگانہ کو اپنا مسکن بنائے بیٹھا چبینا چبا رہا ہے۔ گواہ سر بجیب تفکر یوں جھوٹ بولیں گے، یوں بات بنائیں گے۔ وکیل ہم سے کڑے کڑے سوال کرے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ ہمیں یاد نہیں۔ ہم نہیں جانتے۔''10

اس کی طرح کی سیکڑوں مثالیں 'فسانۂ آزاد' سے پیش کی جاسکتی ہیں جو لکھنوی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔ درج بالا یا اس جیسے دیگر اقتباسات جو 'فسانۂ آزاد' میں مذکور ہیں، سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اٹھارہویں یا انیسویں صدی عیسوی میں لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کا رنگ یا اس کا معیار کیسا تھا؟ درج ذیل میں ایک لطیفہ جو 'فسانۂ آزاد' میں مذکور ہے نقل کیا جاتا ہے۔ اس لطیفے میں دراصل لکھنوی ثقافت کی گہری جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''...ایک صاحب نے اپنے غلام کو، کہ صاحب طبع لطیف، بذلہ سنج تھا۔ حکم دیا جا کر بازار میں تاک لگائے۔ اگر انگور ہاتھ آئے تو فوراً خرید لائے۔ غلام نے ...کئی خوشے خریدے اور مٹر گشتی کرتے ہوئے خراماں خراماں آقا کے پاس لے گیا۔ وہ نہایت بدماغ ہوئے۔ فرمایا کہ ذرا سا کام اور یہ تاخیر اتنی دیر میں تو میں لندن ہو آتا۔ ایسا کاہل دیکھا نہ سنا۔ خبردار آج سے اگر ایک کام کو بھیجوں تو ہاتھوں ہاتھ چار کام انجام دے لانا۔ غلام نے دست بستہ عرض کیا کہ پیرومرشد! اس مرتبہ معاف فرمائیں... دوسرے دن خواجہ کسی زبان دراز، اور گستاخ، کنیز کے عشوہ پرواز پر ایسے گرمائے کہ تپ چڑھ آئی۔ غلام کو حکم دیا کہ کسی طبیب لبیب کو بلاؤ۔ وہ فوراً گیا اور طبیب کے علاوہ اور چند آدمیوں کو بھی ساتھ لایا۔ خواجہ نے پوچھا کہ یہ جماعت کیسی ہے... غلام نے بصد ادب عرض کی کہ خداوند! حضور تو بھول بھول جاتے ہیں۔ ابھی تو کل ہی تاکید اکید کی تھی کہ اگر ایک کام کا ارشاد کروں تو کئی کام بعجلت تمام سرانجام دے لانا۔ الامر فوق الادب۔...حکیم جی کو حسب الحکم بلا لایا کہ تشخیص مرض کر کے معالجہ کریں اور اُدھر ہی سے لپکا ہوا گیا، مطرب خوش الحان کو ساتھ لایا کہ اگر خداوند عروس صحت سے ہم آغوش ہوں تو قول کی خوش آوازی اور ناخن بازی، سے بزم طرب آراستہ ہو۔ غسال کو بھی لیتا آیا کہ زندگی کا کیا بھروسہ، اگر پیک اجل حضور کو خلد علیین کی سیر دکھائے تو غسال جھٹ پٹ غسل دے دے۔ اُدھر سے ایک شاعر جادو بیان اور طلیق اللسان کو ہمراہ لیا کہ مرثیہ موزوں کرے۔ اب باقی کون رہا۔ گورکن۔ وہ بھی بات کی بات میں آن موجود ہوگا۔ مطمئن رہیے۔''11

مقالے کی طوالت کے باعث رہن سہن، فنون لطیفہ، شادی بیاہ وغیرہ کے اقتباسات نہیں پیش کیے جاسکے، لیکن 'فسانۂ آزاد' کے مطالعے کے بعد بلا جھجک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس میں لکھنوی ثقافت اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مثال کے طور پر بامحاورہ بات چیت، وضع قطع، لباس، عقیدہ، ضعیف الاعتقادی، محرم، چہلم، میلے ٹھیلے کے مناظر، چوک، بازار، مشاعرہ، سواری، مکانات، راگ ورنگ کی مجلسیں وغیرہ۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ اگر قارئین لکھنوی ثقافت کا نقشہ دیکھنا چاہتے ہوں یا اسے سمجھنا چاہتے ہوں بلکہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اسے محسوس کرنا چاہتے ہوں تو انھیں 'فسانۂ آزاد' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حواشی

1 بحوالہ ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات، ڈاکٹر سید اسد علی، مترجم ڈاکٹر ماجدہ اسد، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1991، ص 20

2 ایضاً، ص 21

3 ہندوستانی تہذیب اور اردو، شبنم سبحانی، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، 1972، ص 11

4 ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011، ص 13

5 فسانۂ آزاد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، جلد اول، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2002، ص 14

6 ایضاً، ص 24

7 ایضاً، ص 81-82

8 ایضاً، ص 66

9 ایضاً، ص 507-508

10 ایضاً، ص 775

11 ایضاً، ص 36-37

■

Dr. Sajid Zaki Fahmi
Guest Faculty, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.: 8527007231

اردو سانیٹ کا فن اور عزیز تمنائی

سانیٹ، غنائی داخلی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے جس کی روایت قدیم اطالوی شعرا تک پہنچتی ہے اور غنائی شاعری، شاعری کی ان بنیادی قسموں میں سے ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں۔ غالباً یہ انسانی جذبے کی وہ فطری پکار ہوگی جس کے لیے لفظ و حرف بھی بعد میں وضع کیے گئے ہوں گے۔ سانیٹ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے اس کا ہیئتی تصور مختلف اوقات میں تبدیل بھی ہوتا رہا ہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں اس کی یہ بنیادی خصوصیت برقرار رہی ہے کہ اس میں محض داخلی جذبے کو ایک مکمل خیال بناکر پیش کیا جائے اور چودہ مصرعوں کو ایسے دو بندوں میں تقسیم کیا جائے کہ اس کے پہلے آٹھ مصرعوں میں خیال کا پھیلاؤ ہو اور بعد کے چھ مصرعوں میں اس کی تکمیل۔ اس کا رواج پندرھویں صدی سے فرانس اور انگلستان میں ہوا۔

اردو شعر و ادب کا دامن کافی وسیع ہے اردو شعری و نثری اصناف کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ نظم اور حصہ نثر اور حصہ نثر کو بھی افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ نظم میں نظم، غزل، رباعی، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، گیت، ہائیکو، دوہا، ترائیلے، ماہیا، سانیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ حصہ نظم سے سانیٹ بھی ایک صنف ہے یہ اطالوی، مغربی صنفِ سخن ہے جو چودہ مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اطالوی شاعر پیٹراک نے اس صنف کو تکمیل بخشی اور رواج دیا۔ اردو میں سانیٹ کو اختر شیرانی نے متعارف کروایا۔ ن م راشد، عظمت اللہ خاں نے بھی پہلے پہل سانیٹ لکھے تھے۔

سانیٹ کی تعریف اور اس صنف کی ہیئت کے متعلق پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے:

''سانیٹ، غنائی داخلی شاعری کی ایک قدیم صنف ہے جس کی روایت قدیم اطالوی شعرا تک پہنچتی ہے اور غنائی شاعری، شاعری کی ان بنیادی قسموں میں سے ہے جس کی کوئی تاریخ نہیں۔ غالباً یہ انسانی جذبے کی وہ فطری پکار ہوگی جس کے لیے لفظ و حرف بھی بعد میں وضع کیے گئے ہوں گے۔ سانیٹ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے اس کا ہیئتی تصور مختلف اوقات میں تبدیل بھی ہوتا رہا ہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں اس کی یہ بنیادی خصوصیت برقرار رہی ہے کہ اس میں محض داخلی جذبے کو ایک مکمل خیال بناکر پیش کیا جائے اور چودہ مصرعوں کو ایسے دو بندوں میں تقسیم کیا جائے کہ اس کے پہلے آٹھ مصرعوں میں خیال کا پھیلاؤ ہو اور بعد کے چھ مصرعوں میں اس کی تکمیل۔ اس کا رواج پندرھویں صدی سے فرانس اور انگلستان میں ہوا۔''[1]

سانیٹ اطالوی لفظ سانیٹ سے بنا ہے جس کے معنی مختصر آواز یا راگ کے ہوتے ہیں، سانیٹ دراصل ایک قسم کا راگ (نغمہ) ہے جو وحدت خیال کا مکمل ترین اظہار ہے۔ سانیٹ میں خیال کے تسلسل، زبان کی شیرینی، اظہار کی روانی کا خیال رکھا جانا ضروری ہے۔ سانیٹوں کی بحریں مخصوص ہیں۔ سانیٹ میں مصرعوں کی تعداد اور قافیوں کا اہتمام ہوتا ہے۔

سانیٹ کے فن کی خصوصیت، اسلوب نگاری، نظم اور غزل کے فرق کو واضح کرتے ہوئے عزیز تمنائی رقمطراز ہیں:

''سانیٹ کا فن اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ ایک گوہر تراش کی نفیس و نازک کاریگری، بڑے سے بڑے خیال کو ایک مختصر نظم میں سمو دینا گویا سمندر کو صراحی میں بند کرنا ہے۔ کم سے کم الفاظ کا چناؤ، طریقہ اظہار میں ایجاز اور اسلوب بیان میں ارتقا کو مدنظر رکھنا یہ ساری باتیں سانیٹ کے شاعر کے لیے ضروری ہیں۔ اردو زبان میں سانیٹ ایک

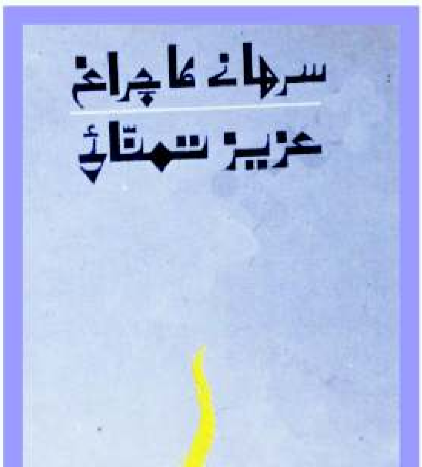

پل ہے جوغزل اورنظم کی درمیانی خلیج کو پاٹتا ہے۔اس میں غزل کی اشاریت،اس کا رچاؤ، اس کی گہرائی، اس کی پنہائی بھی موجود ہےاورنظم کاتسلسل،اس کی ہم آہنگی،اس کا داخلی وخارجی تناسب، اس کا محاکاتی اندازبھی۔غزل اورنظم کی تمام اہم خصوصیات کا یہ حسین امتزاج سانیٹ کو ایک انوکھی خوبی عطا کرتا ہے۔''[2]

انگریزی ادب میں سانیٹ کو ایک خاص مقام حاصل ہے، انگریزی ادب میں سانیٹ کی تین اقسام ہیں، پٹراری سانیٹ، شیکسپی سانیٹ اوراسپنسری سانیٹ۔ سانیٹ کے لیے بحر کا انتخاب ضروری ہے، بحریں طویل نہ ہوں۔عزیز تمنائی کی سانیٹ میں درمیانی بحروں کا استعمال نظر آتا ہے،ان کی سانیٹوں میں انگریزی ادب کی ان اقسام کی درجہ بندی نظرنہیں آتی۔

یہ صنف یوروپ میں کافی مقبول ہوئی۔اردوادب میں سانیٹ نئی صنف ہے،اس صنف پرکم ہی شعرانے طبع آزمائی کی ہے۔جن شعرانے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں عزیز تمنائی کانام نمایاں طور پرنظر آتا ہے۔ انھوں نے اس صنف کواردو میں بام عروج پر پہنچایا ہے۔ اردوزبان وادب میں اردو سانیٹ کا پہلا مجموعہ بھی عزیز تمنائی نے ہی لکھا تھا جو'برگِ نوخیز' کے نام سے جولائی 1963 میں دار التصنیف مدراس نے نوری پریس۔ مدراس سے شائع کیا تھا۔عزیز تمنائی نے اردوسانیٹ کے اس پہلے مجموعے کو'برگ سبز' کے نام سے شائع کرنے کا ارداہ کیا تھااس کے کچھ صفحات شائع بھی ہوگئے تھےلیکن ان کو اطلاع ملی کہ حیدرآباد سے اس نام سے کوئی شعری مجموعہ شائع ہوچکا ہے تب ہی انھوں نے اپنے مجموعے کانام تبدیل کردیااور'برگِ نوخیز' کے نام سے شائع کیا۔

عزیز تمنائی کامکمل نام عزیز الرحمٰن تھااورتخلص تمنائی 19 جنوری 1926 کو ولتور، مدراس (ٹاملناڈو) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد عزیز تمنائی نے مدراس یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور شعبہ طب میں اپنی خدمات کا آغاز کردیا۔ ان کو بچپن سے ہی شعروادب سے دلچسپی تھی،کم عمری یعنی 13 سال کی عمر 1938 سے ہی شاعری کا آغاز کردیا تھا۔ ابتدا میں انھوں نے غزلیں لکھی اورمشاعروں میں پڑھی، بعد میں نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے وہ علامہ اقبال کی شاعری سے متاثر تھے، ان کے ہم عصر شعرا میں ن م راشد، میراجی، اختر شیرانی کا شمار ہوتا ہے۔

عزیز تمنائی کو مطالعے کا بے حد شوق تھا وہ بڑی گہرائی سے ادب کا مطالعہ کرتے تھے۔ انھوں نے انگریزی اور یوروپی ادب کا بھی خوب مطالعہ کیا اور قدیم و جدید شاعری کی اصناف کوبھی خوب پڑھا اور متاثر ہوکر اردو میں سانیٹ لکھنے لگے۔ اردو میں سانیٹ کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو یوروپ میں اس کو حاصل ہے۔انھوں نے کچھ عرصے کے لیے سانیٹ لکھنا ترک کردیا تھا۔پھر دوبارہ سانیٹ کی طرف متوجہ ہوئے انھیں یہ صنف داخلی کیفیات کے اظہار کے لیے بہت مناسب نظر آئی اور انھوں نے اس صنف میں خوب طبع آزمائی کی اوران کے قلم سے اردو سانیٹ کا پہلا مجموعہ 'برگِ نوخیز' سابق نام 'برگ سبز' کو وجود حاصل ہوا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اردو میں سانیٹ کے عنوان سے عزیز تمنائی کے فن سے متعلق لکھا ہے کہ:

''اردو میں سانیٹ کو اختر شیرانی اور ن، م، راشد نے رواج دیا تھالیکن اس صنف کی مقبولیت جناب عزیز تمنائی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔فی الواقعہ آج اس صنف کے نام لیواؤں میں عزیز تمنائی کا نام سرفہرست ہے۔ان کے سانیٹ فنی لحاظ سے کامیاب اورشعری کیفیات کی تازگی اورندرت کے اعتبار سے بہت خوبصورت ہیں۔''[3]

اردو میں سانیٹ کو متعارف کرنے کا سہرا اختر شیرانی کو حاصل ہے ان کے ساتھ ن م راشد کا نام بھی لیا جاتا ہے۔علیم صبا نویدی نے اپنی کتاب ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب میں لکھا ہے کہ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سانیٹ کا اولین نمونہ پیش کرنے والے عظیم الدین احمد ہیں،ان کا سانیٹ فریادِعظیم اردو کا پہلا سانیٹ ہے جو رسالہ نگار بزم کلکتہ شمارہ ماہ اکتوبر 1913 میں شائع ہوا۔

عزیز تمنائی کی سانیٹ میں معنویت، اشاریت اور رمزیت بھی پائی جاتی ہے اس صنف میں انھوں نے استعارہ وتشبیہات کا خوب اور بہتر استعمال کیا ہے ان کی شاعری میں جدید میلانات اور اسالیب بیان اعتدال و توازن سے نظر آتے ہیں۔

عزیز تمنائی کی شاعری اور میلانات سے متعلق محمود ایاز نے لکھا ہے:

''عزیز تمنائی کی شاعری کی عمر چالیس برس سے زیادہ ہی ہوگی۔اس عرصے میں فکر واظہار کی کئی تبدیلیاں اردو شاعری میں آئیں اور عزیز تمنائی ان تبدیلیوں سے غافل یا ناآشنا نہیں رہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور بے حد مقبول اور ہردل عزیز ڈاکٹر۔اس پیشے کی مصروفیات سے جتنا کچھ وقت مل سکتا تھا وہ انھوں نے شعروادب کی نذر کیا، اور اس طرح شاعری کے نئے میلانات اور اسالیب بیان سے وہ اجنبی نہیں رہے۔آزاد نظمیں بھی انھوں نے لکھی ہیں،لیکن سانیٹ کوانھوں نے بطور خاص اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا اور اس وفاداری کو پوری استواری سے آج تک نباہے جارہے ہیں۔ان کے سانیٹوں کا ایک مجموعہ برگِ نوخیز کے نام سے آج سے کوئی تیس سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اور ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں اس کی اچھی پذیرائی ہوئی تھی۔''[4]

عزیز تمنائی کے سانیٹوں میں جذبات اوراحساسات کا برمحل اظہار ہوتا ہے،ان کے خیالات وافکار کی آمیزش کا اظہار بھی نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کے سانیٹوں میں علامات واشارے، استعارے، تشبیہات اور تمثیلوں کو خوب محسوس کیا جاسکتا ہے۔ برگ نوخیز سانیٹوں کے مجموعے میں مختلف عنوانات پرکل 109 سانیٹ شامل ہیں جو عزیز تمنائی کے فن کا بھرپور اظہار ہے۔

عزیز تمنائی کے سانیٹ سے متعلق پروفیسر احتشام حسین نے لکھا ہے:

''دسمبر سنہ 1959 میں مدراس جانے اور تقریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔وہاں ڈاکٹر عزیز الرحمٰن عزیز تمنائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ان کی ذہانت، ادب نوازی اور خوش اخلاقی ہی نے اس قدر متاثر کیا کہ میں ان کی شاعری سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا وقت ہی نہ نکال سکا۔اب یہ خواہش اس طرح پوری کررہا ہوں کہ میرے سامنے ان کے سانیٹوں کا پہلا مجموعہ برگ سبز ہے، پڑھتا اور داد دیتا ہوں۔ ڈاکٹری کے مشغول پیشے کے ساتھ انھوں نے ذوق کی اس کلی کو بھی تازہ وشاداب رکھا ہے، یہ بڑی بات ہے۔''[5]

عزیز تمنائی نے صنف غزل سے پرے ہٹ کر سانیٹ لکھنے کی طرف توجہ کی سانیٹ کے میدان میں طبع آزمائی کے ذریعے انھوں نے ثابت کیا کہ اردو شاعری کا میدان محدود نہیں ہے سانیٹ میں بھی کھل کر اپنے خیالات واحساسات کا بھرپور اظہار کیا جاسکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ فن تھوڑا دشوار ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے بڑے خیال کو ایک چودہ سطری نظم میں پیش کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔

عزیز تمنائی کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے علیم صبا نویدی رقمطراز ہیں:

''عزیز تمنائی صاحب نے سانیٹوں میں بھی آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے اپنے طور پر کچھ کر گزرنے کی ہمت کی ہے اور بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ان کی سانیٹوں میں تغزل کی چاشنی بھی ہے اور غزل کا مزاج بھی۔ وہ سانیٹ کی تخلیق میں اس مقام عروج پر پہنچ گئے ہیں

اردو ادب میں سانیٹ نئی صنف ہے، اس صنف پر کم ہی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ جن شعرا نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں عزیز تمنائی کانام نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس صنف کو اردو میں بام عروج پر پہنچایا ہے۔ اردو زبان و ادب میں اردو سانیٹ کا پہلا مجموعہ بھی عزیز تمنائی نے ہی لکھا تھا جو' برگ نوخیز' کے نام سے جولائی 1963 میں دار التصنیف مدراس نے نوری پریس، مدراس سے شائع کیا تھا۔

جہاں تک اچھے اچھوں کی رسائی اب تقریباً محال نہ سہی دشوار ضرور ہے۔ان کے ہاں طویل بحروں کی زیادہ سانیٹیں ملتی ہیں جو عزیز تمنائی کے مزاج کی پوری طرح متحمل ہیں۔ اوسط طوالت کی بحروں میں بھی کافی نکھار قائم رکھا ہے اور سانیٹ کے مزاج کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے' برگ نوخیز کا پہلا سانیٹ نعتیہ ہے جو اعلیٰ اظہار کی شان لیے ہوئے ہے۔[6]

اپنے شعری مجموعے 'سرہانے کا چراغ ہے' میں عزیز تمنائی نے علامہ جمیل مظہری کے مکتوب سے اقتباس کو شامل کیا ہے جس میں علامہ جمیل مظہری نے عزیز تمنائی کے فن کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے:

''آپ کا ہرا بھرا ارمغان محبت 'برگ نوخیز' کی صورت میں موصول ہوا، لیکن یہ دیکھ کر کہ یہ مجموعہ ہے سانیٹوں کا، پہلی نظر میں ایک وحشت سی پیدا ہوئی۔ اس لیے کہ میں ان لوگوں میں ہوں جو فن اور ادب میں یوروپ کی اندھی تقلید کو ذہنی غلامی سمجھتے ہیں۔ بہرحال بہ اکراہ تمام اس کی ورق گردانی شروع کی۔ لیکن جوں جوں ورق الٹتا گیا میری وحشت رغبت سے بدلتی گئی۔ تقریباً ہر صفحہ رنگین نے میری نگاہوں کو کچھ دیر ٹھہرائے رکھا اور آخر میں یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ تخیل کی ندرت اور فکر کی رعنائی ہر صنف میں اپنی دُنیا آپ بنا سکتی ہے۔ آپ کا دائرہ فکر جو بھی ہو، لیکن آپ ایک عظیم فنکار ہیں۔ فطرت نے آپ کے ذہن کو وہ غیر معمولی روشنی دی ہے جس کی تابش نے جگہ جگہ میری آنکھوں کو چوندھیا دیا۔ رنگ سازی اور معنی آفرینی کا ایسا حسین امتزاج دور جدید کے فن پاروں میں میری نظر سے کہیں نہیں گزرا لیکن آپ کی کہی ہوئی ہر بات سمجھ میں آ گئی۔''[7]

بہرحال اردو کی روایتی شاعری سے ہٹ کر عزیز تمنائی نے سانیٹ صنف میں بھرپور طبع آزمائی کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے کہ دیگر اصناف سخن میں بھی مختلف موضوعات پر آزادانہ طور پر اظہار کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس صنف میں خیالات کے تسلسل اور زبان کی شرینی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سانیٹ لکھے ہیں، عزیز تمنائی کا شمار اردو کے بہترین سانیٹ نگاروں میں ہوتا ہے سانیٹ کے حوالے سے وہ ایک مستند نام ہے۔

عزیز تمنائی کے مجموعے میں سب سے پہلے نعتیہ سانیٹ کو شامل کیا گیا ہے جو 'اعتراف' کے عنوان سے برگ نوخیز میں شامل ہے ملاحظہ فرمائیں۔

تیرے دربار میں پہنچا ہوں بڑی دیر کے بعد
آستاں دیکھے بہت اونچے، بہت پاکیزہ
کھینچ کر لے گئی مجھ کو کشش حسن و جمال
محو نظارہ رہے قلب و نظر، خواب و خیال
میکدہ، بت کدہ، آتش کدہ، گھوم آیا ہوں
سرحد ارض و سماوات کو چوم آیا ہوں
تیرے در لوٹ کے آیا ہوں بڑی دیر کے بعد
میری پیشانی تاباں ہے ابھی دوشیزہ

نغمہ و نور نے نکہت نے مجھے کھینچا تھا
فکر نے فن نے فراست نے مجھے سینچا تھا
عصر حاضر کے تقاضوں نے مجھے دی ترغیب
پھر بھی ہر لمحہ رہا میں تری یادوں کے قریب
تیری رحمت کی جو ہو جائے نظر دیر نہیں
کہتے ہیں تیرے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں

عزیز تمنائی کے اس نعتیہ سانیٹ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں کس طرح سے اعلی اظہار کو اس صنف میں ڈھالا ہے ان کی سانیٹوں میں شعری کیفیت اور فکری صلاحیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

عزیز تمنائی کے سانیٹ 'ابن آدم' کے عنوان سے ملاحظہ فرمایئے۔

صاحبو! میں کوئی درویش نہیں پیر نہیں
کس لیے کشف و کرامات کی امید فضول
نہ ملا میری دعاؤں کو ابھی رنگ قبول
میری باتوں میں ابھی لذت تاثیر نہیں
آہی جاتے ہیں جو کلمات حقائق لب پر
کیف و مستی میں کبھی حالت ہشیاری میں
عالم خواب میں یا عالم بیداری میں
یہ نہ سمجھو کہ ہوں اک ہستی بالائے بشر

ابن آدم ہوں اسی خاک کا پروردہ ہوں
جسکی عظمت سے ہوئے طور بھی فاراں بھی بلند
جس نے پھیلائی سوئے کاہکشاں اپنی کمند
میں اسی خاک کا اک ذرہ آوارہ ہوں
صاحبو! واسطہ سبحہ و زنار نہ دو
ذوق تقدیس کا مارا ہوا انسان سمجھو

عزیز تمنائی کے سانیٹ کے موضوعات کافی دلچسپ ہیں انھوں نے بڑی محنت کے ساتھ انگریزی ادب کی اس صنف کو پورے اہتمام سے اردو میں برتا ہے اور اپنے فن کے وہ نمونے پیش کیے ہیں جس سے ان کے تخلیقی ذہن، جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ اس فن کی بدولت عزیز تمنائی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

حواشی

1. پروفیسر سید احتشام حسین، پیش لفظ، برگ نوخیز، 1963
2. عزیز تمنائی، سانیٹ کا تعارف، برگ نوخیز، 1963
3. ڈاکٹر وزیر آغا، شریک مدیر ادبی دنیا، لاہور، اردو میں سانیٹ، برگ نوخیز، 1963
4. محمود ایاز، حرفے چند، سرہانے کا چراغ، ص ۹
5. پروفیسر سید احتشام حسین، پیش لفظ، برگ نوخیز، 1963
6. علیم صبا نویدی، مرتب جاوید حبیب، ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب، ص 512
7. اقتباس از مکتوب علامہ جمیل مظہری، پٹنہ، 22 اگست 1963

■

Dr.M A Azeez Sohail
TMRS Yakuthpura Boys1
Awaise Function Hall, Mughal Pura
Hyderabad.500002
Telanagana
9110759869

سید بصیر الحسن وفا نقوی

عرفان صدیقی کی شاعری میں عصری مسائل

انسان جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اس کے گرد و پیش لاتعداد مسائل اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ان مسائل کو گہرائی سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ کائنات کا وجود مسائل کے سوا کچھ نہیں لیکن جب وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ یہ مسائل زیادہ تر انسان ہی کے اعمال اور کارناموں کا نتیجہ ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کسی سکے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ جس طرح کسی دوا کا اگر فائدہ ہوتا ہے تو اس کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ انسان اگر کسی کے لیے مشفق، رحم دل اور مخلص ہوتا ہے تو کسی کے لیے وہ سنگ دل اور کرخت لہجے کا مالک ہوتا ہے، وہ کسی سے وفا کرتا ہے تو یہی وفا کسی کی بے وفائی کا سبب بنتی ہے کوئی اس کا دوست ہوتا ہے تو کوئی اس کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ترقی کرتا ہے اور چند خوشیاں اس کے دامن میں آتی ہیں تو یہی خوشیاں اس کے مخالفین اور حاسدین پیدا کر دیتی ہیں۔ اسی طرح کہیں اگر اسے روٹی، کپڑا اور مکان کے سلسلے سے آسودگی ہوتی ہے تو بعض مقامات پر وہ بے گھری کا احساس رکھتا ہے۔ غرض کہ سیکڑوں مسائل ہیں جو اس دنیا میں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ ان سے پوری زندگی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

اہلِ ادب نے مسائلِ حیات کو جس صورت سے سمجھا اور ان کے بارے میں اپنے جو خیالات نثر یا شاعری کی صورت میں پیش کیے وہ بیان کرنا ہر کس و ناکس کے لیے آسان نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف ہمارے نثر نگار بلکہ شعرا نے ہر دور میں اپنے سماج اور اپنے معاشرے کے مسائل کو اپنی تخلیقات میں پر زور طریقے سے پیش کیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر دور کے ادب میں اس وقت کی زندگی کی تصویر کشی نظر آتی ہے جس دور میں وہ ادب تخلیق کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ قدیم ادب ہو، روایتی ادب ہو، ترقی پسند ادب ہو، جدید غزل کا دور ہو یا مابعد جدید ادب ہو۔ جو بھی بڑا شاعر یا فن کار آیا اس نے اپنے مسائل کا ضرور ذکر کیا ہے۔ مثلاً

پیا باج پیالا پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا

(قلی قطب شاہ)

جسے عشق کا تیر کاری لگے   اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

(ولی اورنگ آبادی)

دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا   سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

(سراج اورنگ آبادی)

ہر دور کی زندگی میں عشق کا مسئلہ غالب رہا ہے۔ عشق جہاں زندگی کو خوشیوں اور لذتوں سے بھر دیتا ہے وہیں محبوب کا فراق عاشق کے لیے قیامت بن جاتا ہے گویا کہ ہجر ایک بڑے مسئلے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان قدیم شعرا میں قلی قطب شاہ اور ولی اورنگ آبادی کے اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ عشق بھی ایک مسئلہ ہے۔ سراج اورنگ آبادی کا شعر زندگی کے دیگر مسئلے کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ وہ منافقت پر کاری ضرب لگاتا ہے اور انسان کی یکرنگی پر زور دیتا ہے۔

زندگی کے مسائل روایتی اور کلاسیکی شعرا کے یہاں بھی بخوبی نظر آتے ہیں۔ مثلاً

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی   چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

(میر تقی میر)

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی   اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

مرزا محمد رفیع سودا

سرکشی شمع کی لگتی نہیں گر ان کو بری   لوگ کیوں بزم میں گل گیر لیے پھرتے ہیں

(شیخ امام بخش ناسخ)

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا   زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

(حیدر علی آتش)

شاعری علامتوں اور استعاروں کے توسل سے اپنی بات کہتی ہے تاکہ شاعر کا شعر اپنے دور کے مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے ہر دور میں صادق اتر سکے۔ یہاں میر کا شعر اس بات کا گواہ ہے کہ جہاں اس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کی تکلیف بیان کرتے ہیں وہیں یہ شعر ہر دور میں سچا ٹھہر سکتا ہے کیوں کہ بعض دفعہ انسان مجبور ہوتا ہے وہ وہی کہتا ہے جو اس کا مالک یا آقا و سردار چاہتا ہے۔ گویا کہ ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہے۔ سودا کا شعر بھی ایک مسئلہ بیان کرتا ہے کہ بعض دفعہ نااہل حضرات اعزاز سے نوازے جاتے ہیں اور مستحقین اپنے حق کے لیے ترستے ہیں۔ اگر کوئی اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے تو اس کی آواز مخالفین کو گراں گزرتی ہے چاہے وہ زبان سے کہیں یا نہ کہیں لیکن

ان کا عمل اس بات کا شاہد ہوتا ہے کہ وہ اپنے خلاف اٹھتی ہوئی آوازوں سے خائف ہیں۔اس مسئلے کو ناسخ کا شعر ظاہر کرتا ہے۔اسی طرح کبھی کبھی حق چاہنے والوں کی زبان کسی وجہ سے گنگ ہوجاتی ہے تو وہ چاہتے ہیں کہ دوسرا کوئی شخص ان کی بات صاحبِ اقتدار تک پہنچا دے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بعض مرتبہ پیامبر نصیب نہیں ہوتا اور مستحق محروم رہ جاتا ہے۔یہ مسئلہ آتش کے شعر میں نمایاں ہے۔اسی طرح غالب اور ان کے ہمعصر شعرا کے یہاں بھی سیکڑوں مسائلِ زندگی نظر آتے ہیں۔مثلاً

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن خاں مومن

غالب کا شعر جہاں بے گھری کے مسئلے کو اٹھاتا ہے وہیں مومن کا شعر بے وفائی اور احسان فراموشی کی بات کرتا ہے۔

ہمیں مسائلِ زندگی نہ صرف قدیم اور کلاسیکل شعرا کے یہاں نظر آتے ہیں بلکہ ترقی پسند شعرا کے یہاں تو ان مسائل کی گونج اپنے پچھلے ادوار سے زیادہ پر زور نظر آتی ہے۔مثلاً

اک صبح ہے جو ہوئی نہیں ہے اک رات ہے جو کٹی نہیں ہے
مقتولوں کا قحط پڑ نہ جائے قاتل کی کوئی کمی نہیں ہے

(علی سردار جعفری)

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو

(کیفی اعظمی)

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

(فیض احمد فیض)

دل کا یہ حال کہ دھڑکے ہی چلا جاتا ہے ایسا لگتا ہے کوئی جرم ہوا ہے مجھ سے

(جاں نثار اختر)

یہاں علی سردار جعفری کے اشعار اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ بظاہر دنیا خوش معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا ہے نہیں یہاں قدم قدم پر قاتل نظر آتے ہیں انھیں ڈر ہے کہ کہیں مقتول کم نہ پڑ جائیں یعنی ظلم و جور حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے۔معین احسن جذبی کے شعر میں ایک مایوسی کی لہر صاف دیکھی جا سکتی ہے جو کسی مرحلے کی ناکامی کے نتیجے میں ہوسکتی ہے۔کیفی اعظمی جھوٹی ہنسی کی نشاندہی کرتے ہیں۔جب کہ فیض بھی ناکامی کا ذکر کرتے ہیں لیکن امید ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔جاں نثار اختر کسی مرحلے کی فکر کی تکلیف کا بیان کرتے ہیں۔انھیں لگتا ہے کسی بات کی حد سے زیادہ فکر بے گناہ کو بھی احساسِ گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اسی طرح جدید غزل گو شعرا بھی عصری زندگی کے مسائل کو فراموش نہیں کرتے۔ان کے یہاں ان مسائل کی نوعیت اپنے ماقبل شعرا سے منفرد نظر آتی ہے اس میں فرد کی تکلیف واحساسات اور اس کے مسائل پر زیادہ زور ملتا ہے۔مثلاً:

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

(شکیب جلالی)

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

(ظفر اقبال)

پھر مرے انتظار میں مری نیند میرے بستر پہ جاگتی ہوگی

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

(افتخار عارف)

شکیب جلالی،ظفر اقبال اور محمد علوی کے اشعار میں فرد کی تنہائی کا ذکر ہے جو زندگی کا اہم مسئلہ ہے کبھی کبھی انسان انجمن میں رہ کر بھی خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے یا اس کا جب کوئی احوال نہیں پوچھتا تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وجود بے معنی ہے۔خلیل الرحمٰن اعظمی اور بشیر بدر کے اشعار انسان کی تگ ودو، بھاگ دوڑ اور معاش کے لیے جد و جہد کا ذکر کرتے ہیں۔جب کہ افتخار عارف گھر کے ماحول کو دیکھ کر یہ دعا کرتے ہیں کہ ان کا گھر اصل معنی میں گھر ہو جائے۔

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ شاعری یا غزل کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں غزل نے اپنے عصری مسائل نہ بیان کیے ہوں۔اب جبکہ مابعد جدیدیت کا دور ہے۔ان کے دامن میں جہاں قدامت کی چاشنی،کلاسیکی غزل کی خوشبو،ترقی پسند شعرا کے نعرے اور جدید غزل کے فرد کا کرب ہے، وہیں وہ نئی نئی تراکیب وتشبیہات کے ساتھ ساتھ نئی نئی علامتوں کو تراشتے ہوئے غزل میں اپنے دور کی سچائی یعنی زندگی کے مسائل کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔مثلاً

ہر گلی کوچے میں رونے کی صدا میری ہے شہر میں جو بھی ہوا ہے وہ خطا میری ہے

(فرحت احساس)

ندی کنارے کھڑا پیڑ سوچ میں گم ہے کوئی بھنور اسے برباد کر نہ جائے کہیں

(اسعد بدایونی)

دھند میں کھوتے ہیں منظر سارے بیچ در بیچ دھواں ہوتا ہے

(جمال اویسی)

ان کے بھی ظلم کا الزام ہمارے سر ہے جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

(عباس تابش)

فرحت احساس کا شعر اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ سماج کتنا پرآشوب ہے اور اس کے باوجود اس کا اصل سبب فراموش کیا جا رہا ہے۔اسعد بدایونی کے شعر میں پیڑ انسان کی علامت بن کر سامنے آتا ہے جسے معمولی سا حادثہ بھی زیرِ زمین پہنچا سکتا ہے۔جمال اویسی کا شعر عصرِ حاضر میں معدوم ہوتی حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے،جبکہ عباس تابش شعر میں بیان کرتے ہیں کہ جو لوگ ہم پر ظلم کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور ہمت ہار جاتے ہیں تو ان کی ناکامی کا الزام بھی ہمارے ہی سر آتا ہے۔

اسی طرح مابعد جدیدیت سے منسلک متعدد شعرا اپنے اپنے طریقے سے اپنی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اپنی غزل میں پیش کر رہے ہیں لیکن ان تمام آوازوں میں عرفان صدیقی کی آواز سب سے منفرد ہے۔ان کے یہاں اس سلسلے سے بالکل ایک نئی روش نظر آتی ہے۔وہ طرح طرح سے اپنے عصر کی تصویروں کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کی غزل قدامت پسندی سے دور نئی اور تازہ ہواؤں کا پیغام لاتی ہے۔بقول شارب ردولوی:

”عرفان صدیقی کی شاعری اپنے عہد کی معتبر آواز ہے۔ایک ایسی آواز جس نے غزل کو فکر واظہار کی نئی وسعتیں دیں اور جدید شاعری جو تنہائی،اداسی،اندرونی شکست و ریخت،حقیقتوں سے فرار سماجی اور تہذیبی قدروں سے انحراف کی علامت تھی،اسے عصری حسیت اور تازہ کار افکار سے اعتبار بخشا۔“

(شہرِ ملال: کلیاتِ عرفان صدیقی،مرتب: سید محمد اشرف،عرشیہ پبلی کیشنز،دہلی)

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ عرفان صدیقی اپنے ہمعصر شعرا کی بھیڑ میں صاف پہچانے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے عصر کے مسائل پر گہری نگاہ رکھتے ہیں ان کا مشاہدہ نہایت عمیق ہے۔ وہ اپنی زندگی اپنے تجربات اور اپنی روزمرہ کی زندگی کو مختلف علامتوں اور استعارات کے جامے میں پیش کرنے کا فن بہترین طریقے سے جانتے ہیں۔ مثلاً دیکھا جائے اور محسوس کیا جائے تو آج کے دور میں سماجی تعلقات کم سے کم ہوتے جارہے ہیں لوگ بے حسی کا لبادہ اوڑھے ہوئے معاشرے کی بدحالی دیکھتے رہتے ہیں اور افسوس نہیں کرتے۔ عرفان صدیقی کہتے ہیں۔

زمیں پر شورِ محشر روز و شب ہوتا ہی رہتا ہے
ہم اپنے گیت گائیں یہ تو سب ہوتا ہی رہتا ہے

یعنی آج کا انسان اپنے آپ میں گم ہے وہ کسی کے رنج و غم میں اس کی مدد نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ جن افراد کو کسی زمانے میں خدمتِ خلق کا دعویٰ تھا وہ بھی خاموش ہیں۔

آج تک اہلِ ستم ہی سے شکایت تھی مجھے — اب مرے باب میں ہیں اہلِ وفا بھی خاموش

گویا کہ کسی کے دکھ میں ساتھ نہ دینا آج کے دور کا ایک اہم مسئلہ ہے یعنی چاروں جانب ایک نفسانفسی کا عالم۔ شعر ہے۔

نہیں تھا میں بھی اتنا بے تعلق — کہ تو بھی بے خبر ایسا نہیں تھا

اور اگر کوئی کسی کو پوچھتا بھی ہے تو اس کے پیچھے مفاد ہوتے ہیں۔ گویا کہ آج کی زندگی میں انسان چہرہ بدلنے میں ماہر ہو چکا ہے۔

تم سرِ دشت و چمن مجھ کو کہاں ڈھونڈتے ہو — میں تو ہر رت میں بدل دیتا ہوں پیکر اپنے

انسان کا قدم قدم پر بدلنا اور مختلف رنگ اختیار کرنا سادہ لوح طبیعت رکھنے والوں کے لیے ایک دھوکہ اور فریب کا عمل انجام دیتا ہے۔ عرفان صدیقی کہتے ہیں۔

میں نے کی تھی صفِ اعدا سے مبارز طلبی — تیر لیکن صفِ یاراں سے نکل آیا ہے

یعنی اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سادہ لوح جس پر بھروسہ کرتا ہے وہی فریب دیتا ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو سوال بنتا ہے کہ۔

واقعی کیا اسی قاتل کی طرف تو بھی ہے — تو بھی ہے اے مری جاں تیغ بکف تو بھی ہے

یعنی جب کوئی اپنا ہی تیغ بکف ہوتا ہے تو ایک لمحے کو تعجب ہونا واجبی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سماج میں بظاہر ہمدرد و آشنا افراد بھی دلوں میں ایک دوسرے کے لیے وہ احساس نہیں رکھتے جو ظاہر کرتے ہیں۔

کھلا کہ وہ بھی کچھ ایسا وفا پرست نہ تھا — چلو یہ بوجھ بھی سینے سے ہٹ گیا آخر

لیکن کبھی کبھی اس جہان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض افراد مروت یا مصلحت کو محبت سمجھنے لگتے ہیں جب کہ ایسا نہیں ہوتا۔ شعر ہے۔

مروتوں پہ وفا کا گماں بھی رکھتا تھا — وہ آدمی تھا غلط فہمیاں بھی رکھتا تھا

اور اگر بظاہر کوئی محبت بھی کرے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبت کسی خاص مدت تک قائم رہتی ہے اور زندگی انسان کو ضرورتوں اور مسائل میں اس قدر گرفتار کر دیتی ہے کہ محبت کی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ عرفان صدیقی اس بات کو علامتوں کے ذریعے اس طرح کہتے ہیں۔

بڑھا کے ربطِ وفا اجنبی پرندوں سے — وہ ہنس اپنے وطن کو پلٹ گیا آخر

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی کتنا ہی سمجھدار یا جہاں دیدہ کیوں نہ ہو وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کے دامِ فریب میں ضرور آتا ہے۔ شعر ہے۔

کہیں تو لٹنا ہے پھر نقدِ جاں بچانا کیا — اب آگئے ہیں تو مقتل سے بچ کے جانا کیا

یعنی عرفان صدیقی کا خیال ہے کہ کبھی کبھی فریب کھانے والا بخوبی جانتا ہے کہ اسے فریب دیا جارہا ہے لیکن وہ پھر بھی کچھ سوچ کر خاموش رہتا ہے۔

دھوکہ اور فریب صرف فرد کی ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ جب صاحبِ اقتدار افراد بھی سماج اور عوام کی توقعات پر کھرے نہیں اترتے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام کو ٹھگا گیا ہے۔ ہم اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سیاست میں ایک دوسرے کی نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے جس سے عوام میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور قلبی و ذہنی سکون کا فقدان ہوتا ہے۔

لیکن کسی ملک کے سیاسی و سماجی حالات ایک دم تبدیل نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے بھی ایک فکر کارفرما ہوتی ہے۔ شعر ہے۔

اچانک دوستو میرے وطن میں کچھ نہیں ہوتا — یہاں ہوتا ہے ہر اک حادثہ آہستہ آہستہ

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاسی و سماجی حالات کے زیرِ اثر عوام بھی اس طرف کو چل پڑتے ہیں جس طرف کی ہوا چلنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ شعر ہے۔

اب زباں خنجرِ قاتل کی ثنا کرتی ہے — ہم وہی کرتے ہیں جو خلقِ خدا کرتی ہے

لیکن صرف سیاست کو ہی بدلتے ہوئے معاشرے کا سبب ماننا مناسب نہیں بلکہ سماج کے مسائل اور پریشانیوں کی ذمے داری ان پر بھی ہوتی ہے جو احتجاج نہیں کرتے۔

بہت کچھ دوستو بسمل کے چپ رہنے سے ہوتا ہے
فقط اس خنجرِ دستِ جفا سے کچھ نہیں ہوتا

کسی جرم کے خلاف آواز نہ اٹھانا مجرم کے حوصلے بلند کر دیتا ہے جس کی وجہ سے سماج میں فساد اور تشدد عام ہو جاتا ہے۔ عرفان صدیقی کہتے ہیں۔

آگ جلتی چھوڑ آئے ہو تو اب کیا فکر ہے — جانے کتنے شہر یہ پاگل ہوا روشن کرے

ایسا نہیں کہ فساد برپا کرنے والوں کا کچھ نقصان نہیں ہوتا کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب فساد یا تشدد شدت اختیار کرتا ہے تو وہ بھی اس کی زد میں کسی نہ کسی صورت آ ہی جاتے ہیں جن کی وجہ سے شہر میں فساد پیدا ہوا تھا۔ شعر ہے۔

یہ شہر پھونکنے والے کسی کے دوست نہیں — کسے خیال کہ تیرا مکان بیچ میں ہے

انسان کی زندگی کا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ مجرم کبھی کبھی صاف بچ جاتا ہے اور انصاف دب کر رہ جاتا ہے۔ فساد کرنے والے ہی بعض دفعہ صاحبِ مسند و اعزاز نظر آتے ہیں۔ شعر ہے۔

اب ایسے شخص کو قاتل کہیں تو کیسے کہیں — لہو کا کوئی نشاں اس کی آستیں پہ نہیں

ایسے ماحول میں حساس طبیعت رکھنے والے باشعور کو کہنا ہی پڑتا ہے۔

حق فتحیاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا — تو نے کہا تھا تیرا کہا کیوں نہیں ہوا

جب بظاہر تشدد ختم ہوتا ہے تو لوگوں میں امن و امان کی کوششوں کے باوجود فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں جنھیں ختم کرنا آسان نہیں ہوتا۔

تشدد اور فسادات افراد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے اور نقلِ مکانی پر آمادہ کرتے ہیں کیوں کہ ان کے سامنے اس سلسلے سے زندگی کئی مسائل کھڑے کر دیتی ہے جس میں روزگار کے ساتھ ساتھ وہ قلبی سکون کے بھی متلاشی رہتے ہیں۔ عرفان صدیقی ان مسائل کو طرح طرح کی علامتوں کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

پرندوں کی قطاریں اُڑ نہیں جاتیں تو کیا کرتیں — ہماری بستیوں میں خشک جھیلوں کے سوا کیا تھا

یعنی انسان کے لیے جہاں نہ معیشت کے ذرائع ہوں اور نہ سکون ہو وہ وہاں سے ہجرت کرنا ہی مناسب سمجھتا ہے۔ اور جب کوئی کسی کو اس سلسلے سے روکنے والا نہ ہو تو صاحبِ حس شخص کو کہنا ہی پڑتا ہے۔

کیسی مٹی ہے کہ دامن سے لپٹتی ہی نہیں — کیسی ماں ہے کہ جو بچوں کو جدا کرتی ہے

لیکن نقلِ مکانی آسان نہیں ہوتی انسان کا ماضی اس کو روکنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔

اور اگر کوئی دل پر پتھر رکھ کر اپنے گھر کی چوکھٹ کو الوداع کہتا بھی ہے تو بھی وہ اپنے گھر سے دور نہیں جا پاتا اور اپنے آپ کو مسافر ہونے کے باوجود گھر میں محسوس کرتا ہے۔شعر ہے۔

قدم اٹھے تو گلی سے گلی نکلتی رہی　　　نظر دیے کی طرح چوکھٹوں پہ جلتی رہی

اور زندگی بھر اسے ماضی کی صدا گھر کی جانب بلاتی ہی رہتی ہے۔

تم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہو آزاد　　　شام ہونے کو ہے،اب گھر کی طرف لوٹ چلو

اور جب وہ گھر یا وطن لوٹنے کا ارادہ کرتا ہے تو بہت دیر ہو جاتی ہے اور اس کا وطن بھی اسے اجنبی سمجھتا ہے۔

اجنبی جان کے کیا نام ونشاں پوچھتے ہو　　　بھائی ہم بھی اسی بستی کے نکالے ہوئے ہیں

وطن کو لوٹنے والا شخص اپنے ماضی میں جینا چاہتا ہے اپنے گزرے ہوئے زمانے کے ماحول کو تلاشتہ ہے بچپن کے ساتھیوں اور دوستوں کو ڈھونڈتا ہے لیکن وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔شعر ہے۔

مکان چھوڑ گئے لوگ،ڈھونڈتے ہو کسے　　　کوئی ستارہ اب اس بامِ انجمیں پہ نہیں

تشدد وفساد کے علاوہ زندگی میں دیگر مسائل بھی نظر آتے ہیں مثلاً اشیاء کا بحران یا کسی چیز کی کمی یا کسی تمنا کا پائے تکمیل تک نہ پہنچنا یا روزگار مہیا نہ ہونا۔یہ تمام مسائل بھی زندگی کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ہیں۔شعر ہے۔

مجھے الجھا دیا دانش کدوں نے صرف خوابوں میں
کوئی تعبیر رکھ دو میرے بچوں کی کتابوں میں

یعنی تعلیم گاہوں اور دانش کدوں میں صرف سنہرے خواب تو دکھائے جاسکتے ہیں کہ انسان فلاں ڈگری حاصل کر کے اتنا کما سکتا ہے یا برسرِ روزگار ہو سکتا ہے لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں اور کبھی کبھی ایک پڑھے لکھے انسان کو اپنے خاندان کی کفالت بھی مشکل ہو جاتی ہے اور جب آسودگی اور خوشحالی کی تمنا میں مدت گزر جاتی ہے تو انسان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسان کی ناآسودگی اور معاشی پریشانیاں اسے مستقبل کی فکر کا شکار بنا دیتی ہیں۔

شاید کہ اتر آئے سوا نیزے پہ سورج　　　کل کے لیے کچھ سایۂ دیوار بچائیں

یعنی عرفان صدیقی کا خیال ہے کہ عصرِ حاضر میں کوئی ایسا نہیں جسے مستقبل کی فکر نہ ہو کیوں کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے مستقبل میں زندگی اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے اور اسے کس چیز کی اشد ضرورت ہو جائے۔

حد سے زیادہ مستقبل کی فکر انسان کے لیے ذہنی تناؤ کا باعث بن جاتی ہے اور وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو کر بہت سے نفسیاتی امراض سے دوچار ہو جاتا ہے۔انسان پریشانیوں کے عالم میں یہ بھی سوچتا ہے کہ وہ کب تک کرب اور بے چینی کے عالم میں رہے گا کیوں کہ ہر چیز کی ایک انتہا ہے۔

ہوا کی زد پہ ہمارا سفر ہے کتنی دیر　　　چراغ ہم کس شامِ زوال ہی کے تو ہیں

مایوس کن انسان کو ہر جگہ مایوسی ہی نظر آتی ہے وہ دوسروں کو بھی دیکھتا ہے تو ان میں بھی اپنی ہی کیفیت محسوس کرتا ہے۔

تو یہ نہ دیکھ کے سب ٹہنیاں سلامت ہیں　　　کہ یہ درخت تھا اور پتیاں بھی رکھتا تھا

دھنک سے پھول سے برگِ حنا سے کچھ نہیں ہوتا　　　بدن صحرا ہوئے آب وہوا سے کچھ نہیں ہوتا

ظاہر ہے مندرجہ بالا اشعار میں ایک ایسے سماج کی عکاسی ہے جس میں کوئی آسودہ حال نہیں ہر شخص کسی نہ کسی طرح اپنے ماضی سے مختلف ہے۔

کبھی کبھی فکر واحساس کسی ایک فرد کا نہیں رہتا بلکہ پورا خاندان ایک ہی عذاب میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔شعر ہے۔

اگلے دن کیا ہونے والا تھا کہ اب تک یاد ہے　　　انتظارِ صبح میں وہ سارے گھر کا جاگنا

انسان کی زندگی میں جب آسودگی نہیں ہوتی تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے ملاقاتیں بند کر دیتا ہے اور تنہائی پسند ہو جاتا ہے اور اگر بحالتِ مجبوری کسی انجمن میں جاتا بھی ہے تو وہاں بھی خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے:

طاقِ تنہائی سے اٹھتا تھا چراغوں کا دھواں　　　اور مرے ہونے سے مجھ کو آشنا کرتا تھا رات

اپنے آنگن ہی میں تھا،راہ گزر میں کیا تھا　　　ایسا تنہا تھا میں باہر بھی کہ گھر میں کیا تھا

میں اس ہجوم میں کیوں اس قدر اکیلا ہوں　　　کہ جمع ہو کے بھی میزان میں نہیں آتا

مندرجہ بالا اشعار میں ظاہر ہے کہ تنہائی اور اکیلا پن جس طرح نمایاں ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ تنہائی کے عالم میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور وہ کس طرح خود کلامی کرتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

ایسا نہیں کہ انسان کی زندگی میں تنہائی ہی صرف ایک اہم مسئلہ ہے بلکہ اس کی شہری زندگی بھی اس کے لیے مسائل کا باعث بنتی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی اور دوسری وجوہات سے میدان اور جنگلات ختم ہوتے جا رہے ہیں گاؤں شہر میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

جنگلوں میں شہر در آئے ہیں خوشحالی لیے　　　پیڑ گملوں میں سمٹ جائیں گے ہریالی لیے

یعنی انسانی زندگی کے لیے ہریالی اور پیڑوں کا ہونا بہت ضروری ہے جن کا جنگلات مظہر ہیں لیکن انسان شہر بسانے کی ہوس میں جنگلوں کو ختم کر رہا ہے۔

بڑھتی آبادی اور فیکٹریوں،کارخانوں اور موٹر گاڑیوں کے شور شرابے اور دھوئیں نے شہروں کی فضا کو جس طرح آلودہ کیا ہے اس سے عصرِ حاضر میں کوئی ناواقف نہیں یعنی یہ بھی زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔عرفان صدیقی کہتے ہیں۔

در و دیوار کی زد سے نکلنا چاہتا ہوں میں　　　ہوائے تازہ تیرے ساتھ چلنا چاہتا ہوں میں

شہر میں ہر شخص بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے۔وہ کہیں تجارت کرتا ہے تو کہیں کسی کی نوکری کرتا ہے اور صبح کا نکلا دیر رات کو تھکن کے ساتھ اپنے گھر لوٹتا ہے۔عرفان صدیقی اس مضمون کو نہایت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔

دروازوں پر دن بھر کی تھکن تحریر ہوئی　　　مرے شہر کی شب ہر چوکھٹ کی زنجیر ہوئی

اس کے علاوہ معاشرے میں پھیلی ہوئی فحاشی بھی ایک مسئلہ ہے جس کے باعث نہ صرف نوجوان بلکہ سن رسیدہ بھی بے راہ روی کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں۔قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا ہے کہ انسان فحاشی اور گندگی میں ملوث ہے لیکن اسے اس بات کا احساس نہیں کہ دنیا اس کی وجہ سے کتنی پستی میں جا رہی ہے۔شعر ہے۔

جو دیکھ لے وہ برہنہ دکھائی دینے لگے　　　عجیب طرح کی تصویر میگزین میں ہے

یعنی میگزین،رسائل،اخبارات،اشتہارات غرض کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں برہنگی موجود نہ ہو اب ایسے ماحول میں انسان کا جذبات پر قابو پا لینا آسان نہیں۔

غرض کہ عرفان صدیقی کی غزل میں قدم قدم پر عصری حسیت کا احساس ہوتا ہے۔ان کے یہاں عصری مسائل جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔لیکن ایسا نہیں کہ وہ صرف مسئلہ ہی بنے رہتے ہیں بلکہ ان کے پیچھے ایک پیغام بھی نظر آتا ہے اور ان کے حل کرنے کا راستہ بھی تاکہ انسان کسی طرح عصری مسائل سے ابھر کر اپنی زندگی کی روش کو باغ و بہار بنا سکے۔

■

Syed Baseerul Hasan Wafa Naqvi
Hilal House, H.No.4/114, Nagla Mallah Civil lines
Aligarh- 202002 (UP) Mob.: 9219782014

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

مہ نور زمانی

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ریاست کرناٹک کی وہ قابلِ قدر ہستی ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقا اور فروغ کے لیے کئی محاذوں پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ ایک پُروقار اور مہذب،انتہائی ذمے دار اور بصیرت افروز خیالات کی مالک شخصیت تھیں۔ 1974 میں بنگلور میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا تو بحیثیت لکچر ریہاں پر خدمات انجام دیتی رہیں اور پھر 1978 میں شعبے کی بانی ڈاکٹر آمنہ خاتون کی سبکدوشی کے بعد، 1979 میں ریڈر اور صدرِ شعبہ کے عہدے پر فائز ہوکر انھوں نے شعبے کو پوری تن دہی کے ساتھ ترقی کی راہوں پر گامزن کر دیا۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم 1982 تا 1994 فروغ اردو کے سب سے بڑے سرکاری ادارے 'ترقی اردو بیورو' دہلی، کی ڈائرکٹر اور 1994 تا 1996 قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، کی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھیں۔ 1997 میں اس عہدے سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے بنگلور میں قیام اختیار کرلیا تھا۔ 27 دسمبر 2022 کی صبح بعد نماز فجر وہ اس دارفانی سے کوچ کر کے مالک حقیقی سے جاملیں۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ریاست کرناٹک کی وہ قابل قدر ہستی ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقا اور فروغ کے لیے کئی محاذوں پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ ایک پُروقار اور مہذب، انتہائی ذمے دار اور بصیرت افروز خیالات کی مالک شخصیت تھیں۔ 1974 میں بنگلور میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا تو بحیثیت لکچرر یہاں پر خدمات انجام دیتی رہیں اور پھر 1978 میں شعبے کی بانی ڈاکٹر آمنہ خاتون کی سبکدوشی کے بعد، 1979 میں ریڈر اور صدرِ شعبہ کے عہدے پر فائز ہوکر انھوں نے شعبے کو پوری تن دہی کے ساتھ ترقی کی راہوں پر گامزن کردیا۔ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کے ذوق و شوق کو نکھارنے میں ہر طرح سے ان کی مدد کرتی تھیں۔ شعبے میں انھوں نے کئی ایسے اقدامات عمل میں لائے تھے جن سے طلبا میں اردو زبان و ادب سے دلچسپی کو روز افزوں بڑھاوا ملتا رہا۔ وہ ہمیشہ سے بے انتہا محنتی اور ایک فعال اور متحرک ہستی کے طور پر اپنا لوہا منواتی رہیں۔ ان کی متانت، سنجیدگی، محبت بھرا لہجہ، خلوص اور سلجھا ہوا اندازِ گفتگو سب کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ ان کے طریقۂ تدریس میں بھی ایک جادو کی سی کیفیت تھی جس کے طفیل سبھی شاگردان کے گرویدہ تھے۔ سنہ 1974 تا سنہ 1982 نو سال کے عرصے تک، شعبۂ اردو، بنگلور یونیورسٹی میں تدریس کے دوران ان کی بے لوث اور قائدانہ صلاحیتوں نے یونیورسٹی کے حکام کو بھی اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے کیمپس کے بچوں کے اسکول کی صدارت اور لڑکیوں کے ہاسٹل کی وارڈن شپ کی ذمے داریاں بھی بصد اصرار انھیں سونپ دی تھیں اور ڈاکٹر صاحبہ نے ان تمام ذمہ داریوں کو نبھانے میں کبھی کوتاہی نہیں برتی۔ شعبے کی صدارت کے ساتھ ہی 1980 میں جب اردو اکادمی کی صدارت کے لیے بھی انھیں نامزد کیا گیا تو انھوں نے وہاں پر ایک ادبی رسالے 'فصیل' کا اجرا کیا، اردو شعرا اور ادیبوں کی تصانیف کو شائع کروانے کا اہتمام کیا اور ایم اے اردو میں داخلہ لینے والے تمام طلبہ کے لیے اکادمی سے اسکالرشپ فراہم کرنے کا انتظام بھی کیا۔ 1981 میں یو پی ایس سی کی طرف سے ترقی اردو بیورو کے ڈائرکٹر کے عہدے کے لیے اعلان کیا گیا تو انھوں نے بھی درخواست بھری اور جب وہ 1982 میں ترقیِ اردو بیورو کی چیئر پرسن کے عہدے پر فائز ہوکر دلّی چلی گئیں تو چونکہ ان کی نگرانی منسوخ نہیں کی جاسکتی تھی، وہ اپنی نگرانی میں تحقیقی کام کر رہے طلبا کے لیے وہیں سے ہدایات دیتی رہتیں اور جب بھی بنگلور آتیں ان سے ملاقات کے لیے ضرور وقت فراہم کرتیں۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی پیدائش 12 جون 1938 کو ریاست کرناٹک کے شہر رام نگرم میں ہوئی، والد عبدالکریم صوفی منش انسان تھے۔ والدہ صغیرالنساء بیگم میسور کے ضلع تمکور کے ایک مقام کنیگل سے تھیں اور لاہور سے ادیب کامل اور ادیب فاضل کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر

کے میسور میں ہائی اسکول ٹیچر کے عہدے پر فائز تھیں۔علم وادب کا کافی ذوق رکھتی تھیں جس کا ثبوت ان کی تصنیف 'غزلیات غالب کا عروضی تجزیہ' کے روپ میں ہمیں مل جاتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے پانچ بھائی اور چار بہنوں، سبھی کو اعلیٰ تعلیم سے مزین کیا اور وہ سبھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ڈاکٹر صاحبہ کے ایک بھائی ڈاکٹر محمد نورالدین سعید اردو کے محقق ہیں اور بنگلور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے پرائمری اور ثانوی تعلیم شہر میسور میں حاصل کی۔ 1960 میں مہاراجہ کالج، میسور سے بی اے آنرس میں اول درجے میں کامیابی حاصل کر کے 1961 میں میسور یونیورسٹی میں ایم اے اردو میں داخلہ لےلیااوراس میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کرکے انھوں نے 1963 میں پروفیسر ڈاکٹر حبیب النسا بیگم کی نگرانی میں 'ریاست میسور میں اردو مثنوی کا ارتقا' کے موضوع پر تحقیق کرنا شروع کردیا۔ 1966 میں بحیثیت لکچرر، مہارانیس کالج میسور میں ان کا تقرر ہوگیا لیکن ابھی سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ 1967 میں انھیں کامن ویلتھ اسکالرشپ کا وظیفہ مل گیا۔اسی دوران 1967 میں ایم اے اکنامکس کے گولڈ میڈل یافتہ محمد خلیل احمد سے ان کی شادی ہوئی، شادی کے پندرہ دن بعد ہی وہ اسکالرشپ کی منظوری کے تحت لندن چلی گئیں اور لندن میں اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز میں داخلہ لے کر لسانیات اور صوتیات میں تعلیم حاصل کی۔ تین سال تک رائل ایشاٹک سوسائٹی لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری، انگلینڈ، میں اپنے تحقیقی موضوع سے متعلق تلاش وجستجو کے مراحل سر کرتی رہیں اور بہت سا ایسا مواد حاصل کرلیا جو ہندوستان کی لائبریریوں میں موجود نہیں تھا، شیخ محمود خوش دہاں کی مثنوی 'وجود نامہ' اور عہد ٹیپو سلطان کے شاعر قاسم کی مثنوی 'عروس المجلس' وغیرہ چند ایسی مثنویوں کو انھوں نے کھوج نکالا جو ادبی دنیا سے تعارف کی محتاج تھیں۔ 1970 میں انگلینڈ سے واپسی کے بعد انھوں نے 1974 تک جے ایس ایس کالج، چامراج نگر، آرٹس اینڈ سائنس کالج بھٹکل اور پرنٹشل کالج شیموگہ میں بطور اردو لکچرر تدریسی خدمات انجام دیں۔ اسی دوران اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل کرکے میسور یونیورسٹی میں اپنا مقالہ پیش کیا جس کے لیے 1973 میں انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوگئی، یہ میسور یونیورسٹی ہی کی نہیں بلکہ ریاست کی دیگر یونیورسٹیوں کی ڈاکٹریٹ کی اولین ڈگری تھی۔

ڈاکٹر فہمیدہ صاحبہ کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ بڑی انکساری سے خاموشی کے ساتھ سارے کام انجام دیتی تھیں۔ انھیں دکنی ادب خصوصاً دکنی مثنویوں کے مطالعے میں بے حد دلچسپی تھی اور ان کے لسانیاتی پہلوؤں کی تلاش اِن کی توجہ کا مرکز تھی۔انھوں نے اپنی تحقیقی دلچسپیوں کے ذوق کو اپنے شاگردوں کے دلوں میں بھی کامیابی کے ساتھ منتقل کردیا تھا۔لہٰذا کسی سے دکنی مثنویوں میں منظر نگاری پر کام کروایا تھا تو کسی کو غواصی کی مثنویوں پر تحقیق کرنے کا مشورہ دیا تھا اور کسی کو جنوبی ہند کی تصوفانہ مثنویوں پر تحقیق کی راہ پر لگا دیا تھا۔انھیں اپنے شاگردوں کی یا یوں کہیے کہ اپنے دائرہ کار میں موجود افراد کی، صلاحیتوں کو اچھی طرح سے پہچان کر انھیں بروئے کار لانے اور پنپنے کے مواقع فراہم کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا، دختر نے اکنامکس میں ایم اے کی سند حاصل کرلی تو ان کے دونوں لڑکوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کی سند حاصل کرلی۔

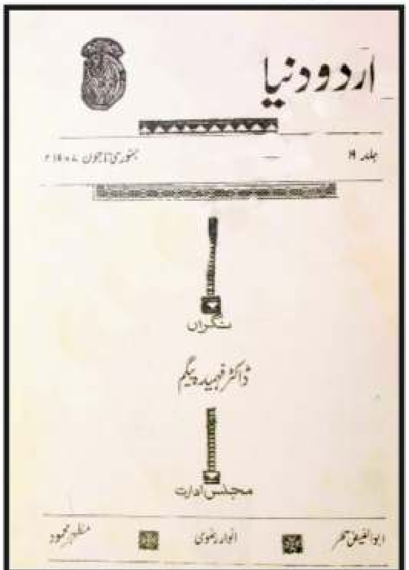

جب ڈاکٹر صاحبہ ترقی اردو بیورو میں ڈائرکٹر مقرر ہوئیں تو وہاں بھی انھوں نے سنجیدگی کے ساتھ بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ایک تو اردو ٹیلی پرنٹر کی ابتدا کا ڈول ڈالا جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کیے گئے اقدامات کے ثبوت ہمیں اس وقت کے اخبارات کے تراشوں میں مل جاتے ہیں۔دوسرے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے قیام کو روبہ عمل لانے کے سلسلے میں کئی بنیادی کام انجام دیے اور جو بھی ضروری سہولتیں درکار تھیں انھیں مہیا کرنے کے پورے جتن کیے۔ستمبر 1 1982 کے روزنامہ منصف حیدرآباد میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ 'ایک اردو یونیورسٹی کے امکانی قیام کے پیش نظر ترقی اردو بورڈ اکنامکس، پولیٹکل سائنس اور طب جیسے موضوعات کو اردو کا جامہ پہناتے ہوئے کتابوں کی تیاری میں مصروف ہے۔ علاوہ ازیں ترقی اردو بورڈ ڈکشنری کی اشاعت کا اہتمام بھی کر رہا ہے تا کہ اردو والوں کو ہندی کے ثقیل الفاظ کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو، ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے آج شام روزنامہ منصف میں ان کے اعزاز میں منعقدہ ایک تقریب میں خطاب کے دوران یہ انکشاف کیا۔'' اسی کی کڑیوں کے طور پر اپنی صدارت میں چل رہے قومی ادارے ترقی اردو بیورو کے توسط سے انھوں نے کتابوں کے تراجم کی کارگاہیں منعقد کیں اور کیمیا، نباتات، حیاتیات، حیوانیات اور طب وغیرہ سائنسی و دیگر علوم کی کتابوں کے ترجموں کے لیے ان علوم کی اصطلاحات کی فرہنگیں تیار کروائیں۔اس سلسلے میں جب آپ نے طبِ یونانی کی کتابوں کی ایک کارگاہ تلنگانہ کے شہر کرنول میں منعقد کرائی تو وہاں کے میڈیکل کالج کے حکام وطلبا اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے آپ کے کاموں کی افادیت کے پیش نظر آپ کو 'ملکۂ اردو' کے خطاب سے نوازا۔

اُن دنوں 'اردو دنیا' سہ ماہی رسالہ تھا اور چھوٹے سائز میں شائع ہوتا تھا اور بیورو کی سرگرمیوں کی نمائندگی کا آلہ کار تھا۔ اس کی جلد 19 بتاریخ جنوری تا جون 1987 میں انھوں نے انگریزی داں اردو طبقے کو یاد دلایا ہے کہ ''انگریزی داں اردو طبقے کا فرض ہے کہ کم تعلیم یافتہ اردوداں طبقے کو باشعور بننے میں مدد دے، انھیں عصری آگھی بخشے، عصری تقاضوں سے واقف کرائے، انھیں اپنے آئینی حقوق پہچاننے اور انھیں طلب کرنے کی طرف آمادہ کرے اور طریقے سکھائے....اگر ایسا نہ ہوا تو اردو والے منتشر ہو کر اپنا اعتماد کھو بیٹھیں گے جو فرد اور ملک دونوں کے لیے خطرناک بات ہوگی۔ترقی اردو بیورو اپنے دائرۂ کار کے اندر کم تعلیم یافتہ اردو داں طبقے کی ضرورتوں کی طرف ان دنوں توجہ کر رہا ہے بلکہ اس سلسلے میں ہم نے پیش رفت کر بھی دی ہے.....''

ترقی اردو بیورو میں اپنی ڈائرکٹر شپ کے دوران انھوں نے کئی اہم موضوعات پر تاریخی اہمیت کے حامل کل ہند سطح کے کئی سمینار اور ورکشاپ منعقد کروائے جن کے لیے ملک بھر کے ماہرین اردو نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور تسلیم کیا کہ یہ سبھی کام وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ اکتوبر 25 تا 27، 1987 کے دکنی ادب کی تدریس و مسائل پر منعقدہ سہ روزہ سمینار نے تو ایک بے مثال یادگار کی حیثیت اختیار کر لی۔

اُن دنوں 'اردو دنیا' سہ ماہی رسالہ تھا اور چھوٹے سائز میں شائع ہوتا تھا اور بیورو کی سرگرمیوں کی نمائندگی کا آلۂ کار تھا۔ اس کی جلد 19 بتاریخ جنوری تا جون 1987 میں انھوں نے انگریزی داں اردو طبقے کو یاد دلایا ہے کہ ''انگریزی دان اردو طبقے کا فرض ہے کہ کم تعلیم یافتہ اردو داں طبقے کو باشعور بننے میں مدد دے۔ انھیں عصری آگہی بخشے، عصری تقاضوں سے واقف کرائے، انھیں اپنے آئینی حقوق پہچاننے اور انھیں طلب کرنے کی طرف آمادہ کرے اور طریقے سکھائے.... اگر ایسا نہ ہوا تو اردو والے منتشر ہو کر اپنا اعتماد کھو بیٹھیں گے جو فرد اور ملک دونوں کے لیے خطرناک بات ہوگی۔ ترقی اردو بیورو اپنے دائرۂ کار کے اندر کم تعلیم یافتہ اردو دان طبقے کی ضرورتوں کی طرف ان دنوں توجہ کر رہا ہے بلکہ اس سلسلے میں ہم نے پیش رفت کر بھی دی ہے.....''

شہر حیدر آباد میں 'ترقی اردو بیورو کی شاخ برائے جنوبی ہند' کا افتتاح بھی ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی اردو خدمات کی ایک مجاہدانہ مثال ہے۔ اس کے ذریعے آندھرا پردیش، تامل ناڈو، کرناٹک، کیرلا اور مہاراشٹرا یعنی جنوبی ہند کی پانچ ریاستوں میں اردو کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں کئی اہم امور کو روبہ عمل لایا گیا۔ ڈاکٹر حسن الدین احمد، ریٹائرڈ آئی اے ایس آفیسر نے اس جلسے کی صدارتی تقریر میں فرمایا تھا کہ ''میں ترقی اردو بیورو سے تقریباً ابتدا ہی سے منسلک رہا ہوں اور یہ کہتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے عہد ڈائرکٹر شپ میں اس ادارے میں جتنی ترقی ہوئی کسی کے دور میں نہیں ہوئی۔ انھوں نے اس ادارے کے مرتبے کو اونچا اٹھا کر ایک بین الاقوامی مرتبہ عطا کیا ہے۔ میرے حالیہ دورۂ انگلستان اور امریکہ میں اس ادارے اور ادارے کی ڈائرکٹر کا جگہ جگہ ذکر ہوتا رہا تو میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اس ادارے کی کارکردگی کے ذریعے ملک میں اور ملک سے باہر ہمارے دیس کے نام کو اونچا کر رہی ہیں۔''

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے ترقی اردو بیورو کے ماتحت ہندوستان بھر کی مختلف ریاستوں میں اردو کتابت کے مراکز کی تعداد میں 5 سے 48 تک کا اضافہ کر کے سیکڑوں خاندانوں کو روزگار کے مواقع فراہم کیے تھے۔ بے شمار غریب لڑکیوں نے خطاطی کے فن میں مہارت حاصل کر لی تو انھیں اپنے گھر والوں کو روٹی مہیا کرنے کا ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا، ڈاکٹر صاحبہ نے کئی مرتبہ اس بات کا ذکر کیا تھا کہ جب بھی آپ کا، ان مراکز کو جانا ہوتا تو ان لڑکیوں کی مائیں آ کر آپ کو دعائیں دیتیں کہ میڈم آپ کی وجہ سے ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا ہے ورنہ کئی دنوں تک ہمارے گھروں میں چولہوں کے گرم ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی، اللہ آپ کو اس کا اجر دے!

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اپنے دور میں ترقی اردو بیورو سے کئی ایسی نایاب کتابوں کی از سر نو اشاعت کا اہتمام بھی کیا جو بے حد اہم تھیں لیکن ان کی فراہمی ناممکن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بھی ان کا ایک اہم اقدام تھا۔

ان کا نظریہ تھا کہ کتابیں دراصل وہ صحیفے ہیں جن میں علوم کے مختلف شعبوں کے ارتقا کی داستان رقم ہے اور آئندہ کے امکانات کی بشارت بھی۔ بیورو کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مختصر عرصے میں بعض کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوئی ہے'' (کلیات سراج، ص3، 1982)۔ قارئین کی سہولتوں کا مزید خیال کرتے ہوئے کتابوں کی قیمت بہت کم رکھی جاتی ہے تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے اور وہ اس بیش بہا علمی خزانے سے زیادہ سے زیادہ مستفید اور مستفیض ہو سکیں۔

(پیش لفظ ص4، شعر شور انگیز، جلد اول، اپریل جون 1990)

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم صاحبہ دکنی ادب سے لے کر دور جدید کے ادبی منظر نامے تک بھی ادب کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ ان کے ادبی مضامین 'آجکل' وغیرہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے طالب العلمی کے دور میں کچھ افسانے بھی لکھے تھے جن میں سے کئی ایک شائع بھی ہوئے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف و تالیفات حسب ذیل ہیں:

میسوری اردو اور 'نے' (1975)، شعور زبان، بار اول (1989)، اردو مثنوی: مطالعہ و تدریس، بار اول، 1992، راحت آرا بیگم کی افسانہ نگاری اور منتخب افسانے (1993)، قدیم اردو نظم۔ جنوری تا مارچ (1995)، ذاکر حسین: شخصیت و معمار، اکتوبر تا دسمبر (1995)، بنگلہ ڈرامہ ڈاک گھر، اردو ترجمہ از راحت آرا بیگم مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم (1995)، انگریزی کتاب Outlines of Islamic Culture۔

'میسوری اردو اور نے' ڈاکٹر صاحبہ کی پہلی تصنیف ہے جو 1975 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں دکنی اردو میں علامت فاعل 'نے' کے استعمال میں پائی جانے والی غلطیوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور بعض محققین کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ دکنی اردو میں 'نے' کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ 'نے' کے استعمال کی مناسب اور نامناسب ہر طرح کی مثالیں دکنی مخطوطات میں بھی ملتی ہیں اور یہاں کی بات چیت میں بھی۔

تصنیف 'شعور زبان'، 1989 میں نئی دہلی سے شائع ہوئی اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے پیش لفظ میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کو لسانیات کے میدان میں کسی قابل فرد کی اپنی تلاش و جستجو کا حاصل قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''..... فہمیدہ بیگم نے جتنا کام کیا ہے وہ لسانیات کے حدود میں ہے، جو سخت مشکل بھی ہے اور اشد ضروری بھی..... ان کا کوئی

مضمون ایسا نہیں ہے جس کا ہر صفحہ غور و فکر کی دعوت نہ دیتا ہو یا جس میں انھوں نے زبان کے مطالعے کو نفسیات، عمرانیات اور دوسرے سائنسی علوم سے جوڑنے کی کوشش نہ کی ہو۔ (پہلا ایڈیشن، شعور زبان، پیش لفظ، ص 7 تا 9)

اسی کتاب کے 'تعارف' میں پروفیسر مسعود حسن خاں نے اس کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ''....... مجھے امید ہے کہ ان کے یہ مضامین اس لسانی شعور کے پیدا کرنے میں معاون ہوں گے جس کی اردو داں حلقوں میں خاصی کمی پائی جاتی ہے۔''

(پہلا ایڈیشن، شعور زبان، پیش لفظ، ص 12)

تصنیف 'اردو مثنوی، مطالعہ اور تدریس' کی پہلی جلد اگست 1992 میں اور دوسری جلد 1993 میں شائع ہوئی۔ اس میں مثنوی کی ابتدا اور اس کی تدریس پر روشنی ڈالنے کے بعد کُل پندرہ مثنوی نگاروں کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے جس میں سے چھ شمالی ہند سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی نو جنوبی ہندوستان سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اس کتاب کا ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ ہمارے یہاں اردو مثنوی کے مطالعے کو ابھی تک علاقے اور ادوار یعنی زماں اور مکاں کے خانوں میں بانٹا جاتا ہے جیسے کہ دلی کی مثنویاں، عادل شاہی دور کی مثنویاں وغیرہ تو اس کی وجہ سے اردو ادب کے طالب العلم اور اساتذہ میر حسن، دیا شنکر نسیم، شاہ میرانجی شمس العشاق، عبدل بیجاپوری اور ملا نصرتی کو ایک دھاگے میں پروتے ہوئے جھجھک سی محسوس کرتے ہیں۔ یہ کتاب اس جھجھک کو دور کر کے اردو مثنوی کی تاریخ میں جو تسلسل ہے اسے واضح کرنے اور جدید اور قدیم مثنویوں کے تقابلی مطالعے کو فروغ دینے کی ایک کوشش ہے۔

(اردو مثنوی، مطالعہ اور تدریس، بار دوم 1993، ص 10)

'ڈاکٹر ذاکر حسین۔ شخصیت و معمار' 1995 ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی مرتبہ کتاب ہے۔ اس میں فہمیدہ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک گرانقدر پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت اور کارناموں پر تقریباً بیس اصحاب کے مضامین، اور خود ذاکر صاحب کی مختلف موضوعات پر قلمبند کی ہوئی چند تحریریں اس میں شامل ہیں۔

'قدیم اردو نظم، حصۂ اول' بھی ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی مرتبہ کتاب ہے جو جنوری تا مارچ 1995 ترقی اردو بیورو سے شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اس کی ''تمہید' میں بتایا ہے کہ قدیم اردو کا مطالعہ ہندوستانی اور بیرونی ممالک کی اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں میں مختلف سطحوں پر ڈگری کورس، اعلا ڈگری کورس وغیرہ میں شامل ہے مگر جدید اور قدیم اردو کے مابین جو لسانی، صوتی، صرفی، نحوی فرق موجود ہے اس کو قاری پوری طرح سمجھنے کی کوشش میں بے شمار الجھنوں اور رکاوٹوں کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تہذیبی، فکری، معاشرتی، تمدنی اور علاقائی فرق بھی درمیان میں حائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے قدیم اردو کے سلسلے میں درس و تدریس اور تحقیق کے مسائل پر ترقی اردو بیورو کی طرف سے منعقدہ ایک سہ روزہ سمینار میں کی گئی سفارشات میں دانش گاہوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قدیم اردو کا منتخب کلام شائع کرنے کی سفارش بھی شامل تھی اور یہ کام ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ہی کو سونپا گیا تھا۔ کتاب 'قدیم اردو نظم' اسی کا حاصل ہے۔ اس میں تقریباً بائیس اصناف شاعری کا انتخاب موجود ہے۔

'راحت آرا بیگم کی افسانہ نگاری اور منتخب افسانے' میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے کلکتہ کی ایک مشہور افسانہ نگار راحت آرا بیگم کے حالات زندگی اور ان کی افسانہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کے چھ منتخب افسانے پیش کیے ہیں۔

اب مجھے یہ کہنا ہے کہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے اور میرے تعلقات کچھ مدت کم آدھی صدی کے وقفے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ 1976 میں بنگلور یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لینے سے لے کر ان کے مخصوص موضوع 'مثنوی' کے ایک گوشے 'جنوبی ہند کی تصوفانہ مثنویوں کا مطالعہ' سے متعلق تحقیقی منزلوں سے گزر کر 1990 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے تک ہی نہیں بلکہ ان کے انتقال تک بھی ہمارے درمیان میرے شاگردانہ روابط کے ساتھ ہی ساتھ دوستانہ قسم کے روابط بھی قائم تھے۔ میں اپنی پی ایچ ڈی کے موضوع کے انتخاب میں ڈاکٹر صاحبہ کی بے حد ممنون رہی کہ اُن کی وجہ سے مجھے نہ صرف اپنے وراثتی ذوق تصوف کی بیشمار کتابیں چھاننے میں دلچسپی پیدا ہوگئی بلکہ دکنی زبان و ادب پر دسترس بھی حاصل ہوگئی۔ ہر چار پانچ دنوں بعد فون پر ہماری گفتگو کے دوران یا روبرو ملاقات کے دوران کئی ادبی امور کے بارے میں گفتگو رہتی۔ اب جب کہ وہ ہم سے جدا ہوگئی ہیں تو انتہائی مشفق اور اپنائیت کے جذبے سے پیش آنے والی فہمیدہ آپا صاحبہ کی یاد یہ احساس جگا دیتی ہے کہ میں ایک مشفق بزرگ حقیقی بہن کے سائے سے محروم ہوگئی ہوں!

آپ چاہتی تھیں کہ فکر و تحقیق کی وہ جلد جو دلّی میں منعقدہ 27 تا 29 اکتوبر 1987 کے دکنی ادب کے سمینار کے مقالوں پر مشتمل ہے، اس کو بڑے فانٹ میں منتقل کر کے چھپوائیں تا کہ قدیم دکنی ادب پر تحریر کردہ یہ گرانقدر مقالے پردۂ خفا میں نہ چلے جائیں بلکہ منظرِ عام پر رہ کر علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوں۔ دوسرے، انھوں نے بڑی جانفشانی سے تکرارِ الفاظ کے بارے میں جو مواد اکٹھا کر رکھا تھا، اسے کتابی شکل دے کر شائع کرنے کی، اور الفاظ نفی کے سلسلے میں جو کچھ کام کیا تھا اس کو بھی کتابی شکل میں جلد سے جلد شائع کروانے کی وہ بے حد متمنی تھیں۔ لیکن رام نگرم کے ناگہانی سیلاب میں جب ان کا بہت سا ادبی سرمایہ پانی کی نذر ہو گیا تو آپ اس سے بہت متاثر ہوگئی تھیں اور جو کچھ باقی بچا ہے اسی سے کام کو آگے بڑھانے کے اقدامات کر رہی تھیں۔ ماہ نومبر 2022 کے اختتامی ہفتے میں آپ پر ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا، ہسپتال کے آئی سی یو میں داخل رہیں۔ گھر آنے کے بعد 30 رنومبر کو میری ملاقات کے دوران طبیعت کی ناسازی کے باوجود میرے ساتھ جتنا بھی وقت گزارا اِن ہی تین کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں بات آگے بڑھائی۔ تین چار دن بعد ہی آپ نے فون پر بتایا کہ تکرار والا فائل پورا اکھٹا کروا کر رکھا ہے، مجھ سے تفصیلی گفتگو کرنی ہے، میں آ کر اسے لے جاؤں اور کتاب کی شکل میں سلیقے سے ترتیب دے کر کمپوزنگ کے لیے دے دوں۔ 14 ردسمبر کو، میری ملاقات کے دوران گیارہ بجے سے شام پانچ بجے تک اسی سلسلے میں تفصیلی گفتگو ہوتی رہی، میں فائل لیے گھر لوٹ آئی۔ اس دن وہ ٹھیک ہی لگ رہی تھیں لیکن اس کے آٹھ دس دن بعد 25 ردسمبر کو فون کرنے پر پتہ چلا کہ طبیعت کی ناسازی کی وجہ پھر سے ہسپتال میں داخل ہوئیں، کل صبح ہی گھر واپس آئی ہیں مگر طبیعت پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے، میں نے فون پر آپ سے بات کروانے کے لیے کہا تو آپ نے میرا نام لے کر کچھ کہنا چاہا، ٹھیک سے الفاظ ادا نہیں کر پا رہی تھیں، میرے ہوش اڑ گئے، میں نے انھیں کہا کہ آپا! آپ اطمینان رکھیے، آپ نے جیسا کہا ہے ویسے ہی میں آپ کی تکرار الفاظ کی کتاب مکمل کر کے شائع کروا دوں گی، آپ جلد ٹھیک ہو جائیے، اس کی فکر مت کیجیے گا! اسی دن انھیں پھر سے اسپتال میں داخل کرایا گیا اور 27 رکی صبح وہ مالک حقیقی سے جا ملیں۔ ان شاء اللہ ان کی خواہش کے مطابق تکرارِ الفاظ والی کتاب جلد ہی اشاعت کی منزل پر پہنچ جائے گی۔

■

Prof. Mahnoor Zamani
23/1, GB, Lotus heights Apartment
3rd Cross, Sultanpalya Main Road
Sultanpalya
Bangalore- 560032 (Karnataka)
Mob.: 8431819043

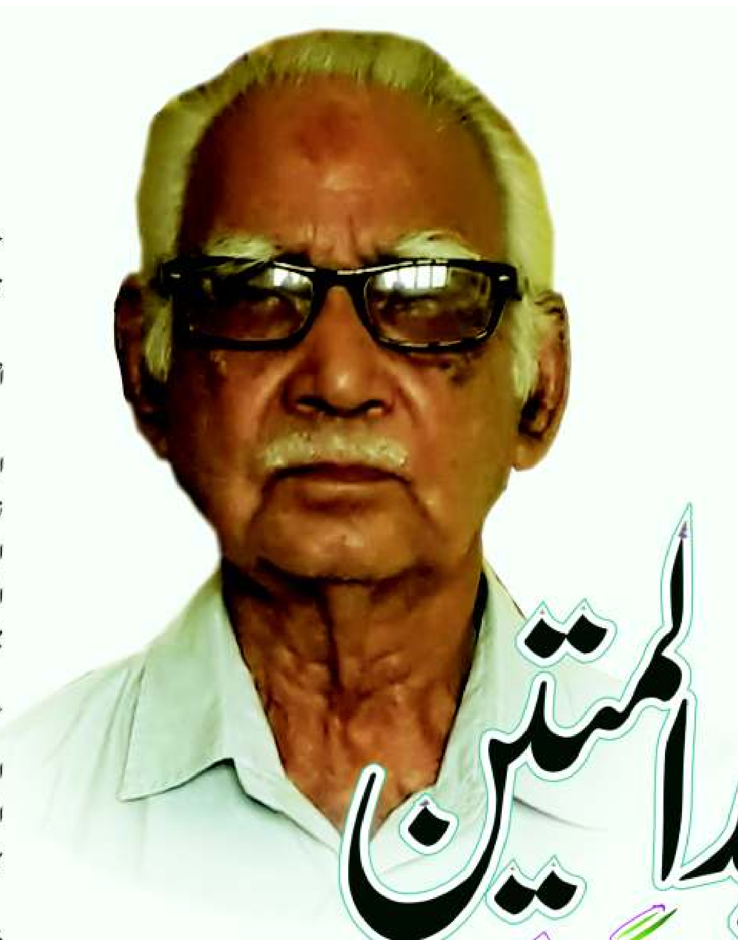

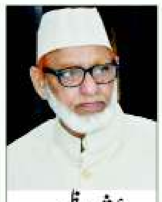

عشرت ظہیر

عبدالمتین

رنگوں کے تعاقب میں

عبدالمتین کی زندگی کا سفر 18 مئی 1938 سے 6 جون 2022، اور ان کا افسانوی سفر 1952 سے 2022 پر محیط ہے۔ یعنی انھوں نے اپنی زندگی کے 84 سال میں سے 70 سال صنف افسانہ کی آراستگی میں گزارے ہیں۔

ان کے دو افسانوی مجموعے 'رنگوں کا تعاقب' (2011) اور 'تلاش' (2018) طبع ہوئے۔ اس کے علاوہ بے شمار افسانے مختلف رسالوں میں منتشر ہیں۔

عبدالمتین نے سماجی زندگی کے نشیب و فراز، دھوپ چھاؤں اور انسان کی نفسیاتی الجھنوں اور نفسانی پیچیدگیوں کو اپنے افسانے کا محور بنایا ہے۔ تجربات اور حوادث کی تپش اور فنی لوازمات کی آمیزش اور جاذب توجہ اظہار بیان کے توسط سے اپنے افسانوں کو آراستہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں علامتی اور استعاراتی انداز بیان اور تحلیل نفسی کے نظریات کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کی کہرآلود، شبنمی اور علامتی و استعاراتی فضا اپنے قاری کے اذہان وقلوب کو موسیقی کی طرح مسخر کرنے کی قوت سے متصف ہے۔

عبدالمتین کے افسانے کا اختصاص ہے کہ یہ ناسٹلجک صورت حال کے پیرایۂ اظہار میں زندگی کی حرارت کشید کرتے ہیں، اور احساسات وجذبات کی رنگ آمیزی کے سہارے حیات انسانی کی گردشوں اور لطافتوں کو گویا مجسم کر دیتے ہیں۔ اکثر انسان زندگی کی راہوں میں ارادتاً یا غیر شعوری طور پر گویا ایک Puppet کی طرح حرکت وعمل کا مرتکب ہوتے ہیں۔ زندگی کے جھگڑے، تھپیڑے، شادکامی اور فرحت بخش فضائیں، اس کے ہمراہی ہوتے ہیں۔ زندگی کی ایسی ہی سچائیاں عبدالمتین کے افسانوں میں سحر انگیز کیفیتوں میں ڈھل کر انوکھی کشش اور تشکیک حیات وکائنات کا مظہر بن جاتی ہیں۔

عبدالمتین کے افسانوں میں چھوٹے چھوٹے معنی خیز، دور گامی جملے موضوع سے منطبق اور مبسوط اظہار کے توسط سے واقع پذیر ہوتے ہیں اور قاری کو اپنی گرفت میں لے کر زندگی کی تہہ داری، کائنات کے رمز اور وقت کی گردش ناتمام کو اجاگر کرتے ہیں:

''یہ زندگی کیا ہے؟ لمحے کیوں بیت جاتے ہیں! کدھر جاتے ہیں؟ بچپن کی رعنائیاں کہاں گئیں؟''
(اے خالق کائنات)

''..... میں پیچھے مڑا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر آواز حقیقت تھی۔ لہٰذا میں انتظار کرنے لگا۔ میں اور تنہائی..... تنہائی اور انتظار عجب کیفیت تھی۔ (سمندر کا آئینہ)

..... ''بیٹی، انسان کا فیصلہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اصل فیصلہ وقت کا ہوتا ہے، جو بامعنی ہوتا ہے۔ (افق گمشدہ)

عبدالمتین کے افسانوں میں مظہر کائنات، انسان اور رشتے ناتے، لوگ باگ متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ زندگی کی کٹھن مسافت، سماج کے مختلف طبقوں کے پیچیدہ اور الجھے مسائل کے ساتھ ہی ساتھ نیرنگیِ حیات کا حقیقت افروز منظر نامہ، جاذب توجہ ہے۔ اسلوب اور طرز اظہار میں تحیر خیزی اور تجسس کے جوہر نمایاں ہیں۔

ماں، بھابھی، بابو، عورت، رات کی رانی، گلاب، گیندا، ستارے، دریا، ساحل، سمندر، سفر، آواز، درخت، انار، رنگ، گلابی، بنفشی فالسی، سفید سیاہ..... یہ اور ایسے الفاظ ان کے افسانوں میں بار بار روپ بدل بدل کر آتے ہیں اور معنویت کا نت نیا جہاں آباد کرتے ہیں۔

لفظ رنگ اور رنگوں کی قوس قزح کی چمک اور معنی خیزی عبدالمتین کے افسانوں میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ رنگ اپنے آپ میں ایک خوش کن احساس اور لذت آمیز کیفیت سے مملو ہوتے ہیں۔ یہاں زندگی کی مختلف النوع آسائش اور احساس سرخوشی کے تعاقب کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان رنگوں کے تعاقب میں عبدالمتین نے زندگی اور وقت کے بہاؤ کو ماضی اور حال میں فنکاری اور ہنرمندی کے ساتھ مدغم کیا ہے۔ گویا یہ ان کا پسندیدہ اسلوب ہے۔ جس کے تحت یہ گزرے ہوئے لمحوں کی یادوں سے وابستہ ماضی کے دھندلکوں کو حال کے اجالوں سے روشن کرنے کی سعیِ پیہم سے فن پارہ خلق کرتے ہیں۔

وزیر آغا نے ایک جگہ لکھا ہے:

''انسان اپنے ماضی کی نفی کرنے پر مشکل ہی سے رضا مند ہوتا ہے۔ اس لیے قدیم سے وابستہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں اس کی زندگی ایک عجیب سی منافقت کی زد میں آجاتی ہے۔ ذہنی طور پر وہ نئے زمانے کے ساتھ ہوتا ہے اور جذباتی طور پر پرانے زمانے کے ساتھ۔ تاریخ انسانی میں یہ ایک نہایت نازک اور کرب ناک دور ہے۔ جسے فن کے ذریعے عبور کرنا ممکن ہے۔''

اس اقتباس کی روشنی میں عبدالمتین کے افسانہ 'رنگوں کا تعاقب' کا مطالعہ دلچسپ ہے اور ان کی فنی گرفت کو بھی واضح کرتا ہے۔

افسانہ رنگوں کا تعاقب ماضی کی گزرگاہوں میں ڈوبنے ابھرنے کی کیفیت سے مملو شاہکار تخلیق ہے۔

افسانے کی ابتدا دیکھیں:

''میری اماں کہتی تھیں۔ جب میں چھ ماہ کا تھا تو انھوں نے رنگ برنگ کے کپڑے کی چڑیاں بنا کر چھت میں آویزاں کر دی تھیں اور میں منہ میں انگوٹھا ڈال کر انھیں دیکھتا رہتا۔ لال گلابی، فالسئی اور بنفشی رنگ کی چڑیاں دیکھتے دیکھتے میں پاؤں پٹخنے لگتا.....''

رنگوں کے تعاقب میں دراصل وقت کے ہر دم رواں پیہم دواں رفتار کو فن کی گرفت میں لینے کی کوشش ہے۔ افسانے کے بچے کا پاؤں پٹخنا زندگی اور وقت کے ارتباط کا اشاریہ ہے۔ لال گلابی، فالسئی اور بنفشی چڑیاں کائنات کی رنگینی اور اس کے حصول کے جہد مسلسل کا استعارہ ہیں یعنی زندگی کا سفر جاری ہے۔

''..... اور پھر میں دریا کے کنارے کھڑا تھا۔ یک بیک ساحل پر اس کا سرخ دوپٹہ لہرایا۔ میں نے پکڑنا چاہا اور میرے پاؤں پھسل گئے۔ میں پانی میں چلا گیا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے اور میں نے خود کو پانی کے حوالے کر دیا۔ میں دریا کی لہروں پر بہنے لگا.....''

یہاں وقت کا بہاؤ اقبال کی نظم 'مسجد قرطبہ' کے پہلے بند کی طرح پرشور اور بلا خیز نہیں بلکہ نہایت سبک رو اور غیر محسوس طور پر وقت کے بہاؤ کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ وقت جو قائم و دائم ہے، اور بتدریج آگے بڑھ رہا ہے اور فضائے بسیط کی دلکشی کو اپنے جلو میں لیے رواں ہے ایک لامتناہی اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر اسرار اور تحیر خیزی کے دھندلکوں میں ڈوبا ہے، لیکن زندگی پھر بھی بقائے دوام کی امین ہے کہ۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

افسانے کا اختتامیہ قاری کو عالم استغراق میں پہنچا دیتا ہے۔

''رنگوں کے تعاقب کا سلسلہ کہاں ختم ہوتا ہے؟''

شاید یہ سلسلہ روز اول سے ابد تک جاری ہے۔ اپنے افسانہ 'اے خالق کائنات' میں عبدالمتین نے گویا اس کی توضیح پیش کی ہے:

''..... میں دیکھتا ہوں۔ قاضی میری قمیص پہن کر اچھل رہا ہے اور کہہ رہا ہے میں ابا بن گیا..... قاضی کی یہ بات سنتے ہی محسوس ہوا کہ میں نے خود کو پا لیا۔ اب میری نظروں کے سامنے ایک وسیع سمندر ہے۔ موجیں ابھر رہی ہیں۔ موجیں مٹ رہی ہیں۔ یہ سلسلہ ابتدا از ل جاری و ساری ہے..... زندگی حسین ہے اور موت بامعنی۔ اے خالق کائنات تیرا شکریہ!''

زندگی کے تسلسل اور حیات دوام کا یہ سلسلہ دراز ہے۔ اسی قبیل کے ایک افسانے 'سفر' میں بھی یہ احساس جاں گزیں ہے:

''ہر لحظہ پانی بڑھ رہا تھا اور ہمارے جسم اس میں گم ہوتے جا رہے تھے۔

میں خوف زدہ ہو گیا اور اس سے کہا۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟ اس طرح ہم مر جائیں گے۔''

''تم کچھ سن رہے ہو' اس نے پوچھا۔

''ہاں بچہ کی آواز۔''

''تو ہم نہیں مر سکتے''

''کیسے؟''

''وہ ہماری آواز ہے اور آواز کبھی نہیں مرتی۔'' (سفر)

افسانہ 'سفر' زندگی کے طمطراق اور چہل پہل کا اشاریہ ہے، لیکن زندگی کے اس سفر میں تذبذب بے یقینی اور گم ہونے کا احساس بھی شامل ہے کہ انسان کو علم ہی کہاں ہے! وہ کہاں جا رہا ہے، کیوں جا رہا ہے:

''مجھے خبر نہیں تھی، نہ ابتدا کی آگاہی اور نہ انتہا کا پتہ'' میں صرف اتنا محسوس کرتا تھا کہ سفر میں ہوں اور بس.....'' (سفر)

بے سمت سفر کا احساس اور لاعلمی انسان کی سرشت میں رچی بسی ہے۔ دراصل ہم وہی جانتے ہیں، وہی علم رکھتے ہیں، جو خالق کونین نے ودیعت کی ہے۔ زمین و آسمان، فضائے بسیط اور مظاہر قدرت کے تمام تر نظارے ایک رہسیہ، ایک بھید کے سے ہیں، یہ دھندلکے میں ڈوبے ہیں اور ہم ان دھندلکوں کے سفر نا تمام کے راہی ہیں۔

عبدالمتین کے افق تا افق، رنگوں کے تعاقب کے سلسلے زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں اور تہہ داریوں کے جوہر سے متصف اور ثروت مند ہیں۔ رنگوں کے تعاقب کا یہ خواب ناک اور منطقی سفر، کائنات افسانہ میں حاوی بھی ہے اور جاری بھی، جو زندگی کے ہر روپ، رنج والم، رعنائیوں اور ہجوم شادکامی کی کیفیت، نازک خیالی کی آماجگاہ اور رمز حیات کے اشاریے ہیں۔

ارتباط حیات اور زندگی کے قائم ہونے کے خیال انگیز منطقیانہ تخیل کی کارکردگی کی جھلکیاں ان کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہیں۔ اس خیال کی عکاسی کا نمونہ ان کے افسانہ 'عکس کے بعد' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں زندگی کی بدلتی کیفیتوں اور تغیر پذیر وقت کی عکاسی استدلالی واقعات اور استعاراتی نظام کے سہارے اجاگر کی گئی ہے۔ یہاں تغیر زماں کی کیفیت نمایاں ہے، لیکن وقت کے قائم و دائم ہونے کا احساس بھی بین السطور سے جھلکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے 'فوٹوگرافر' میں وقت مائل بہ فنا ہے:

''ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے، فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔'' (فوٹوگرافر)

اس کے برخلاف عبدالمتین وقت کے فنا کے منحرف ہیں، ہاں اس کے تغیر پذیر ہونے کی کیفیت کے قائل ہیں:

''وقت پر انسان کا اختیار نہیں۔ یہ وقت کبھی ہوا کا ساتھی بن کر خون کے آنسو رلاتا ہے اور کبھی تھم تھم کے چل کر سوئیاں چبھوتا ہے۔'' (نور کا ہالہ)

افسانہ 'عکس سے پہلے عکس کے بعد' کے کردار شکیل کی زندگی میں حالات اور گردش زمانہ کے باعث سناٹگی در آتی ہے:

''..... اس نے چاروں طرف سناٹا محسوس کیا، جس میں اس کی حیثیت پت جھڑ کے موسم میں سوکھے پتے کی سی تھی۔ اداسی، تنہائی، خاموشی..... وہ کہاں جائے، کیا کرے..... لوگوں کو دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ زندگی بہت حسین ہے، مگر جب اپنے اندر جھانکتا تو بے حد سناٹا اور اتھاہ اندھیرا پایا۔''

لیکن اس سناٹے اور اتھاہ اندھیرے میں، وہ ختم نہیں ہوتا ہے، وہ فنا نہیں ہوتا کہ:

''دنیا کی ریت ہے کہ افسانے وہی رہتے ہیں، صرف عنوان بدلتے رہتے ہیں۔'' (نور کا ہالہ)

اس ضمن میں ایک اور افسانہ 'سوال' انسانی وجود کی حقیقت اور اس کے بقائے دوام کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے اور تخلیق کے کرب اور اجزائے پریشاں کے عمل کی اذیت کو بھی منکشف کرتا ہے۔ حالانکہ انسان اس قدر مجبور محض ہے کہ اسے اپنی زندگی اور ارد گرد تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال اور اپنے اندر کی تبدیلیوں اور اس کی کیفیت و کمیت کا نہ اندازہ ہے، نہ اختیار۔ زندگی کے کرب اور جد و جہد اور کاوشوں کے سلسلوں کو نشان زد کرتے ہوئے افسانہ 'سوال' میں انسانی وجود، ایک رہسیہ ایک سوال نظر آتا ہے۔ انسان اپنے وجود کے خلق کے وقت بھی سوال ہوتا ہے اور وقت رخصت حیات بھی سوال ہوتا ہے:

''تمھیں قفس عنصری سے آزاد ہونے میں درد کی شدت کا اس قدر احساس کیوں؟''

''کیوں؟'' اس نے درد کی شدت کے باعث بہت ہی مدھم لہجے میں کہا:

''اس لیے کہ تم پیدائش کی اذیت اور اس کی شدت سے واقف ہو۔''

''اُف۔ تمھیں معلوم نہیں۔ تخلیق کے کرب سے زیادہ 'اجزائے پریشاں' کے عمل میں اذیت کا سامنا ہوتا ہے۔''

گویا انسان زندگی کے دھندلکوں اور نامعلوم سمت ومنزل کے سفر میں جینے کی تمنا اپنے دل میں بسائے رہتا ہے کہ مرنے کا عمل شاید اسی لیے تخلیق کے کرب سے بھی زیادہ اذیت دیتا ہے۔ لیکن یہ انسان جب اس اذیت کو جھیل کر، اگلی منزل میں داخل ہوتا ہے، وہاں بھی اس کا وجود ایک سوال ہی ہوتا ہے:

''میں کون ہوں؟''

''اور صدیوں کے بعد لطیف ترین پیکر میں ڈھل کر بھی میں نے خود کو ایک سوال محسوس کیا۔ میں آگے بڑھتا گیا اور خلا میں آ گیا۔ مگر وہاں بھی میں سوال تھا اور نہ جانے کب تک سوال رہوں گا۔'' (افسانہ سوال)

گویا وجود انسانی روز اول تا ابد لاینحل سوال ہے۔

گائیکی اور موسیقی میں طلسماتی صفت ہوتی ہے سُر لے اور، دھن سے سجی سنوری گلوکاری کے الفاظ اگر غیر مانوس بھی ہوں تو قلب وذہن کو، سرور، کشش اور حظ تو حاصل ہوتا ہی ہے اور روح تک حصار لذت وآسودگی سے سرشار ہوجاتی ہے۔

ادب وشعر میں ابہام کی یہی کیفیت ہے۔ ابہام اگر قصداً یا کسی تحریک کے زیر اثر خلق کیا گیا ہو تو لاحاصل، ورنہ عجز بیان کے باعث نمو پانے والی علامتیں، غیر آشنا اور بظاہر نا قابل فہم بھی ہوں، یا پہلی نظر میں ان کی تہہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو، پھر بھی اس صورت حال میں رونما ہونے والے ابہام موسیقی کی طرح قلب وروح کو مسخر کیے دیتے ہیں۔ لیکن گڑھی ہوئی علامتیں اس قدر قابل اعتنا نہیں، جیسا کہ تخلیق کے بطن سے ہویدا علامتیں اور ان کے زیر اثر ابہامی کیفیت سرور آگیں ہوتی ہیں۔

عبدالمتین کے اسلوب بیان اور افسانے کے اسٹرکچر سے علامتیں ازخود ابھرتی ہیں، ان کے اکثر افسانے علامتی اور استعاراتی نظام کے سبب ایک کہر آلود، نرم وگداز احساس وفضا خلق کیے دیتے ہیں۔ لیکن ان علامتوں کی بندش اور اظہار واسلوب خوش کن اور سحر آگیں اور پر تجسس صورت حال سے قاری کو روبرو کراتے ہیں۔ عبدالمتین کے ایسے افسانوں میں 'تلاش' 'چٹان' اور 'سمندر کا آئینہ' نمائندہ اور اہمیت کے حامل افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں ابہام کا جادوئی حسن نمایاں ہے۔

شاید ترقی کی انتہا میں انسانی تہذیب اور روایت کی پامالی چھپی ہوتی ہے کہ عروجِ آدم خاکی کی یہ منزلیں گویا زندگی کی اصل اور فطری لذتوں اور تسکین قلب کی راہوں کو مسدود کیے دیتی ہیں۔

کرشن چندر کے ناول 'مشینوں کا شہر' میں فٹ بال میچ کا ایک منظر ہے۔ دونوں ٹیمیں کمپوٹرائزڈ ہیں اور روبوٹ ان کے کھلاڑی۔ کھیل کا ہر عمل مشینی آلات کے تحت نپے تلے انداز میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی بھی جانب کوئی گول نہیں ہوتا کہ روبوٹ غلطیاں نہیں کرتے اور گول تو غلطیوں کی رہین منت ہوتے ہیں۔ لہٰذا تماش بین کوئی لطف اور حظ نہیں حاصل کر پاتے۔ ایسے میں ناول کا ایک کردار ایک روبوٹ کھلاڑی کو ہٹا کر خود ایک ٹیم میں شامل ہوجاتا ہے۔ انسان تو غلطیوں کا پتلا ہے۔ لہٰذا مخالف ٹیم گول کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔

اس خلاصۂ اقتباس کی بنیادی تفہیم کو مخل نظر رکھتے ہوئے عبدالمتین کے افسانہ 'تلاش' اور 'چٹان' کا مطالعہ کیا جائے تو افسانے کا مرکزی نکتہ اور اس کی معنوی آفاقیت کے تناظر روشن ہوجائیں گے۔ دراصل آسائش احساس کو کچل دیتی ہیں، آلات انسان کی جمالیاتی حسیت کو فنا کردیتے ہیں، افسانہ 'تلاش' میں جمالیاتی حسیت اور آسودگی بصورت متاع گم گشتہ محسوس کی جاسکتی ہے کہ جس کی تلاش کا کرب منعکس ہوا ہے۔

علامتی پیرایۂ اظہار میں رقم کیا گیا افسانہ 'تلاش' میں واحد متکلم اپنے دوست کی تلاش میں سرگرداں ہے، جب کہ اس کا دوست ترقی معکوس کی بے لذتی سے اکتاہٹ کا شکار اور فطری زندگی کا متلاشی ہے۔ خیال کی نازکی اور لطافت اظہار سے مزین افسانے میں پیش کردہ فطرت کی تلاش سعیِ پیہم کا یہ سلسلہ کہر آلود اور شبنمی احساس کے جلو میں قاری کو ایک عالم استغراق میں مبتلا کیے دیتا ہے۔

''میری نظر ایک ننگ دھڑنگ شخص پر پڑی، وہ ایک کونہ میں بیٹھا ہڈی سے گوشت نوچ کر کھا رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک برہنہ عورت کھڑی تھی اور بڑی حسرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ میرا دوست تھا۔ اچانک اس نے ہڈی عورت کی جانب پھینک دی، عورت نے ہڈی اٹھالی اور بہت اطمینان سے اسے نوچنے لگی اور میرے دوست کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ایسی خوشی جس کی اسے تلاش تھی۔''

افسانہ 'چٹان' اپنی کیفیت اور مزاج کے اعتبار سے افسانہ 'تلاش' کا ہم قبیل ہے لیکن اس کے برتاؤ عمل اور نتیجۂ فکر میں بعد ہے اور قاری کو فکر کی ایک نئی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ افسانے میں معنی خیز دو کردار وجود اور امید اپنی اپنی فکر اور زندگی گزارنے کے انداز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ امید معنوی اعتبار سے اور فکری طور پر بھی رجائیت پسند (Obtimist) ہے۔ لیکن وجود اس کے برعکس منفی سوچ کے حصار میں قید نظر آتا ہے، وہ کہتا ہے:

''..... روسو نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے.....''

وجود تنہائی پسند کردار ہے اور فطرت کے نشاط انگیز اور شانت فضاؤں کا حامی ومتلاشی، وہ سوچتا ہے:

آج سے کروڑوں سال پہلے، زندگی کتنی حسین تھی۔ انسان بالکل آزاد، فطرت کی آغوش میں مچلتا تھا.....''

اور یہ بھی۔

''ہاں (میں) تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ فطرت ہے۔''

اور پھر دوسرے دن ایک عورت اور ایک مرد نے دیکھا:

''چٹان کے نیچے وجود گرا پڑا تھا..... وجود کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔''

افسانہ 'تلاش' کا کردار، فطرت کی آغوش میں پناہ گزیں ہوتا ہے۔ جب کہ 'چٹان' کے وجود کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ لگ بھگ ہم مزاج دو افسانوں کے دو اختتامیہ فکر وتدبر کی اور زندگی جینے کے نظریوں کے دو مختلف نکتوں کو نمایاں کرتے ہوئے دو متضاد راہیں وا کرتے ہیں —!

اسٹیونس نے کہا ہے:

''افسانے کو مجموعی طور پر واضح نہیں ہونا چاہیے، اس میں تو ایک رمز وایما کی کیفیت سب سے زیادہ ضروری ہے۔''

اس نقطۂ نظر سے عبدالمتین کے اکثر افسانے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے گویا وہ اسٹیونس کے ہم نوا ہیں۔ انسان کی زندگی سمندر کی سی گہری اور مختلف کیفیتوں کی حامل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے افسانہ 'سمندر کا آئینہ' رمز وایما کی کیفیت

اورابہامی حسن کا آئینہ دار ہے:

''میں محوِ سفر تھا اور وہ ہم سفر۔مگر ہر قدم اٹھانے کے بعد مجھے محسوس ہوتا کہ میرا یہ پہلا قدم ہے..... سامنے دیکھا تو راستہ ختم تھا اور ایک عظیم سمندر رواں تھا..... سمندر بپھر پڑا اور اس کی موجیں آسماں سے باتیں کرنے لگیں..... پھر آہستہ آہستہ سمندر کا غیظ وغضب کم ہوتا گیا اور سمندر پرسکون ہوگیا،بالکل آئینہ کی طرح خاموش اور غیر متحرک.....''

'سمندر کا آئینہ' زندگی کی تفسیر ہے، کامیابی ناکامی، طوفان وحوادث اور سکون و عافیت کی نیرنگیوں سے یہ دنیا بھری پڑی ہے اور اس میں انسان بے پتوار کی کشتی کی مانند بہے چلا جارہا ہے:

''..... سمندر متحرک ہوگیا۔ زبردست موجیں اٹھنے لگیں میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پھر میں تھک گیا۔ میں نے خود کو موجوں کے حوالہ کردیا۔ میں بہتا چلا جارہا تھا۔ معاً میری نظر پاس ہی ایک کشتی پر پڑی۔اس میں پتوار رکھا تھا اور کھینے والا کوئی نہ تھا.....''

'سمندر کا آئینہ' دراصل زندگی اور حادثات زندگی کے کنفیوژن سے عبارت ہے۔ اس کی جادوئی سچائی (Suspension of disbelief) کافنی اثر قاری کے ذہن کو مسخر کیے دیتا ہے۔اور یوں نظر کے سامنے نئے افق نمودار ہوتے ہیں۔

'عورت' اردو افسانے کا دلچسپ، مستحکم اور ناقابل فراموش حصہ ہے ہمارے افسانہ نگاروں نے عورت کی جبلت اس کی تہہ داری اور ناقابل تسخیر پیچیدگیوں کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔کرشن چندر کا افسانہ تائی ایسری، شہزادہ، منٹو کا ہتک،موذیل، بیدی کا اپنے دکھ مجھے دے دو، لاجونتی اور قرۃ العین حیدر کے ناولٹ 'چائے کے باغ' اور 'اگلے جنم مجھے بٹیانہ کیجو' وغیرہ، اس رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عبدالمتین کی افسانوی کائنات بھی عورت کے مختلف النوع روپ کی رنگ آمیزی سے مزین ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورت کے مختلف روپ کو کئی زاویے سے اس کے دلچسپ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ہنرمندی اور فن کے جوہر دکھائے ہیں۔

عبدالمتین کے افسانوں میں عورت کا وجود حیات وکائنات کے تعلق سے وسیع تر معنی اور مختلف النوع تناظر میں جلوہ گر ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت محض دل بستگی کا ذریعہ اور آرائش حیات نہیں۔

عبدالمتین کے افسانوں کی عورت حیات وکائنات میں،حیات افروز بھی ہے اور زندگی کی تمام تر نیرنگیوں اور کثافتوں کی بھی تصویر ہے۔گویا یہ اقبال کی اس فکر کی تفسیر وتعبیر ہے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

عبدالمتین کے افسانوں میں عورت پرشکوہ اور طاقتور استعارہ ہے،اس استقامت کے تحت ان کے افسانوں میں ہمہ جہت معنوی تلازموں کی دلکش صورت حال خلق ہوئی ہے۔ان کا خیال ہے:

''..... عورت بہت حساس ہوتی ہے.....'' (سوال)

لہٰذا اپنے افسانوں میں عورت کے مختلف النوع روپ اورنہاں خانۂ دل کی کیفیتوں کی پیش کش میں عورت کی حساسیت کو انھوں نے ملحوظ رکھا ہے۔

افسانہ 'تنفر' اور 'تھوک' میں عورت کی نفسانی کیفیت کی نفسیات کے عقدۂ سربستہ کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ، اس کے نہاں خانۂ دل کا بھید کھل کر بھی بظاہر عقدۂ لاینحل ہی رہتا ہے اور بصورت ابہام حسن جلوہ گر ہوتا ہے۔

افسانہ 'نیم کا درخت' میں عورت ایک پراسرار ہستی کے طور پر ابھرتی ہے،اس افسانے کی فضا رہسیہ اور اسرار میں گندھے ہوئے لب ولہجہ اور اظہار بیان کی پرتجسس کیفیت لیے ہوئے ہے،لہٰذا اس کی قرأت موسیقی کی سی سحرخیزی سے ابتدا تا انتہا مسحور کیے دیتی ہے۔

ان کے یہاں عورت وفا وخودسپرگی اور ایثار کی کیفیتوں میں مجسم دکھتی ہے(مجرم/ نیا رشتہ) تو کبھی عیاری اور بے وفائی کی کثافتوں میں ملفوف بھی ہوجاتی ہے (غلط فہمی / پردہ) یہ عورت زندگی میں رنگ بھرنے والی محبوبہ کے طور پر زندگی کو نیرنگیوں اور شادکامیوں کی راہیں بھی دکھلاتی ہے۔ (ماوراء/عکس سے پہلے عکس کے بعد) یہ دامن عصمت وعفت کی نگہبان بھی ہے۔ (نور کا ہالہ) اور داغدار ہوجانے پر اپنی جان قربان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔(پیراڈکس/لمس کی پرچھائیاں)

عورت نئی فکر اور نئی تہذیب میں اس قدر دور نکل آئی، کہ اکثر اسے اپنی متاع عزیز کی اہمیت کا نہ احساس ہوتا ہے اور نہ اس کے کھوجانے پر اس کے دل میں کوئی ملال،کوئی تاسف کی کیفیت ابھرتی ہے:

''بیٹی تمھیں کیا ہوگیا ہے، بتاؤ تو سہی،کوئی تکلیف ہے؟''

''نہیں ممی کوئی تکلیف نہیں،مگر ایک غلطی ہوگئی۔''

ممی کا ماتھا ٹھنکا،مگر پھر بھی انھوں نے مزید دریافت کیا۔

''کیسی غلطی؟''

''یہی غلطی کہ میں کونٹرا سیپٹیو (Contraceptive) کا استعمال کرنا بھول گئی تھی.....''

لیکن اس کے برخلاف افسانہ 'برقع' میں عورت کا وہ روپ بھی عکس ریز ہے کہ جہاں عورت تہذیب وروایت کی پاسداری میں ذہنی اور عملی طور پر منہمک دکھتی ہے افسانہ 'خانہ بدوش' میں زندگی کی لایعنی، غیر پائیدار، مشقت آمیز ڈگر پر بڑے عزم اور تندہی کے ساتھ رواں دواں بھی نظر آتی ہے۔

عبدالمتین کی افسانوی کائنات میں موضوعات کا تنوع اور انوکھا پن بھی نمایاں ہے۔ جہانِ آب وگل کے نظاروں،فطرت کی نیرنگیوں،انسان کے تیزی سے ترقی کی اور بڑھتے قدموں،مسائل حیات اور افراد کے ظاہری وباطنی مدوجزر کی کیفیتوں کو افسانے کے قالب میں منتقل کرنے کے ہنر اور جوہر سے یہ پوری طرح بہرہ یاب ہیں۔ اگرچہ ان کے زیادہ تر افسانے نہایت مختصر ہیں تاہم معنوی اور موضوعی اعتبار سے ان کا وژن وسیع تر ہے۔

یہ عہد ترقی پذیر ہے۔یہاں ہرلمحہ انسان اپنی ذہانت وتدبر، جستجو اور تلاش پیہم کے طفیل نئی دنیا دریافت کررہا ہے اور ترقی کی منزلیں سر کرتا جارہا ہے۔اس تعلق سے ان کا افسانہ 'الٹی ہوگئیں سب تدبیریں' ایک بہترین تخلیق ہے۔ یہ افسانہ اس وقت لکھا گیا جب میڈیکل سائنس نے پہلی دفعہ برین گرافٹنگ کا معجزاتی کارنامہ انجام دیا، اور ٹرانسپلانٹیشن کے عمل کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔لیکن یہ انسان کا کارنامہ ہے۔ قدرت کے نظام میں انسان کے مختلف اعضا کی کارکردگی کا دائرہ طے ہے، لہٰذا قدرت کی تخلیق انسان اور انسان کی تصوراتی تخلیق افسانہ میں، آپریشن کی کامیابی کے ساتھ ہی ایک حیران کن اور دلچسپ لیکن تفاوتی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے،اس کے زیر اثر افسانہ 'الٹی ہوگئیں سب تدبیریں' فنی چابک دستی اور خیال کی ندرت کا نادر نمونہ بن جاتا ہے۔ عبدالمتین کے اس افسانے کی حیثیت گویا برین گرافٹنگ کے معجزاتی کارنامے کے متوازی فنی شاہکار کی ہے۔

ہر ترقی کا کوئی نہ کوئی تاریک پہلو بھی ہوا کرتا ہے۔ انسانوں کی اپنی محافظت میں ایجادات اور اٹھائے گئے مختلف اقدام اکثر انسان کے لیے باعث تباہی اور انسانیت کے لیے سوہان روح بھی ہوجایا کرتے ہیں۔

دنیا نے 1945 میں ہیروشیما پر اٹیک کے اندوہناک نتائج کو دیکھا اور جھیلا ہے۔ یہ نیوکلیر اٹیک ایسا تھا کہ بم گرائے جانے کے وقت یعنی، جب یہ جہاز سے نکلا اور پھٹنے تک محض 45 سکنڈ بعد اس میں موجود دھماکہ کے نظام شروع ہوگئے، اس کا ٹھوس مادہ بکھرنے لگا اور لاتعداد توانائی، انسان اور انسانیت کے خاتمے کے درپے ہوگئی۔

ملکی سطح پر بھوپال گیس سانحہ (3/12/1984) دنیا کا سب سے دردناک صنعتی تباہی کا نشان ہے۔ یونین کاربائیڈ لمیٹیڈ میں کیمیکل ری ایکشن کے نتیجے میں گیس لیک ہوئی۔ لوگوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ 2 اور 3 دسمبر کی درمیانی رات کی گویا صبح نہ ہوگی۔ یہ گیس آناً فاناً بھوپال شہر میں پھیل گئی اور سارا پانی زہریلا ہو گیا۔ تین نسل بعد بھی اس کے اثر سے بچے اپاہج پیدا ہو رہے ہیں۔

نیوکلیر جنگ کے اندیشوں اور امکانی تباہ کاریوں کو نشان زد کرنا عبدالمتین کا افسانہ 'کائنات کی موت' ہمیں عجیب سی المناک سناٹگی میں ڈبوئے دیتا ہے۔ کائنات کو ویران کرنے والے خدشات سے پرے انسان بنیادی طور پر فطرت اور حسن کائنات کا دلدادہ ہے۔ اس خیال کا عکس افسانے کے ابتدا میں ابھرتا ہے:

''..... حسن ازل کا پردہ کائنات پر نمودار ہونے کی خواہش عملِ تخلیق، وجود زن اور عروج آدم کے تصورات کو اس نے چھوٹے کینوس پر پکاسو کی لکیروں والی ٹکنیک سے اس طرح پیش کیا تھا کہ مشاہدین محو حیرت ہو گئے..... وجود زن کے تصور کو پیش کرنے میں اسے اپنی محبوبہ لی لی سے کافی انسپریشن ملا تھا، لی لی کے حسن میں کروڑوں سال کی انسانی تہذیب و تمدن اور حسن کا اس نے سراغ لگایا۔''

کروڑوں سال کے انسانی تہذیب و تمدن اور حسن کو وجود زن کے سہارے منعکس کیا گیا ہے کہ وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ۔ لیکن زندگی کا المیہ یہ ہے کہ ہمیشہ اس کے حسن اور اس کی نیرنگیوں کو تضاد کا سامنا ہوتا ہے۔ انسان کو حسن کا تضاد کسی صورت قابل قبول تو نہیں۔ لیکن ادب میں، افسانوی کائنات میں، زندگی کی سچائیاں جب بیان ہوں گی، زندگی کا حسن اور اس کی المناکی بھی زیر بحث آئے گی۔ اس افسانہ 'کائنات کی موت' کی ابتدا میں جارج کی حسن پرستی اور اس کی آراستگی کی کاوش نمایاں ہے، لیکن افسانہ نگار نے زندگی کے فطری حسن اور مظاہر قدرت کی دلکشی کے مقابل، اس سے چھیڑ چھاڑ اور ذہن کی سفاکیت کو عکس ریز کرنے میں اور اس کے بھیانک اور اندوہناک نتائج کو ابھارنے کے لیے، تضاد کی کیفیت پیدا کی ہے، افسانے میں یہ تضاد جس کے زیر اثر کائنات کی تباہی کے امکانات ابھرتے ہیں، دراصل فنی حسن اور ہنرمندی کا بہترین نمونہ ہے۔ دیکھیں افسانے کا اختتامیہ:

''..... جب غار سے باہر آئے تو دیکھا سارے درخت جل چکے ہیں۔ سبزہ کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے بھٹی میں ہیں۔ دھوپ میں اتنی حدت تھی کہ بدن سے چنگاری پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی

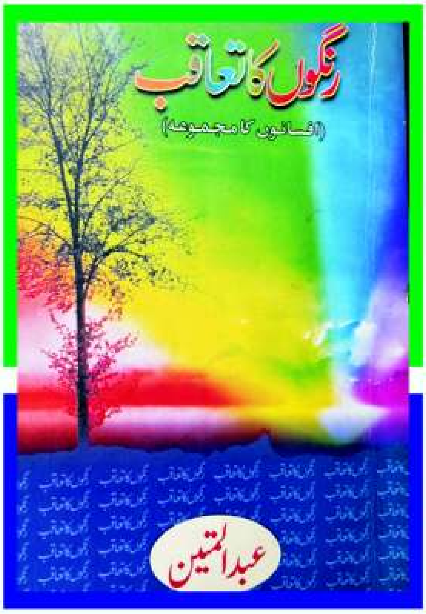

تھی بہت تگ و دو کے بعد ایک چشمہ کے پاس پہنچے۔ لی لی نے جھک کر چلو سے پانی لے کر پیا۔ پانی پیتے ہی وہ حلق پکڑ کر بیٹھ گئی۔ جارج نے اسے سنبھالنا چاہا اور جوں ہی اس کے ہاتھ کو پکڑا، اس کے ہاتھ میں لی لی کے ہاتھ کے چمڑے، دستانے کی طرح اتر گئے۔''

افسانہ 'کائنات کی موت' ترقی کی راہ میں سرگرداں انسان کے اس جبلی جذبے، کو اس کی خود کی ایجاد نیوکلیر طاقت نے ایک ایسی راہ پر گامزن کر دیا جہاں، اس کے حصے میں سناٹگی، وحشت اور بے بسی تھی، اور:

''کائنات خاموش تھی۔''

عبدالمتین کے موضوعات انسان اور انسان کی امنگوں زندگی اور زندگی کے مسائل سے عبارت ہیں۔ لہٰذا ان کے افسانوں کے موضوعاتی تناظر میں وسعت بھی ہے اور ان کے برتاؤ میں حسن و دلکشی اور زندگی کا سوز بھی۔

افسانہ 'جبلت' رومی نامی لڑکی سے راکٹ (کتے) کی مانوسیت کی المناک کہانی پیش کرتا ہے:

''..... یک بیک راکٹ آگیا اور کندھے پر اپنی گردن رکھ کر اپنے روئیں دار منہ کو اس کے گال پر دھیرے دھیرے رگڑنے لگا.....''

''آج رومی تم نے تو.....'' یک بیک ان کی نظر رومی کے چہرے پر پڑی اور وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر پوچھ بیٹھے۔ رومی تمھارے چہرے پر یہ خراش کیسی؟

''جی راکٹ نے.....'' رومی کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں۔ کتے کو شوخ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

آج اونچی سوسائٹی میں کتے پالنے اور اسے مانوس کرنے کا رجحان اور شوق پرورش پا رہا ہے، اور اس بڑھتی ہوئی چاہت اور مانوسیت کے دائروں میں کتے کا عمل دخل، اکثر خطرناک ہو جاتا ہے جبلت اکثر منہ زور اور بے قابو گھوڑے کی طرح سر اٹھاتی ہے، جسے شعور کی قوت سے پسپا کیا جا سکتا ہے، لیکن جانوروں میں شعور تو ہوتا نہیں، لہٰذا ان کی جبلت اکثر اندوہناک ہو جاتی ہے۔ ایسی غیر متوقع اور خطرناک صورت حال کو ہنرمندی اور فنکاری سے عکس ریز کرنا عبدالمتین کا افسانہ 'جبلت' موثر انداز بیان کے سہارے اس موضوع کی کچھ ظاہری اور کچھ بین السطور کے تحت روداد بیان کرتا ہے۔

انسان مختلف صورت حال میں مختلف اعمال کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن اکثر وہ مثبت و منفی فکر کی زور آزمائی اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا بھی رہتا ہے۔ ایسی فطری کیفیت کی عکاسی ان کے افسانہ 'وہ اور میں: وہ اور میرا بچہ' میں نہایت خوبصورتی اور فنکاری کے ساتھ منعکس ہوا ہے۔ اپنے موضوعی حسن اور اسلوب بیان کے دلکش پیرائے کے لیے یہ ان کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جائے گا۔

عبدالمتین کے افسانوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی خیال، تصور یا کیفیت کے اظہار کے لیے بہترین سلجھے ہوئے اور مضبوط بیانیے کے سہارے نہایت ہنرمندی اور فنکاری کے ساتھ اپنے افسانوں کی دنیا تخلیق کی ہے۔ وہ اپنے بیانیے کو جا بہ جا علامت اشارے اور استعارے سے پر معنی بنا دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معنی خیز اور وہ دور رس جملوں کے سہارے وہ اپنے منفرد اور اثر انگیز بیان میں کہانی پن کے عناصر کو بطریق احسن ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اکثر کردار چند لمحوں کے لیے یا چند مکالموں کی ادائیگی کے لیے اچانک نمودار ہوتے ہیں اور پھر غائب۔ لیکن یہ عمل افسانے کے مواد موضوع اور کیفیت و ہیئت کو با معنی اور موثر بناتے ہیں۔

عبدالمتین کی شخصیت میں خاموشی، سنجیدگی اور متانت فطری طور پر رچی بسی تھی، ان کی افسانہ نگاری کا عمل بھی اسی نہج پر یعنی نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ، کے مصداق رواں دواں تھا۔ لہٰذا ان کا ثروت مند افسانوی ادب ارباب نباض کی نظروں سے گویا اوجھل ہے۔

عبدالمتین کی افسانوی دنیا نباض ادب اور محقق ادب کے نگاہ التفات کی منتظر ہے!

■

Ishrat Zaheer
House No: 470 A, Gali No.: 6A
Zakir Nagar, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 9801527481

ہمایوں اشرف

کیف عظیم آبادی

کیف عظیم آبادی، اردو کے ایک قابل قدر شاعر ہیں۔ان کا شمار پختہ گو، قادر الکلام اور واضح فکری میلان رکھنے والے اساتذہ میں ہوتا ہے۔انھوں نے مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی۔غزلیات،قطعات،رباعیات، حمد ونعت، سہرے اور قصیدے، بہت کچھ یادگار چھوڑے لیکن ان کا اصل میدان غزل گوئی تھا۔ کیف دل نشیں شاعری اور پُرکیف آواز کے لیے خاصے مشہور تھے۔اپنی سخن سرائی اور نغمہ سنجی کے سبب وہ اردو اور ہندی داں حلقوں میں یکساں مقبول تھے۔اردو میں ان کے تین شعری مجموعے 'صداؤں کے سائے' (مجموعۂ غزلیات: 1982)، 'انگنائی' (مجموعۂ قطعات 1986)، 'اپنے لہو کا رنگ' (مجموعۂ غزلیات 1988) اور دیوناگری رسم الخط میں 'سنولائی دھوپ'، 'لہریں' اور 'پچھلے پہر کی بانسری' کے عنوان سے ان کی زندگی میں ہی اشاعت پذیر ہو چکے تھے اور ان پر عطا کاکوی، پروفیسر محمد محسن، ڈاکٹر عبدالمغنی، شفیع مشہدی، بشیر بدر، علیم اللہ حالی، خورشید سمیع، اسرائیل رضا، اعجاز علی ارشد، احمد حسین آزاد، شاداب رضی، انور پاشا، نریندر کمار نوین، ستیش راج پشکرن، جے شنکر پرساد، شنکر دیال سنگھ جیسے اردو و ہندی کے معروف قلم کاروں نے خامہ فرسائی بھی کی ہے۔ ایچ.ایم.وی. اور ٹی سیریز جیسی نامور میوزک کمپنیوں نے کیف کی غزلوں کے آڈیو کیسیٹ بھی تیار کیے تھے جو ہاتھوں ہاتھ خوب بکے اور آج بھی پسند کیے جاتے ہیں۔کیف مقامی، قومی اور بین الاقوامی مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے روح رواں تھے۔ان کی شرکت شعری محفلوں کی کامیابی کی ضامن تصور کی جاتی تھے۔وہ پیدا تو عظیم آباد میں ہوئے لیکن ان کی آواز کی سحر انگیزی جغرافیائی حدوں کو پھلانگتی ہوئی دور دور تک محسوس کی گئی۔ ملکی سطح پر تمام چھوٹے بڑے مشاعروں میں تو وہ لازمی طور پر شریک ہوتے ہی تھے۔ دوبئی، شارجہ، ابوظہبی، العین، جدّہ، ریاض، اسلام آباد اور کراچی کے مشاعروں میں بھی نغمے بکھیرنے کے لیے وہ مدعو کیے جاتے تھے۔

کیف عظیم آبادی کی پیدائش 8 جون 1937 کو محلہ شاہ گنج، محمد پور، پٹنہ میں ہوئی تھی۔ان کا اصل نام محمد یٰسین اور تخلص کیف تھا۔عظیم آباد ان کا وطن تھا، اسی مناسبت سے عظیم آبادی لکھتے تھے۔کیف کے دادا عبداللہ مرحوم، تحریک مجاہدین (صادق پور، پٹنہ) کے ایک سرگرم رکن تھے۔کیف کے والد کا نام عبدالغفور تھا،جن کے گھر تین بیٹے محمد لقمان، محمد یٰسین، محمد اکرام اور ایک بیٹی زینت النساء پیدا ہوئی۔کیف کے بڑے بھائی محمد لقمان پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور چھوٹے بھائی محمد اکرام عظیم آباد کے آبائی مکان میں ہی سکونت پذیر رہے۔ یہ تمام بھائی بہن اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔

کیف کے والد کی مدرسہ شمس الہدیٰ کے نزد، سائنس کالج، پٹنہ کے سامنے سلائی کی ایک معمولی سی دکان تھی۔ابھی کیف کا بچپن ہی تھا کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔غمِ روزگار سے مجبور ہو کر تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا اور انہیں اپنی آبائی دکان کو ہی اپنا مرکز اور محور بنانا پڑا۔

> کیف عظیم آبادی نے غزل کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، گیت، سہرا اور قطعات لکھے ہیں لیکن ان کی تخلیقیت کا اصل جوہر ان کی غزلیہ شاعری میں کھلتا ہے۔ وہ روایت آشنا اور اپنے عہد کی حقیقتوں کا ادراک رکھنے والے، اعلیٰ تہذیبی اقدار کے پاسدار، مستقل مزاج اور صاحب شعور تھے۔ انھوں نے اپنی ریاضت اور صلاحیت سے روایت کو تازہ کار بنایا، جس کے باعث ان کے کلام میں داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر تازگی اور دل کشی کا احساس ہوتا ہے۔

کیف صاحب ایک نہایت مخلص، نیک طینت، منکسر المزاج، نرم گفتار، قناعت پسند اور حساس انسان تھے۔ خاکساری اور وضع داری ان کی شخصیت میں رچی بسی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی دکان ایک ادبی مرکز میں تبدیل ہوگئی۔ جہاں گاہکوں کے ساتھ ہر عمر اور ہر مکتبِ فکر کے ادبا وشعرا کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کیف عظیم آبادی خندہ پیشانی سے انہیں بیٹھاتے اور تا دیر ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلائی کی دکان بند ہوگئی اور شعری دکان کھل گئی۔ کیف عظیم آبادی 19 نومبر 1979 کو دورانِ سفر ایک شدید حادثے کا شکار ہوئے، جس کی نذر ان کی داہنی ٹانگ ہوگئی۔ اس کے بعد انھیں بقیہ عمر بیساکھی کے سہارے گزارنی پڑی۔ وہ تقریباً اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، لیکن ان کے دوست واحباب قدم قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ تاہم حادثے کے بعد کی زندگی کے تلخ حقائق اور مایوس کن حالات کی پرچھائیاں ان کی شاعری میں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ 24 جنوری 1994 کو پٹنہ کے اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیلوجی میں محض 56 سال کی عمر میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

کیف عظیم آبادی نے غزل کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، گیت، سہرا اور قطعات لکھے ہیں لیکن ان کی تخلیقیت کا اصل جوہر ان کی غزلیہ شاعری میں کھلتا ہے۔ وہ روایت آشنا اور اپنے عہد کی حقیقتوں کا ادراک رکھنے والے، اعلیٰ تہذیبی اقدار کے پاسدار، مستقل مزاج اور صاحب شعور تھے۔ انھوں نے اپنی ریاضت اور صلاحیت سے روایت کو تازہ کار بنایا، جس کے باعث ان کے کلام میں داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر تازگی اور دل کشی کا احساس ہوتا ہے۔ کیف کی شاعری میں تنوع اور رنگارنگی ہے۔ ان کے یہاں رومان وحقیقت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ صحت مند روایت اور جدید حسیت کے عناصر ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ترقی پسندی کے خصائص بھی ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں خلوت و جلوت، ہجر و وصال، کیف و سرمستی، حظ و انبساط کے جلوے ان کی شاعری میں جلوہ فگن ہیں۔ 1965 کے بعد ان کی شاعری کے رنگ وآہنگ میں ایک نئی تبدیلی در آتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کے مثبت اور منفی دونوں پہلو در آئے ہیں۔ زندگی کے مختلف رنگوں کو وہ اپنے کلام میں کیف و سرور اور شائستگی اور شستگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ بہت کیف آگیں اور کیف آور ہوتا ہے، جس میں جدت، تازگی، لطافت، نزاکت، ملاحت، فصاحت اور بلاغت کے عناصر ملتے ہیں۔ وہ اپنے تجربات واحساسات کو مدھم اور نرم ولطیف پیرائے میں تخلیقی ہنر مندی اور فنی چابک دستی سے پیش کر کے اپنی انفرادیت کا نقش ثبت کرتے ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی کی یہ رائے مبنی برحقیقت ہے کہ:

''کیف نے اپنی غیر معمولی طباعی اور تخلیقیت کے زور پر الفاظ کو نئی معنوی جہتوں سے روشناس کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک الفاظ لغات سے نکل کر نئے مفاہیم کے اشارہ نما نہیں بنتے، اس وقت تک اچھی شاعری کا جز نہیں بن سکتے۔ کیف عظیم آبادی نے لفظوں کو معنوی وسعت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ایک دل آویز آہنگ سے بھی آشنا کیا ہے اور یوں ان کے لہجے میں الفاظ سرور نغمے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ یہ گنگناتے بھی ہیں اور بسا اوقات رقص کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

(بحوالہ' کیف عظیم آبادی: مقام وکلام' مرتبہ: زرنگار یاسمین، ص 4)

کیف اپنے مشاہدات اور محسوسات کو ذہنی بالیدگی سے کام لے کر فنی وفکری سطح پر بہت ہی حسین وجمیل پیرائے میں سامنے لاتے ہیں۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت جمالیاتی حسن، شعریت، تغزل، نغمگی، شیرینی اور موسیقیت ہے۔ یہاں ان کے چند اشعار پیش ہیں۔

وہ شخص عمر بھر جو فرشتہ بنا رہا
کم حوصلہ تھا خود ہی تماشا بنا رہا

میں کس کو اپنا کہہ کے بلاتا جہان میں
ہر آئینہ خلوص کا دھندلا ملا مجھے

تم سمندر کی رفاقت پہ بھروسہ نہ کرو
تشنگی لب پہ سجائے ہوئے مر جاؤ گے

کل حادثہ میں مرنے سے پہلے ہی زندہ لوگ
جیبیں ٹٹولتے تھے وہ منظر عجیب تھا

پھیلی ہوئی ہے شہر میں عریانیت کی آنچ
تہذیب کے بدن سے قبا کون لے گیا

حال نہ پوچھو پڑھ کر دیکھو
ہر چہرہ اخبار ہے بابا

میں سمندر سے پیاسا لوٹ آیا
جاگ اٹھی تھی میری انا مجھ میں

راہ چلتے ہوئے شوکیس کو دیکھا نہ کرو
کرب ہی کرب لیے لوٹ کے گھر جاؤ گے

میری صورت پہ سب گئے لیکن
کس کو فرصت تھی جھانکتا مجھ میں

اس امنڈتے ہوئے چہروں کے سمندر میں کوئی
جو شناسا سا لگے آؤ وہ چہرہ ڈھونڈیں

کاندھے پہ مصلحت کا جنازہ لیے ہوئے
بہروں کی انجمن میں زباں کھولتے رہے

کیف کی غزلوں میں خیال انگیزی ومعنی آفرینی بھی ہے اور حسن وجمال بھی۔ مجھے پروفیسر اعجاز علی ارشد صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ ''کیف فکر وفلسفہ سے زیادہ احساس اور جذبہ کے شاعر ہیں''۔ ان کی شاعری میں جہاں اظہار ذات، داخلی، ذہنی انتشار، محرومی، تنہائی، تشنگی، بے چہرگی، بے اعتباری، غم وخوشی کے احساس کروٹیں لیتے نظر آتے ہیں وہیں معاشرے کی بدنظمی، تہذیبی قدروں کی پامالی، سماجی ناانصافی، معاشی استحصال، زمانے کی بدعنوانیاں، مکروفریب، فرقہ وارانہ زہر افشانی، خوف و ہراس، فسادات اور قتل و غارت گری سے پیدا ہونے والی صورت حال کا پرتو بھی جا بہ جا بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ کیف کی شاعری پر ''جدیدیت'' کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ ان کا کلام کلاسیکی رچاؤ اور عصری حسیت دونوں کا آئینہ دار ہے۔ پروفیسر عطا کاکوی نے ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ ''کیف کے کلام میں جدت ہے، جدیدیت نہیں''۔ پروفیسر محمد محسن عظیم آبادی، کیف عظیم آبادی کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

''کیف کی شاعری عصری حسیت کی فنکارانہ ترجمانی ہے اور یہی ان کا وصف ہے۔ ان کی شاعری جدید حسیت کی پوری آئینہ داری کرتی ہے۔ ان کے لب و لہجے میں جدید ترین عصری تقاضوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جدیدیت کے غیر صحت مندانہ میلانات سے بیزاری کا دوٹوک اظہار کیف نے کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور واردات قلب کے اظہار میں مبہم استعاروں اور پیچیدہ علامتوں سے کام نہیں لیتے۔ وہ غزل کے لوازم کا احترام کرتے ہوئے رمز وکنائے کا بھی استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا کلام قاری کے لیے معمہ نہیں بن جاتا۔''

بلاشبہ کیف کی شاعری محرومی، تنہائی، بے چہرگی، بے چارگی اور تشنگی کا نوحہ نہیں، کسک ہے، زندگی سے مکالمہ اور امکانات کی تلاش کے ساتھ ان کے کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ناآسودگی، بے چارگی کی شکل میں ظاہر نہیں ہوتی بلکہ احتجاج کی دبی ہوئی لے بن کر ابھرتی ہے اور واردات قلب احساس وتجزیے کے عمل سے گزر کر شاعرانہ سطح پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں جدید تراکیب، تشبیہات و استعارات، پیکر تراشی اور لفظی صنعت گری کے نمونے ملتے ہیں لیکن اس عمل میں وہ توڑ پھوڑ اور شکست وریخت کو روا نہیں رکھتے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں ابہام وپیچیدگی کے بجائے دلکش وپُرکشش

سادگی اور پُر کاری ملتی ہے۔ ان کے لب و لہجے اور رنگ و آہنگ میں ندرت اور تازہ کاری جھلکتی ہے۔ وہ اردو، فارسی الفاظ کے دوش بدوش ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ کو اس طرح استعمال میں لاتے ہیں کہ کلام میں ایک خاص قسم کی دلکشی، جاذبیت اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گاؤں کی دھرتی بانجھ ہوئی ہے پنگھٹ سونا سونا ہے
پیپل کے پتوں میں چھپ کر ڈھونڈتی ہے تنہائی دھوپ
اوشا کی وہ شیتل کرنیں لہروں سے جب کھیلتی ہوں
سندرتا کی مورت بن کے نیل کنول میں آجانا
جیون کے اندھیارے پتھ پر سارے ساتھی چھوٹ گئے
ذہن میں پت جھڑ ہی پت جھڑ ہے یادوں کی مدھو ماس نہیں
چلتی پھرتی زندہ لاشیں کیف ہمارے یگ کے لوگ
چہرہ ہے جذبات سے عاری دل میں کوئی احساس نہیں
راتوں کی تنہائی میں یوں ہی خواب سنورتے رہتے ہیں
یادوں کے درپن میں اکثر عکس ابھرتے رہتے ہیں
چلتے پھرتے لوگوں میں اب جینے کا احساس نہیں
گاؤں کا پنگھٹ سونا سا ہے شہروں میں ویرانی ہے
شنکر بن کر زہر پیو تو امرت دھارا برسے گی
دنیا شاید بھول گئی ہے گنگا جل کے بارے میں

غزل روایتی ہو یا جدید اس میں تغزل نہ ہو تو ایسی غزل قابل توجہ نہیں ہوتی۔ جہاں تک کیف عظیم آبادی کا تعلق ہے، وہ اردو غزل کے قدیم اور جدید اسلوب سے اپنی شاعری کا خمیر تیار کرتے ہیں، جس کی موسیقیت قاری کے کانوں میں رس گھولتی ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں گاؤں کا پنگھٹ، پیپل کی چھاؤں، اوشا کی کرنیں، سندرتا کی مورت، یادوں کی مدھو ماس، شہروں کی ویرانی اور پت جھڑ کی تصویر کشی ہمیں ملک کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کا احساس دلاتی ہے۔ کیف کے ان اشعار میں سرگم کی لے ہے جو زندگی کو حقیقی دھڑکنوں سے آشنا کراتی ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو جو خاص حسن، دلکشی اور جاذبیت عطا کی ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

کیف عظیم آبادی قطعات و رباعیات پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ 'انگنائی' کے قطعات میں گھر آنگن اور ازدواجی زندگی کی خوشبو رچی بسی ملتی ہے۔ یہاں مرد اور عورت کے احساسات و جذبات اور ان کی گھریلو زندگی کی دھوپ چھاؤں، محبت و چاہت، بحث و تکرار، ایثار و قربانی، صبر و قناعت، شرافت و طہارت، سادگی و بے ریائی اور شرم و حیا کی وہ تصویریں ملتی ہیں جو بلا تفریق مذہب و ملت ہمارے ملک کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کیف نے اپنے قطعات میں ملک کی تہذیبی اور روایتی قدروں کو بہت ہی ہنرمندی سے فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ بطور مثال چند قطعات پیش ہیں۔

مضمحل دل کی کیسی حالت تھی
درد تھا، غم تھا اور ندامت تھی
آج لڑنے پہ یہ ہوا احساس
آپ سے کس قدر محبت تھی

عشق کی چل رہی ہے پُروائی
ہے خفا شام ہی سے تنہائی
پھر ترے قرب کا گلاب کھلا
پھر مہکنے لگی ہے انگنائی

میری آنکھوں میں ڈال کر آنکھیں
کس محبت سے آج اس نے کہا
چائے پی کر ہی جایئے باہر
آج موسم بہت ہے برفیلا

دل میں اٹھتے ہوئے حسیں جذبات
اِک نئے رُخ پہ موڑ دیتی ہے
میز پر رکھ کے وہ مری تصویر
کتنی شردھا سے چوم لیتی ہے

میری آنکھوں میں آج پھر اس کی
کتنی سندر چھوی اُبھرتی ہے
کچی نیندوں سے اٹھ کے جاڑے میں
میرا کھانا وہ گرم کرتی ہے

'جنون و آگہی' میں کیف نے گھریلو زندگی کے برعکس دنیاوی معاملات و مسائل کو اپنے قطعات میں سنجیدگی سے برتا ہے اور سادگی و پُرکاری کے ساتھ ایسے قطعات پیش کیے ہیں جو قارئین کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

جب بھی تنہائیاں ملیں مجھ کو
ان سوالات ہی میں الجھا ہوں
کاش کوئی یہ مجھ کو بتلائے
کون ہوں میں، کہاں سے آیا ہوں

زندگی جس کو لوگ کہتے ہیں
ایک مشکل سوال ہے ساقی
لوگ تو دوسروں کو پڑھتے ہیں
خود کو پڑھنا کمال ہے ساقی

کیف عظیم آبادی کی شاعری قدیم و جدید سے ہم آہنگ ہے۔ ان کا کلام عشق و محبت کا آئینہ دار بھی ہے اور سماج و حالات حاضرہ کا عکاس بھی۔ وہ واردات قلبی اور

معاملات حسن و عشق کو ایک خاص انداز میں برتنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس انداز کو ان کا امتیاز بھی کہا جا سکتا ہے، جس میں ندرت بیان کے ساتھ تاثر بھی موجود ہے، سوچنے کا انداز بھی نیا ہے، خیالات کی بوقلمونی بھی ہے اور طرز اظہار کی رنگینی بھی۔ بلاشبہ کیف نے شعر و سخن کا جو گلستان سجایا اور گلستان شاعری میں جو گل بوٹے کھلائے ان کی رعنائی ذہن اور روح کو بہت فرحت بخشتی ہے اور ان کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے بعد ادبی مورخین و ناقدین نے انہیں فراموش کر دیا ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری کا بھرپور مطالعہ و محاسبہ نہیں ہو سکا ہے۔ ان کی باقیات تقریباً 29 سال گزر جانے کے باوجود طباعت سے محروم ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کی صاحبزادی ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے اپنے والد گرامی کے تخلیقی شہ پاروں کو ترتیب دے کر 'کیف عظیم آبادی: مقام اور کلام' کے نام سے شائع کر کے کیف شناسی کے لیے از سر نو راہ ہموار کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں جو منتخبہ کلام پیش کیے ہیں اسے بلاشبہ کیف کی شاعری کا عطر قرار دیا جا سکتا ہے۔

امید قوی ہے کہ کیف عظیم آبادی کی شخصیت اور شاعری پر سنجیدہ سخن فہموں اور انصاف پسند نقادوں کی نگاہ پڑے گی اور ان کے کلام پر غور و فکر کا سلسلہ شروع ہوگا۔

■

Dr. Humayun Ashraf
Head P.G. Department of Urdu
Vinoba Bhave University
Hazaribagh-825319 (Jharkhand)
Mob.:9771010715
Email: dr.h.ashraf@gmail.com

مشتاق احمد گنائی

کشمیری تہذیب وثقافت کا عکاس حکیم منظور

"شعری سطح پر ہمارا زمانہ مسلمات سے انحراف کے معاملے میں خاصا پُر جوش رہا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ رسموں اور روایتوں کی پاسداری کا سلسلہ بھی جاری ہے۔کچھ شاعروں نے ایک بیچ کی راہ یوں نکالی ہے کہ آزمودہ اور پرانے اسالیب اور نئے طرز احساس کا قصّہ اُن کے یہاں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔حکیم منظور کی شاعری نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش کے سبب مختلف حلقوں کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے اور عام حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی۔"

شاعر ہمارے معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ دیگر لوگوں کے مقابلے میں اپنی ذات اور وجود کے علاوہ اپنے اطراف واکناف کی ہر چیز کو ایک مخصوص نظر سے دیکھتا ہے۔غور وفکر کرتا ہے اور جو کچھ محسوس اور مشاہدہ کرتا ہے اس کا اظہار شاعری کے پیرائے میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری دنیا کے ہر ملک اور علاقے میں پسند کی جاتی ہے۔شاعری میں دلکشی اور دلفریبی کے عناصر بہ درجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔شعرا حضرات نے شاعری کے ذریعے حیات وکائنات کے بے شمار راز کھولے ہیں۔ غزل اُردو شاعری کی وہ صنف سخن ہے جو اپنی ہردلعزیزی کی وجہ سے ہر دور میں پسند کی گئی ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں غزل واحد ایسی صنف سخن ہے جو ہر عہد میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ رہی ہے۔ اگر چہ اس پر مختلف ادوار میں طرح طرح کے حملے بھی کیے گئے لیکن یہ صنف ہر مشکل دور سے گزرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتی ہے۔ابتدا سے تاحال غزل نے مختلف نشیب وفراز دیکھے ہیں اور ہر دور میں اس نے اپنی سحر انگیزی سے قارئین ادب کی ایک کثیر تعداد کے دلوں کو لبھایا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔آج بھی بہت سے لوگ شاعری سے مراد غزل ہی لیتے ہیں۔

اردو کی جملہ شعری اصناف میں غزل حکیم منظور کی پسندیدہ صنف سخن رہی ہے۔اگر چہ انھوں نے نظمیں، مرثیے، نعت اور قطعات وغیرہ بھی لکھے ہیں۔لیکن اُردو ادب میں وہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی پہنچانے جاتے ہیں۔منظور اردو غزل کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کے اساتذہ کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ لیکن وہ روایتی شاعری میں اسیر ہو کر نہیں رہتے بلکہ ان کی غزل اردو شاعری میں نئی وسعتیں پیدا کرتی ہیں۔موصوف کی غزلیہ شاعری نئی غزل کی بہترین مثال ہے۔ان کی غزلوں میں نئے احساس کی فراوانی ہے اور اس احساس کو ان کے اسلوب اور افکار میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔اگر چہ ان کے دیگر معاصرین یا تو روایت یا پھر جدیدیت میں الجھ کر رہ گئے ہیں لیکن حکیم منظور نے اپنی فکری بلندی اور گہری شعری بصیرت کے بل پر ایک درمیانی راہ اختیار کی ہے جس میں قدیم رسم و رواج اور جدید طرزِ احساس کی دلفریب آمیزش نظر آتی ہے۔انھوں نے جو کچھ بھی کہا ہے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہے اور یہی ان کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں سے الگ اپنی نئی پگڈنڈی پر چلنا پسند کیا جو آگے چل کر ان کی پہچان کا سبب بنی۔ پروفیسر شمیم حنفی حکیم منظور کی غزل گوئی میں روایت اور جدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"شعری سطح پر ہمارا زمانہ مسلمات سے انحراف کے معاملے میں خاصا پُر جوش رہا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ رسموں اور روایتوں کی پاسداری کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کچھ شاعروں نے ایک بیچ کی راہ یوں نکالی ہے کہ آزمودہ اور پرانے اسالیب اور نئے طرز احساس کا قصہ اُن کے یہاں ساتھ ساتھ چلتا ہے۔حکیم منظور کی شاعری نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش کے سبب مختلف حلقوں کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے اور عام حد بندیوں کو قبول نہیں کرتی۔" (ماہنامہ 'شیرازہ' سرینگر، حکیم منظور نمبر، ص189)

جہاں تک حکیم منظور کی غزلوں میں موضوعات کا تعلق ہے۔اس سلسلے میں ان کا سب سے اہم اور توانا موضوع کشمیر اور کشمیریت ہے۔منظور اپنے مادر وطن سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔انھیں یہاں کے ذرے ذرے

سے دیوانگی کی حد تک عشق ہے جس کی بے شمار مثالیں 'ناتمام' سے 'قلم زبان شگاف' تک ہر شعری مجموعے میں ملتی ہیں۔انھوں نے اپنی غزلوں میں اس موضوع کو بہت ہی عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔وادی کشمیر قدرت کا ایک دلکش شہکار ہے۔منظور نے عالمی سطح پر کشمیر کی خوبصورتی کو مقامی تلازموں اور ترکیبوں کے سہارے سے غزل کی صورت میں جلوہ افروز کیا ہے۔ یہاں کے نظاروں اور بہاروں کی خوبصورت تصویر کشی منظور اپنی غزلوں میں مخصوص انداز اور اسلوب میں کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

اہربل کی موج کا اپنا خرام اپنی ادا
سو گیا یہ بھی اگر ہمسر کہاں سے لائیے
تازہ دم نمکین چائے، کانگڑی، ہنستی ہوئی برف
گل بو پہنچے پھر مدعا کیا پوچھنا
کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
برف گرنے کا کبھی میں یوں ہی نظارہ کروں
بکے ہیں کس لیے اخروٹ میرے سنگ کے بھاو
بس ایک بات فقط یہ میں پختہ کار نہ تھا
لگتے ہیں سب خوش سیب صورت آج بھی منظور
کہ میں اپنے کسی عہد شکستہ کا اعادہ ہوں
گہری ہوئی ہیں اور بھی ڈل کی خموشیاں
جہلم پر جو رواں تھی وہ گفتار سوگئی
اے میرے کشمیر آنکھوں میں تیری
میں سجاؤں عرش سے آگے کے خواب
ہے لاکھوں بولتے رنگوں کا درپن
پھرن پہنی ہوئی پریوں کا آنگن

مذکورہ بالا اشعار سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ حکیم منظور کس حد تک وطن عزیز سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر پریمی رومانی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''حکیم منظور کا موضوع خاص کشمیر رہا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں اس موضوع کو نہایت ہی سلیقے سے برتا ہے۔اُن کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جس سے اس سرزمین کی خوشبو ٹپکتی ہے۔وہ تازہ اور جاندار تراکیب اور علائم بروئے کار لانے کے قائل ہیں جن سے کشمیر کی سدا بہار تصویر سامنے آجاتی ہے۔ان کا اسلوب کشمیر کی بہاروں کی طرح خوشنما اور ملائم ہے۔''

(پریمی رومانی،توازن،ص 67)

حکیم منظور نے اپنی ثقافت اور کلچر سے تادم حیات مضبوطی کے ساتھ رشتہ جوڑے رکھا ہے۔وہ اپنے بزرگوں کے بیش بہا ورثے کو جان سے بھی عزیز رکھتے تھے۔اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو اور اپنی تہذیب وثقافت کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر منظور نے اپنی غزلوں کے ذریعے متعارف کرایا ہے۔ شاعر جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کو اپنے کلام میں ضرور منعکس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔حکیم منظور کی غزلوں میں اپنی ثقافت اور کلچر کی پیش کش کے لیے پروفیسر قدوس جاوید ان کی غزل کو سخن ثقافت زاد کہتے ہیں۔چنانچہ رقمطراز ہیں:

''حکیم منظور کی شاعری میں چمن ہو کہ چنار برف ہو کہ لہو اشجار، ڈل اور وُلر کی جاں گسل سکموں سے لے کر شفق کی نرم ٹھیکروں تک ہر جگہ اپنی زمیں اپنی ثقافت سے وابستگی کی ایک فطری حرارت رقصاں نظر آتی ہے۔کشمیر اور کشمیری ثقافت کے بیان کے حوالے سے حکیم منظور کی غزل کو سخن ثقافت زاد قرار دینے کا جواز رولاں بارتھ (Rollen Barth) کے اس فقرے میں بھی ڈھونڈا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی (Geneune) فنکار خواہ کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے اپنے معاشرے،اپنی ثقافت کی جانب سے آنکھیں بند کر کے عمدہ فن پارے کی تخلیق نہیں کرسکتا... حکیم منظور کے تخلیقی عمل میں اس کا (Cultural Passage) ایک اہم بلکہ کلیدی کردار ادا کررہا ہے۔اسی لیے حکیم منظور کی غزل کو سخن ثقافت زاد کہنا غلط نہیں ہوگا۔''

(ماہنامہ،شیرازہ،سرینگر،حکیم منظور نمبر،ص 38-37)

حکیم منظور اپنے تجربات اور مشاہدات کو غزل کی زبان دینے کے لیے لفظیات کا ایک مخصوص نظام بروئے کار لائے ہیں،جس میں اس عہد کے مروجہ الفاظ، علامات اور تراکیب کے علاوہ اپنی زمین سے جڑی ہوئی بے شمار ترکیبوں اور اضافتوں کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔حکیم منظور کی غزلوں میں معنی آفرینی کو کشمیری تلازموں سے نئی وسعتیں ملی ہیں۔جس کی بدولت ان کے اشعار میں مقامیت کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔منظور نے کبھی بھی رعایت لفظی کو اپنا شعار نہیں بنایا ہے۔وہ ہمیشہ الفاظ کی جگہ افکار کو ترجیح دیتے ہیں،جس کی بدولت ان کی غزلوں میں منفرد تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔منظور بصارت سے زیادہ بصیرت، علم سے زیادہ تجربے، مطالعے سے زیادہ مشاہدے کے قائل ہیں،جس کی بدولت ان کے کلام میں تہہ داری اور معنی آفرینی میں اضافہ ہوا ہے۔کلام منظور میں جو الفاظ، تراکیب، استعارات اور علامات کلیدی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کا استعمال متعدد مرتبہ ہوا ہے، ان میں برف زاد، شہر گماں، چنار چہرے، دھوپ لہو، دھوپ بدن، سراپا جمال، درونِ جسم، صبح آتش پا، سیب شگوفے، سنگ ہوا زاد، قلم گریزاں، برف نم، لہو شجر، پھول نظر، آسمان تختی، چپ آنگن، پھول قبا، شاخ ثمر، گجر ساعتیں، برف رُت، شفق تلاوت، صبح شفق، شام شفق، شفق رنگوں، پیاسی ہوا، شفق سراب، سایہ شجر، شفق زاد، سیب صورت، لہو عبارت، پھول بستر، سنگستان، موسم سنگ، سورج امکان، وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔مذکورہ الفاظ علائم اور تراکیب کے حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھے لگتے ہیں خوش سب سیب صورت آج بھی منظور
کہ میں اپنے کسی عہد شکستہ کا اعادہ ہوں
حاصل اس ایک رنگ کا چشم پُر آب ہے
اب سایہ برف زاد کا سرد آفتاب ہے
اہرہ بل کا کتنا پانی بہہ گیا
کون سنگستان سے یہ پوچھے کہو
کس لیے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو
کون رکھتا ہے یہاں اس کی خبر میرے سوا
چھپا کے خود کو کہیں رکھ نہ پائے گی خوشبو
کہ برف جب بھی گرے مجھ تک آئے گی خوشبو
ذرا سا مطمئن ہوتا چناروں میں ہے دم باقی
میں ان کے نام گروی جان کیا اپنی انا رکھتا
شفق بدن بے قرار، ہر لمس خواہشوں سے
میں تنگ آیا ہوں اپنے دل کی نوازشوں سے

حکیم منظور کے کلام میں جو لفظ کثرت سے استعمال ہوا

ہے۔ وہ 'برف' ہے۔موسم سرما میں وادی کشمیر کے طول وعرض میں برف باری کم یا زیادہ ہر سال ہوتی ہے۔برف گرنے کا موسم قابل دید ہوتا ہے۔ برف پوری وادی کو سفید چادر میں لپیٹ لیتی ہے۔جوایک خوش نما نظارہ پیش کرتی ہے۔حکیم منظور کو برف کے ساتھ بہت ہی زیادہ انسیت رہی ہے۔اس مناسبت سے بعض مفکرین انھیں برف رتوں کا شاعر بھی کہتے ہیں۔انھوں نے برف اور برف سے متعلق متعدد الفاظ اور تراکیب وضع کی ہیں۔ جوکہ اردو غزل میں ایک اہم اور نادر اضافہ ہے۔یہاں تک کہ ان کے چند شعری مجموعوں برف رتوں کی آگ، برف آفتاب، سخن برف زاد کے ناموں سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برف کے ساتھ ان کی دلی وابستگی کس حد تک رہی ہے۔برف سے متعلق تراکیب میں برف بدن، برف رُت، عالی برف، برف زاد، خون برف، برف شب، برف زاروں، برف نواح، برف بے قلم، برف تن اشجار، برف سمندر، سلگتی برف، برف آزار سناٹے، برف ملبوس، برف شگوفے، برف آشنا، برف نم وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس حوالے سے چند اشعار دیکھیے۔

بارش بلا کی برف بدن بھی نہ تر ہوا
سایا کہ مستِ خواب رہا بے شجر ہوا
وُلر آبدیدہ ہے جہلم اُداس
سبب صرف بے لمس تاثیر برف
میرا بس چلے برف زاروں کے بیچ
بناؤں میں کوئی مکاں دھوپ کا
برف بے قلم کب تک میرے رنگ لکھے گی
چاہتا ہوں اک شعلہ آسماں بھر رکھوں
دعا میرا جہلم نہ سوکھے کبھی
دعا برف کی ہے دعا برف کی
قرطاس گل مرگ پہ جب سوچا اک منظر لکھوں
یا بارش ہی بارش برسی یا پھر خالی برف گری
ہر صنوبر پر شفق فریاد لکھی جائے گی
برف قلموں سے نئی روداد لکھی جائے گی

برف کے ساتھ ساتھ چنار لفظ کا استعمال بھی کلام منظور میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔چنار ایک ایسا تناور، سایہ دار اور خوبصورت درخت ہے جو وادی کشمیر کے ہر شہر ہر گاؤں میں کم یا زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔یہ درخت کشمیر کی پہچان کا حصہ ہے۔اس لفظ کو مختلف اوقات میں موصوف نے ظاہری معنوں کے ساتھ ساتھ علامتی معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔جس کی بدولت ان کے کلام میں معنی آفرینی اور افہام وتفہیم کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

موسم آنکھوں کی شفق کو بے سماں ہوتے ہوئے
میں نے دیکھا ہے چناروں کو دھواں ہوتے ہوئے
چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہے ہیں پر کہیں دھواں نہیں ہے
کس نے توڑے میرے آئینے کہو!
گم چناروں کے ہیں کیوں سائے کہو!

حکیم منظور کی غزلوں میں ان خوش نما اور وسیع المعانی تراکیب اور علائم کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب مسعود منور یوں رقمطراز ہیں۔

''حکیم منظور کی غزلیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہیں۔چنانچہ انھوں نے ارض سیب کی اخروٹ نکہتوں، سکوت برف شبی، نزول آفتاب، برف ملبوس، برف کا بستر، سلگتی برف جیسی تراکیب وضع کرکے جہاں اپنے مقامی رنگ کو نمایاں کیا ہے وہاں غزل کے پیکر کو ایک تازہ تر، ایک بالکل منفرد، ایک غایت درجہ انوکھا ملبوس بھی دیا ہے۔اور وہ اپنے اس رویے کی بنا پر اپنے ہم عصروں میں بالکل علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔''
(ماہنامہ، شیرازہ، حکیم منظور نمبر، ص 191)

جہاں ایک طرف منظور کشمیر کی خوبصورتی اور مناظر قدرت کی عکاسی اور اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کی نمائندگی بہ زبان غزل کرتے ہیں۔وہیں دوسری جانب کشمیر کے پُر آشوب حالات کی پیش کش میں بھی وہ پیش پیش رہے ہیں۔وادی گلپوش گذشتہ تیس چالیس برسوں سے جن خونی حالات سے گزر رہی ہے اس کی بھرپور عکس بندی اپنے اپنے انداز اور محسوسات کے مطابق یہاں کے ہر چھوٹے بڑے شاعر نے کی ہے۔منظور جوکہ حد درجہ حساس ہیں، وہ ان ناساز حالات کو دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں۔اپنے گردونواح میں روز رونما ہونے والے حالات و واقعات کو منظور اپنی مخصوص لفظیات اور منفرد انداز میں شعری جامہ کچھ اس طرح پہناتے ہیں۔

خون تشنہ شام رویہ، زخم آفتاب
پاؤں سے سر تک آنکھ کا منظر اُداس ہے
چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہے ہیں پر کہیں دھواں نہیں ہے
تمھارے آموں پر کیا گزری جانتا ہوں
لہو ہیں اخروٹ میرے، موسم کی سازشوں سے
موسم آنکھوں کی شفق کو بے سماں ہوتے ہوتے
میں نے دیکھا ہے چناروں کو دھواں ہوتے ہوتے
رستے عجب ہیں، راہی عجب، پیڑ عجب ہیں، پات عجب
میں جس شہر کا رہنے والا اس کے ہیں حالات عجب
دھواں کہیں سے اُٹھے میں سوچوں جلا ہے کوئی چنار میرا
یہ خوف میراث میں ملا ہے یہی ہے اب اعتبار میرا

مذکورہ اشعار میں خبر خبر کا لہو ہونا، چناروں کا دھواں ہونا، اخروٹوں کا لہو ہونا، موسموں کی سازش کرنا، خوف کا میراث میں ہونا، چناروں کا جلنا، وغیرہ کے ذریعے حکیم منظور نے کشمیر میں رونما ہونے والے حالات کی دلدوز تصویر کشی کی ہے۔وہ اپنے وطن اور قوم کی حالتِ زار دیکھتے ہیں تو بہت مایوس اور افسردہ ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب ان کے دل کے پیمانے میں یہ درد حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو وہ اس کو غزل کے ساغر میں انڈیلتے ہیں۔ڈاکٹر پریمی رومانی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''حکیم منظور نے اپنی غزلوں میں اس دور کا آشوب پیش کیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ منظور کی شاعری میں عصر حاضر کے انسان کا درد و کرب کھل کر سامنے آیا ہے۔اس درد و کرب اور ذہنی افسردگی کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری میں قوم پرستی اور وطن پرستی کا احساس بھی ہوتا ہے۔اس طرح کے احساسات اور خیالات انھوں نے جس انداز سے اپنی شاعری میں پیش کیے ہیں وہ قابل داد ہیں۔'' (ڈاکٹر پریمی رومانی، توازن، ص 64)

بہرکیف حکیم منظور کی غزل کشمیر میں اُردو غزل کی توانا آواز ہے۔انھوں نے نہ صرف ریاست بلکہ ملک کے طول وعرض میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کو ان کی غزل میں اظہار کی توانائی اور جذبے کی حلاوت نظر آتی ہے۔تو مشفق خواجہ انھیں روش عام سے ہٹ کر چلنے، اپنے ماحول کی خوبصورت عکاسی کرنے اور خود وضع کردہ لفظوں کو نئے معنی عطا کرنے والے شاعر مانتے ہیں۔ڈاکٹر عبدالمغنی ان کو فکر، تجربے اور احساس کے منفرد شاعر تسلیم کرتے ہیں۔مظہر امام کا ماننا ہے کہ منظور کی غزل جدید فکر اور طرز احساس سے آمیز ہوکر دوآتشہ ہوگئی ہے۔شمیم حنفی کو ان کی غزل میں نئے اور پرانے رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔اسی طرح محمود ہاشمی کو حکیم منظور کی غزلوں میں ذات، کائنات اور شخصیت کے درمیان منقسم خلاؤں کو یاد کرنے اور ایک تکمیلی شخصیت کی تلاش کا منظر نامہ پیش کرنے کی خوبی نظر آتی ہے۔

■

Dr. Mushtaq Ahmad Ganai
S/O Ab Gaffar Ganai
47,Ganaie Mohallah Samboora,Pampore.
Distt:Pulwama Kashmir192304(Kakapora)
Mob:7006402409
Email:mushtaqalamphd87@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

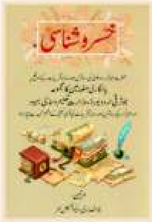

خسرو شناسی

مرتبین: ظ انصاری، ابوالفیض سحر

صفحات: 347، قیمت: 180 روپے، پانچویں طباعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A، تیسری منزل، جوگا بائی، نئی دہلی 25

امیر خسرو دہلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ برصغیر کے اہل علم و دانش، علما و صوفیا اور مفکرین میں ان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کی زندگی کی مختلف جہات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جس میں حضرت امیر خسرو کی زندگی، ان کی شاعری، وطن کی محبت، تصوف کے نکات، سیاسی و سماجی رموز، تہذیبی و ثقافتی اثرات، تصوفانہ شاعری، موسیقی، اور ان کے دیگر شعری کارناموں کو تفصیل سے مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب خسرو شناسی میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ حضرت امیر خسرو کا 'سارا کلام ابھی تک علمی و ادبی تحقیق کے ساتھ شائع نہیں ہو سکا' آج بھی محققین ان کی تمام تر تخلیقات کی تلاش و جستجو میں مصروف عمل ہیں اور اہل نظر و اہل ہمت اس پر کام کر رہے ہیں تاکہ خسروی افکار و نظریات کو اگلی نسل تک منتقل کیا جا سکے۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب 'زمان و مکان' کے نام سے ہے۔ اس باب میں صرف دو مضامین ہیں پہلا ڈاکٹر سید اطہر عباس زیدی کا 'عہد خسرو میں دہلی کا سیاسی اور سماجی افق' ہے۔ دہلی کی سیاسی اور سماجی صورت حال کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ مضمون بہت اہم ہے۔ اس میں ترکوں کی بالا دستی، غلام اور حکمراں، مسلمانوں میں اونچ نیچ، صوفیا کے جداگانہ گروہ، دنیا داری اور ترک دنیا، سماع اور سجدہ وغیرہ کو مستند حوالوں کے ساتھ اجمالاً پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کا 'جنوبی ہند کے پائے تخت دیوگری کا منظر' ہے۔ اس میں دیوگری کے یادو راجا، خلجی انقلاب، دیوگری پر پہلا حملہ، دیوگری کا قلعہ، دیوگری کا محاصرہ، دوسری مہم، تیسری مہم، چوتھی مہم- دیوگری کا نام قطب آباد، مبارک شاہ کا قتل اور غازی ملک کی تخت نشینی کے ذیلی عنوان کے ذریعے پورے منظر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب 'ایمان' کے عنوان سے ہے جس کے تحت کل چھ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا 'وطن اور حب وطن' ہے۔ دوسرا ک، ز، اشرفیاں کا 'امیر خسرو کے عہد میں تصوف کا سیاسی اور سماجی رول' ہے۔ تیسرا مضمون محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی کا 'چشتیہ سلسلۂ تصوف کی خصوصیات' کے نام سے ہے۔ چوتھا مضمون پروفیسر صفدر علی بیگ کا 'صوفیا کی تعلیم اور امیر خسرو کا نظریۂ حیات' ہے۔ اس سلسلے کا پانچواں مضمون ڈاکٹر مشیر الحق کا 'امیر خسرو- ایک سماجی باغی' کے نام سے ہے جب کہ چھٹا مضمون پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا 'امیر خسرو کی صوفیانہ شاعری' ہے۔ اس طرح مذکورہ تمام مضامین کے مطالعے سے عہد خسرو کے ساتھ خسرو شناسی کی تفہیم کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کا تیسرا باب 'من خسرو شیریں زباں' کے عنوان سے ہے۔ اس میں کل سات مضامین شامل ہیں۔ جس میں پہلا ڈاکٹر طاہر اوغلی محرموف کا 'نظامی گنجوی اور امیر خسرو کے خمسے' دوسرا پروفیسر خلیل اللہ خلیلی کا 'امیر خسرو کا قصیدہ بحرالابرار'، تیسرا سید یوسف کمال بخاری کا 'مثنوی کا باکمال شاعر' چوتھا پروفیسر امیر حسن عابدی کا 'امیر خسرو اور سبکِ ہندی' پانچواں پروفیسر گیان چند جین کا 'کھڑی بولی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصہ' چھٹا پروفیسر گوپی چند نارنگ کا 'امیر خسرو کا ہندوی کلام- استناد کا مسئلہ' اور ساتواں ڈاکٹر پرمانند پنچال کا 'امیر خسرو پر ہندی تصنیف' ہے۔ مذکورہ بالا تمام مضامین کے مطالعے سے حضرت امیر خسرو کی تخلیقات کے محاسن ومعائب اور اردو زبان وادب کے فروغ میں ان کے کردار کی تفہیم کی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کا چوتھا اور آخری باب 'ناقوس واذان' کے نام سے ہے۔ اس میں کل پانچ مضامین شامل ہیں جن میں پہلا شہاب سرمدی کا 'غزل سرا خسرو- سرود و غزل' دوسرا عبدالحلیم جعفر خاں (ستار نواز) کا 'امیر خسرو اور ہندوستانی موسیقی' تیسرا عظمت حسین خاں میکش (مرحوم) کا 'ہندوستانی گائکی میں خیال کا چلن' چوتھا ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی (بحرین) کا 'ہندوستانی سنگیت کو خسرو کی دین' اور پانچواں حسن الدین احمد کا 'سوانحی جدول' ہے۔ مذکورہ تمام مضامین سے قبل عبدالعلیم کا 'حرف اول' اور علی یاور جنگ کی 'تمہید' اور اس کتاب کے مرتبین ظ انصاری اور ابوالفیض سحر کا ایک طویل 'مقدمہ- ایک سوانحی مطالعہ' کے نام سے ہے۔ مذکورہ بالا تمام مضامین کے مطالعے سے امیر خسرو کی زندگی، ان کی علمی و ادبی فتوحات کے ساتھ فن موسیقی اور دیگر تخلیقات کے ذریعے جس کا ذکر مختلف مضامین میں ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف ہندوستانی مزاج اور احساس کو ابھارا بلکہ اپنے قاری کو ہندوستانی اشیا کا ثناخواں بنا دیا جس سے ان کی علمی و ادبی تحریروں کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ اس کتاب کے مطالعے سے حضرت امیر خسرو کی شخصیت کی مختلف النوع جہات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ ایسی گرانقدر کتابوں کی اشاعت کے لیے قومی کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔ امید ہے کہ کونسل اس طرح کی مزید کتابیں شائع کر کے اپنے قارئین کے لیے غور وفکر کے نئے در وا کرے گی۔

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں

مرتب: شیخ عقیل احمد

صفحات: 182، قیمت: 110 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مطبع: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر : ڈاکٹر ثمرین، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیرنظر کتاب 'الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں' عالمی اردو ویبینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد ہیں۔ یہ ویبینار عصری ٹیکنالوجی کے کارگر استعمال کا بہترین نمونہ تھا کہ اس میں انٹرنیٹ کے ذریعے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے علاوہ جرمنی، کناڈا، بنگلہ دیش، آذر بائیجان اور مصر وغیرہ سے بھی شائقینِ اردو، ادبا و قلمکار شامل رہے۔

ہمارا عہد الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کا ہے۔ سوشل میڈیا ہی کی وجہ سے تمام علوم، دنیا کے ممالک اور وہاں کے تمام شعبہ ہائے زندگی تک رسائی اس قدر زود رفتار ہوگئی ہے کہ جس کا ماضی میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سوشل میڈیا پر جہاں سبھی علوم وفنون سے فائدہ حاصل کرنے کی سہولیات موجود ہیں وہیں ذہنی تفریح کے بھی بے شمار خام مواد موجود ہیں۔ یہ تمام سہولیتیں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے اور اپنے کام کو برق رفتاری سے آگے بڑھانے اور فروغ دینے میں معاون اور مددگار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج ہر فرد کی اور تمام ممالک کی ترقی میں سوشل میڈیا کا غیر معمولی کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔ اس طرح ادب ورقی دنیا سے نکل کر الیکٹرانک دنیا میں آچکا ہے۔

جہاں تک الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا کی بات ہے تو اس کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر اس کے مضر اثرات بھی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں شامل مضامین میں بیشتر ادبا نے الیکٹرانک میڈیا کے فوائد زیادہ اور نقصانات کم گنوائے ہیں۔ اس میں پروفیسر ایم کے درانی (اردو مصنفین، ڈیجیٹل دور اور سوشل میڈیا: سرسری تجزیہ)، پروفیسر شہزاد انجم (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو ادیبوں کی ذمہ داریاں)، سید اقبال حیدر (سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کا عہد میں ادیبوں کی ذمہ داریاں)، عارف نقوی (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کو عہد اور ادیب)، مرینال چٹرجی (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں)، سید تقی عابدی (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو نویسندوں کے فرائض)، پروفیسر غیاث الدین (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو قلمکاروں کی ذمہ داریاں)، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی (سوشل میڈیا پر بنگلہ دیشی اردو شاعروں کی سرگرمیاں)، پروفیسر شاہد رسول (انٹرنیٹ اور ذمہ دار اردو صحافت)، ایلدوست ابراہیموف (عالمگیر کا دور اور ورچوئل اسپیس میں اردو زبان: کچھ مشکلات اور مسائل)، پروفیسر ابوذر عثمانی (اردو مصنفین کی ذمہ داریاں، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں)، پروفیسر ناصر مرزا (آن لائن دنیا میں اردو اہل قلم: توقعات اور خدشات)، نصر ملک (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کا دور اور ادیبوں کی ذمہ داریاں: ایک طائرانہ نگاہ)، پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا میں صحیح طور طریق پر گامزن رہنے کے لیے بنگلہ دیشی اردو شاعر مولانا عبدالجلیل کوکب کی مشاورتی باتیں)، پروفیسر احتشام احمد خان (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں)، ڈاکٹر ایم اے عبدالرحمٰن (ادب اور جدید ٹیکنالوجی)، ڈاکٹر عبدالسیع بوبیرے (اردو رائٹرس کی الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے تئیں ذمہ داری کی اہمیت)، فہیم اختر (برطانیہ میں اردو، سوشل میڈیا اور اردو ادب کی ذمہ داریاں)، پروفیسر اقبال احمد (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمہ داریاں)، ڈاکٹر مشتاق احمد (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں اردو ادیبوں کی ذمہ داریاں)، پروفیسر حدیث انصاری (عہد حاضر میں سوشل میڈیا کا اصلی چہرہ)، ڈاکٹر زیڈ ایم شمسی (سوشل اور ڈیجیٹل میڈیا کے دور میں اردو ادیبوں کی ذمہ داریاں)، ہما پروین (سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کے دور میں مصنفین کی ذمہ داریاں)، عطاء اللہ خان سنجری (وکی پیڈیا اور اردو مصنف) اور عالمی اردو ویبینار کی روداد (الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں اردو قلمکاروں کی ذمے داریاں) شامل ہیں۔

میری نظر میں اس کتاب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کے پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے مضمون 'الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو ادیبوں کی ذمے داریاں' میں اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اور اردو کو آج کے دور میں کس طرح جوڑا جاسکے کیا کیا اقدامات اس سلسلے میں اُٹھانے چاہئیں۔ انھوں نے کتاب کی اہمیت کو اولین مانا ہے ساتھ ہی آن لائن مطالعے کے نقصانات بتائے ہیں جن میں آنکھوں کے نقصان، نیٹ ورک یا سِگنلز کی پریشانی، الیکٹرانک میڈیا سے نکلنے والی شعائیں اور وائبریشنس سے دل کی بیماری کا خطرہ لاحق جیسی باتوں پر توجہ دی ہے۔ سوشل میڈیا کے تناظر میں ہمیں یہ دیکھنے اور سوچنے کی ضرورت ہے کہ اردو زبان کو کس طرح سے مؤثر کردار میں آگے بڑھایا جائے اور اس کی افادیت کو پیش کیا جائے۔ سماج، سیاست اور معاش کی سطح پر اردو قلمکاروں کو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی ہیں اور نئی ٹیکنالوجی الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں کیا کیا ذمے داریاں نبھانی ہیں انہی سوالات پر غور وفکر کرنے کے لیے قومی اردو کونسل نے اس ویبینار کا انعقاد کیا اور جہاں تک کتاب کے مطالعے کی بات کی جائے کتاب کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے اور موضوع بھی موجودہ حالات کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔

حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں ایک اہم موضوع پر بہت وقیع اور مفید کتاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

جدید اردو افسانے کا فکری وفنی منظر نامہ

مصنف: حیدر علی

ناشر: عبارت پبلی کیشن، نئی دہلی

صفحات: 530، قیمت: 349، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: ڈاکٹر خان محمد رضوان

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر حیدر علی 'عبدالصمد کے افسانے' کے عنوان سے ایک معلوماتی کتاب شائع کر کے متعجب کر چکے ہیں۔ فی الوقت ان کی تازہ ترین کتاب 'جدید اردو افسانے کا فکری وفنی، منظر نامہ' اہل علم ودانش کے ذوق مطالعہ اور تسکین علم وآگاہی کا سبب بنی ہوئی ہے۔ بات جدید افسانے کی ہو یا قدیم افسانے کی یہ کوئی سرسری موضوع نہیں ہے۔ اس کا منطقہ محدود اور کوتاہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ کار وسیع اور منظر نامہ متنوع ہے۔ اس قدر بسیط موضوع پر تحقیق کرنا سہل اور آسان کام نہیں۔ مگر جب، موضوع کا انتخاب جدید اور جدلیاتی نوعیت کا ہو اور کام کی نوعیت بھی قابل اطمینان ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف کو سہل اور ہلکے پھلکے موضوع سے دلچسپی اور سروکار نہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے اگر ہم ان کی علمی سرگرمیوں اور استعداد کو پرکھنا چاہیں تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ ان کا تخصیصی ذوق ہر جگہ حاوی ہے۔ اور ان کے انتخاب کی انفرادیت ہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔

'جدید اردو افسانے کا فکری اور فنی منظر نامہ' ڈاکٹر حیدر علی کا علمی شناخت نامہ ہے۔ جس قدر ان کی ذات والاصفات پرکشش اور جاذب ہے اسی قدر ان کا علمی ذوق اور علمی سطح مسلم الثبوت ہے۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اس کتاب کے مشمولات سے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں کتاب کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کو کل چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جس سے ان کی علمیت، صلاحیت اور قابلیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ چونکہ قاری کو کسی بھی کتاب یا مقالے کے عمدہ اور قابل استفادہ، کارگر اور جامع ہونے کا اندازہ اس کی فہرست سے ہی ہوتا ہے۔ اسی کے بعد قاری یہ طے کرتا ہے کہ اس کتاب کو اپنے مطالعے کا حصہ بنانا ہے یا نہیں۔ اس لیے کتاب کو پڑھوانے میں یا قاری کو پڑھنے پر مجبور کرنے میں اہم رول کتاب کے پرکشش عنوان اور اس کی ابواب بندی کا ہوتا ہے۔

باب اول: اردو افسانہ نگاری: انیس سو ساٹھ سے پہلے کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ جس کے ذیلی عناوین میں 'اردو افسانہ نگاری کے آغاز کا پس منظر'، 'اردو افسانہ انیس سو چھتیس تک' اور 'اردو افسانہ انیس سو چھتیس کے بعد۔ دوسرا باب: جدید اردو افسانے کا فکری منظر نامہ: انیس سو ساٹھ سے انیس سو اسی تک' کے عنوان سے ہے۔ اس کے ذیل میں مزید پانچ عناوین رکھے گئے ہیں وہ اس طرح سے ہیں۔ جدیدیت کا رجحان اور اس کا فکری جواز، ترقی پسندی کا فکری تسلسل اور درپیش چیلنجز، ہجرت کا المیہ، روایتی اقدار کی شکست وریخت اور 'نئے سیاسی نظام کا کردار'۔ باب سوم: جدید اردو افسانے کا فنی مطالعہ: انیس سو ساٹھ سے انیس سو اسی تک۔ کے عنوان سے تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کے تین ذیلی عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں: علامت اور استعارے کا التزام، تجریدیت اور 'کہانی پن سے گریز'۔ باب چہارم: اردو افسانے کا فکری منظر نامہ: انیس سو اسی سے دو ہزار تک، کے عنوان سے ہے۔ اس میں چار عنوانات مزید قائم کیے گئے ہیں۔ جیسے مابعد جدیدیت کا رجحان، عالم کاری کے اثرات، جدید تکنالوجی کے مضمرات اور 'ثقافتی تشخص'۔ باب پنجم: انیس سو اسی کے بعد افسانے کا فنی مطالعہ کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کے تحت پانچ ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں مابعد جدیدیت کے فنی رویے، کہانی پن کی واپسی، تجرید سے گریز، علامت کا نیا شعور اور 'زبان واسلوب کی نئی جہتیں، قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح باب ششم: انیس سو اسی کے بعد کے افسانے کے اہم موضوعات احاطہ کرتا ہے۔ اس عنوان کے ذیل میں چھ ذیلی عنوانات کو جگہ دی گئی ہے، ساتھ ہی حاصل کلام اور کتابیات بھی اس کا حصہ ہیں۔ اس طرح ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ مصنف نے افسانے کے کینوس کو کس قدر وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ ان ابواب میں نہ صرف افسانہ بلکہ فن افسانہ کے علاوہ اس کا عہد بہ عہد محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ اس کتاب میں مواد کے ساتھ موضوعات کے تنوع کا بھی بخوبی خیال رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب صنف افسانہ پر ایک مکمل اور باضابطہ کتاب ہے۔ جس میں انیس سو ساٹھ سے لے کر سنہ دو ہزار تک کا محاسبہ پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح افسانے کے احوال وآثار کو بھی عنوانات کے تحت واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی معاصر اور تہذیبی آثار کو بھی پیش نظر رکھ کر تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو جدید افسانے تک ہی محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ بیسویں صدی کے افسانوی رجحانات پر بخوبی روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔ دراصل حیدر علی کا کمال یہ ہے انھوں نے اس کتاب کو اس طور پر منفرد اور کارآمد بنانے کی سعی میں کامیابی حاصل کی ہے کہ ماقبل میں جدید افسانے پر ہو چکے کام کو اپنی اس تصنیف کے ذریعے توسیع دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ تقریباً ہر باب میں موضوعات پر سیر حاصل اور بھرپور گفتگو کی گئی ہے، اس لیے قاری کو کہیں بھی کسی طرح کی تشنگی یا کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خاص دلچسپی کے پیش نظر ابتدا سے عہد حاضر تک افسانوی ادب میں ہونے والے تغیرات اور اس کے اثرات سے وجود میں آنے والی تحریکات کے رول اور کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ حیدر علی نے افسانے کے مسائل ورجحانات کے ساتھ اس کے زیر اثر سماجی اور ملکی سیاست و معاشرت پر پڑنے والے اثرات پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کا قاری ہونے کے ناطے ہم یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے نہ صرف بھرپور ہے بلکہ یہ ایک دستاویزی کتاب ہے، جس کے ذریعے سے افسانوی ادب کا شائق اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ فن افسانہ نگاری کے فنی اور فکری عمق پر بسیط ایک اہم تحقیقی تصنیف ہے، جو ایک قاری کو افسانوی ادب اور تاریخ افسانہ نگاری سے مربوط کرتی ہے۔ قوی توقع ہے کہ اہل علم وادب کی نظر سے گزر کر یہ کتاب سند اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

نقوش اولین

مصنف: حافظ ولی احمد خان

صفحات: 176، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مبصر: ڈاکٹر احسان عالم، پرنسپل الحراء پبلک اسکول، دربھنگہ

پروفیسر عزیز اللہ شیرانی (شعبۂ اردو، مولانا آزاد یونیورسٹی، جودھپور) کتاب کے تعلق سے اپنے 'پیش لفظ' میں لکھتے ہیں:

'نقوش اولین' مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے جس کے مصنف حافظ ولی احمد خان ہیں۔ آپ صوبۂ گجرات کے مشہور شہر احمد آباد میں ماوئی انجینئرنگ ورکس احمد آباد کے ڈائرکٹر ہیں۔ گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی کے تعاون سے ایک قومی سمینار 2010 میں منعقد

ہوا تھا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ حافظ ولی احمد خان بھی اس سیمینار میں آئے تھے۔ انھوں نے مجھے چند اہم اردو کتب بطور تحفہ عنایت کیں۔ موصوف ایک انجینئر کے ساتھ ادب پرور بھی ہیں۔ انھیں کتب شناسی کا بہت شوق ہے۔ وہ شائقین ادب کو دور حاضر کی مطبوعہ اہم کتاب بھی بغرضِ مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ خود کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی خرید کر پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔'' (ص 5)

'محبِ اردو حافظ ولی احمد خان' کے عنوان سے نذیر فتح پوری (مدیر اسباق، پونہ) لکھتے ہیں کہ اردو نواز حافظ انجینئر ولی احمد خان کے ذوق وشوق کا یہ عالم ہے کہ مصروفیات میں بھی اردو کے ادیبوں، شاعروں سے ملاقات کرتے ہیں اور اردو کی تقریبات میں بھی شرکت کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر ناقدانہ نظر ڈال کر اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ ولی احمد خان گجرات میں ایک صنعت کار ہیں لیکن ان کی وابستگی بھاگلپور ضلع کے جواکھر سے ہے۔

'نقوش اولین' میں شامل پہلا مضمون 'گجرات میں اردو ترجمہ نگاری کی روایت و اہمیت' کے عنوان سے ہے۔ ترجمہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ مختلف زبانوں کے ادبیات اور علوم وفنون کے جواہر پارے تراجم کے ذریعے ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچتے ہیں۔ اور مختلف قوموں کے علوم وفنون ایک دوسرے سے مستفید ہوئے اور ان کے اثرات سے نہ صرف علم وادب، طب وحکمت، تاریخ و فلسفہ، مذہب وسیاست، طبعیات وفلکیات، سائنس اور ٹکنالوجی کو فروغ حاصل ہوا۔ بلکہ تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی شعور کو بھی تقویت پہنچی خصوصاً زبانوں کی ترقی میں تراجم نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

'رحمت امروہوی حیات و خدمات' کے عنوان سے ولی احمد خان نے رحمت امروہوی کی حیات اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''رحمت صاحب کو مطالعے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ مرزا غالب، میر تقی میر اور داغ دہلوی رحمت کے پسندیدہ کلاسیکی شعرا ہیں اور بھی شعرا کے کلام کی اردو زبان کی سادگی کے اثرات جناب رحمت صاحب کی شاعری میں ملتے ہیں۔ موجودہ دور کے ادیبوں سے ملنا اور انھیں پڑھنا بھی رحمت کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ جناب مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جوش ملیح آبادی، مخدوم محی الدین، غلام ربانی تاباں، ساحر لدھیانوی، ظ۔ انصاری اور احتشام حسین جیسی عظیم ادبی شخصیات سے رحمت صاحب کو ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے اور وہ انھیں پڑھتے رہتے تھے۔''

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی سے ایک ملاقات (انٹرویو) کے حوالے سے موصوف لکھتے ہیں کہ شیرانی صاحب اردو کی خدمت اور محبت کے لیے دور دراز تک سفر کرتے رہتے ہیں۔ احمد آباد گجرات ہمیشہ آتے رہتے ہیں۔ مہاراشٹر میں پونے، ممبئی، ناگپور، بلڈانہ، امراؤتی بھی جاتے ہیں۔ مدھیہ پردیش میں بھوپال، سرونج اور تلنگانہ میں حیدرآباد کا بھی ادبی دورہ کر چکے ہیں۔ وہاں بھی ان کے چاہنے والے طلبا، اساتذہ، صوفیا اور مصنّفین ہیں۔

صوفیائے کرام کی تعلیمات نے ہمیں جینے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ مادیت سے پرہیز کرنے کا ہنر ہمیں صوفیائے کرام نے دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مضمون 'دور حاضر میں صوفیائے کرام کی تعلیمات و اہمیت' کے عنوان سے حافظ ولی احمد خان نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں تحریر کیا ہے۔

'جنگ آزادی کا پس منظر' عنوان سے ولی احمد خان نے جنگ آزادی کی وجوہات اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔

پنڈت برج نارائن چکبست نثری وادبی ذوق رکھتے تھے۔ صرف آٹھ برس کی عمر میں شاعری کی شروعات کر دی تھی۔ ان کی طبیعت میں موزونیت اور شعری شغف فطری طور پر تھا۔ ان کی شاعری کے حوالے سے حافظ ولی احمد خان نے ایک عمدہ مضمون 'حب الوطنی کا علمبردار شاعر چکبست کی حیات وشاعری' قلم بند کیا ہے۔

'اردو شاعری اور پیغام انسانیت' کے عنوان سے ولی احمد خان نے اپنے مضمون کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ مختلف شاعروں نے انسانیت کا جو پیغام دیا ہے اسے اردو شاعری کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

کتاب میں شامل ایک مضمون 'اردو افسانے کا عصری منظر نامہ' حافظ ولی احمد خان نے تحریر کیا ہے۔ اردو کی اس صنف کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں ''اردو افسانے نے ہر عہد میں ترقی کی اور آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اس صنف کی مقبولیت میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی ہے۔ افسانے کی اہمیت اس پہلو میں بھی پنہاں ہے کہ اس میں زندگی کا کوئی ایک گوشہ اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک مربوط کہانی ہوتی ہے اور بیانیہ اسلوب کی بنیاد پر اس کی اہمیت وافادیت منحصر ہوتی ہے۔'' (ص 133)

تنقید نگاری بھی اردو ادب کا اہم جز ہے۔ رواں صدی میں اردو تنقید پر جائزہ پیش کرتے ہوئے ولی احمد خان تنقید سے متعلق کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تنقید نگار کا کام بہت پیچیدہ ہوتا ہے اسی لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع ہو، بہت سے علوم سے بھی واقف ہو۔ تبھی کسی فیصلے تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تنقید نگار ایک عام انسان سے الگ ہوتا ہے اس کے اندر تنقیدی شعور زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ادبی وفنی کارنامے کو سمجھنے اور سمجھانے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اس کی تنقیدی نگاہ پڑھنے والوں کو راستہ دکھاتی ہے۔

تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ اس کی مدلل وضاحت اور اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے، تنقید نگار کا کام فن پارے کی جانچ اور پرکھ ہے اس حوالے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تنقید نگار ادب پارے کے مطلب کو قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ تنقید میں ادب پارے کی خوبیوں اور خامیوں پر رائے دینا لیکن کسی اصول کی روشنی میں خواہ وہ اصول جمالیاتی ہو، عقلی ہو یا فلسفیانہ ہو۔

ڈاکٹر نذیر فتح پوری تقریباً سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ گفتگو کا انداز پُرلطف ہے۔ حافظ ولی احمد خان نے 'ڈاکٹر نذیر فتح پوری ہمہ جہت ادبی شخصیت' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: 'اسباق' کے وسیلے سے نذیر فتح پوری صاحب نے کتنے ہی باصلاحیت تاہم گمنام افراد کی جوہر شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی ادبی و تصنیفی تربیت کر کے انھیں اہل قلم و ہنر بنا دیا ہے۔ ان کا کمال قلم یہ ہے کہ انھوں نے کتنے ہی بے جان قلم والوں کو باوزن، باوقار، جاندار اور تابدار فنکار بنا دیا۔ نثر نگاروں کے علاوہ نہ معلوم کتنے ہی شعرا ان کی تربیت وتہذیب سے پردہ خفا سے نکل کر پردہ ظہور میں طلوع ہوئے اور جن کی آواز شاعری دور تک سنی گئی۔''

'ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی راجستھان کا علمبردار ادیب و محقق' کے عنوان سے حافظ ولی احمد خان نے ان کے ادبی رجحانات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کا بنیادی رجحان تعلیم وتحقیق اور تخلیق ہے۔

اس طرح حافظ ولی احمد خان کی کتاب 'نقوشِ اولین' کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجینئرنگ کے پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود اردو وادب سے ان کی وابستگی بڑی گہری ہے۔ اس کتاب میں پیش کیے گئے مضامین معلوماتی اور مطالعہ طلب ہیں۔ ان کا ادبی ذوق یقیناً اردو زبان وادب کے لیے ایک بڑا کام ثابت ہوگا۔

قومی یک جہتی کا منظرنامہ

مصنف: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

صفحات: 224، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: سید تنویر حسن نقوی، محلہ گشتیان، امروہہ

زیر نظر کتاب 'قومی یک جہتی کا منظر نامہ' ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی ایک بیش قیمت تالیف ہے۔

کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل 53 /کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں اور ان کے سوانحی حالات و ادبی خدمات پر بھی اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر شرف الدین صاحب نے 21 /اہم موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ عناوین کی فہرست اس طرح ہے:

1/اردو کے ہندو شعرا کی حمدیہ شاعری، 2/اردو کی حمد و مناجات میں ہندوستانی عناصر، 3/اردو کے ہندو شعرا کی نعت گوئی، 4/سریش بھٹ کی مراٹھی نعت، 5/ہندو حکمرانوں کی مسلم نوازی، 6/مسلم حکمرانوں کی ہندو نوازی، 7/ٹیپو سلطان کی رواداری، 8/مہاتما گاندھی کا جذبۂ انسانیت، 9/مولانا آزاد کا جذبۂ قومی یک جہتی، 10/قومی یک جہتی کے فروغ میں سنتوں کا حصہ، 11/قومی یک جہتی کے فروغ میں صوفیوں کا حصہ، 12/ہندی زبان کے فروغ میں مسلمانوں کا حصہ، 13/اردو زبان کے فروغ میں ہندوؤں کا حصہ، 14/اردو کا سیکولر مزاج، 15/اردو شاعری میں رام، 16/اردو شاعری میں ہندوؤں کے مذہبی تہوار، 17/ہندو مذہب کی کتابیں اردو میں، 18/اردو غزل میں قومی یک جہتی کے رجحانات، 19/قومی یک جہتی کے فروغ میں اردو صحافت کا کردار، 20/شیخ محمد قادری، ایک صنم پرست مسلمان، 21/مالک رام: اسلامیات اور غالبیات کے ماہر۔

ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب کے اس خوبصورت با مقصد اور لائق مطالعہ موضوع پر اردو کتب و رسائل میں ڈھیر سارا مواد بکھرا ہوا ملتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش بلاشبہ قابل تحسین ہے کہ انھوں نے اس کو ایک عمدہ نثر پارے کی صورت میں کافی حد تک جمع کر دیا ہے۔ آج کے اس انتشاری دور میں اس طرح کے مثبت کاموں کی اشد ضرورت ہے۔ ''جرأتِ اظہار'' میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے بڑے خوبصورت انداز میں ہمارے ملک عزیز ہندوستان کی تعریف و توصیف کی ہے، وہ بھی ملاحظہ ہو:

''ہماری گنگا جمنی تہذیب بے مثال ہے، اس کا دل نشین حسن صدیوں کے مشترکہ عمل کے نتیجے میں جلوہ گر ہوا ہے، اس میں جو جاذبیت اور کشش ہے، وہ بیرونی لوگوں کے دلوں کو پوری قوت سے اپنی جانب کھینچ لیتی ہے، ان کو حیران کر دیتی ہے۔ یہ اس ملک کی ایسی خوبی ہے جو اس ارض کائنات کے نقشہ میں کہیں اور نظر نہیں آتی۔''

بین المذاہب مواد کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب خاصے کی چیز ہے، دوسرے قومی یک جہتی اور ہمارے قدیم سماج اور اردو ہندی دفاتر میں کیسے کیسے قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارے کی مثالیں موجود ہیں، وہ اس کتاب میں خوب پڑھنے کو ملتی ہیں، کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین میں خاصی محنت کی گئی ہے۔ بالخصوص اس کی جمع و تدوین ایک وسیع مطالعے کی غمازی کرتی ہے۔ میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل صاحب کو اتنی دستاویزی تصنیف پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

علی گڑھ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک

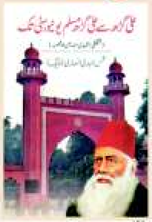

مصنف: شمس الہدیٰ انصاری (علیگ)

صفحات 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ایم نصر اللہ نصر

شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A، ستین بوس روڈ، ہاؤڑ، (مغربی بنگال)

اردو کے مراکز سے دور مضافاتی علاقوں میں رہ کر بھی اردو کے قلم کار اردو کی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے یہاں بھی قلم کی روانی، زبان کی شائستگی اور علم کی گہرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ بھی اچھے مصنف، افسانہ نگار، شاعر اور ادیب ہونے کے مجاز ہیں۔ انھیں نظر انداز کرنا بے انصافی ہے۔ ایسے ہی قلمکار شمس الہدیٰ انصاری (علیگ) عرف چھوٹے حاجی صاحب مسکن دھنباد (جھارکھنڈ، بہار) ہیں۔ ان کو ادب سے گہرا شغف ہے۔ کاروبار سے منسلک ہونے کے باوجود اتنا وقت ضرور نکال لیتے ہیں کہ مطالعہ کریں اور مضامین لکھیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'اندھے آدمی کا سفر' (2007) میں منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکا ہے اور تازہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'علی گڑھ سے علی گڑھ یونیورسٹی تک' (2022) زیر مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں کل اٹھارہ تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جن میں زیادہ تر مضامین علی گڑھ کے تعلق سے ہیں۔ جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 'سرسید کے خوابوں کی تعبیر، سرسید کی قومی و تعلیمی تحریک، علی گڑھ سے علی گڑھ یونیورسٹی تک، علی گرین اور انٹروڈکشن، اردو انشائیہ کی روایت اور سرسید، سرسید کا سفرنامہ 'مسافران لندن' وغیرہ ان کے علاوہ محمد حسین آزاد، حالی، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، مجاز اور جذبی، قاضی عبدالستار اور علی گڑھ کے مشاعرے پر مدلل اور مفصل مضامین کی شمولیت سے اس کتاب کی اہمیت کافی بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر معصوم شرقی کی رائے میں وہ اردو کے صاحب اسلوب ادیب، تخلیقی فنکار، فکشن نگار، اچھے مضمون نگار اور سلیس نثر نگار ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ کتاب ان کی تعلیمی زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور علی گڑھ کے تہذیبی ماحول سے آشنا بھی کراتی ہے۔ نیز یونیورسٹی کی تاریخ اور ارتقائی منازل سے آگاہ بھی۔ وہاں کی خوشگوار اور تلخ و شیریں یادوں کو سمیٹنے کی اچھی کوشش بھی کی گئی ہے۔ دیگر مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرسری مطالعے کی پیداوار نہیں بلکہ کافی عرق ریزی کے بعد لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین کسی تقاضے کے تحت معرض وجود میں نہیں آئے ہیں بلکہ مصنف نے اپنے شوق و ذوق سے ان کو لکھا ہے۔ اس لیے یہ سارے مضامین کافی معلوماتی اور اثر انگیز ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر معصوم شرقی لکھتے ہیں:

''موصوف کے مقالات میں قاری کی تشفی اور وجدان کے لیے کچھ نہ کچھ سامان ضرور مل جائے گا۔ انھوں نے عظیم المرتبت شخصیات کو ہر رنگ میں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ادبی ادراک کو اپنی قوت تخلیق سے نکھار کر شگفتہ پھول کی مانند صفحۂ قرطاس پر پیش کیا ہے۔ ان کے مضامین کو پڑھنے سے گلہائے رنگا رنگ کا لطف آتا ہے۔''

بات بالکل درست ہے شمس الہدیٰ انصاری کے یہاں ادبی، تخلیقی اور تحقیقی صلاحیت موجود ہے۔ وہ بیشک بہت اچھے نہیں تو پسندیدہ ادیب ضرور ہیں۔ ان کی تخلیقات میں وہ ساری کیفیات موجود ہیں جن کی توقع ایک قاری کو ایک تخلیق کار سے ہوتی ہے۔ علی گڑھ کے ماحول کا اثر ان تحاریر میں جا بجا موجود ہے۔ علی گڑھ کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کی مختصر اقامت ہی اردو زبان و تہذیب سے آشنا ہونے کے لیے کافی ہے۔ سو موصوف کے

ساتھ بھی یہ تجربہ رہا ہے۔ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کچھ یوں کیا ہے:

''یہاں کی بڑی بڑی عمارتیں جن میں شعبے نیز فیکلٹیاں چلتی ہیں سبھی عمارتوں کے سامنے لان اور اس میں ہری ہری گھاس نیز پھولوں کی کیاریاں لہلہاتی رہتی ہیں۔ یہاں اردو زبان محض شعبۂ اردو تک محدود نہیں بلکہ دیگر شعبہ جات سے لے کر تمام دفاتر میں کلرک سے لے کر اعلیٰ افسران تک ہر شخص سلیس و رواں اردو بولنے پر عبور رکھتا ہے۔''

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب علی گڑھ کی تہذیب اور تعلیمی ماحول کو جاننے اور سمجھنے کے لیے معاون و مددگار ہے۔ اس کے علاوہ فاضل مضمون نگار کی علمی و ادبی صلاحیت سے بھی آشنائی ممکن ہے۔ ان کی اس کاوش کے لیے بہت بہت مبارکباد۔

خاکہ

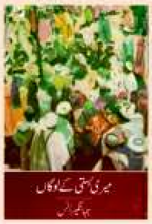

میری بستی کے لوگاں

مصنف/ ناشر: جہانگیر انس

صفحات 240، قیمت: 151، سنہ اشاعت: 2021

بہ اہتمام: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: شاہ عمران حسن، اے 22، شاہ ہاوس، خسرانمبر 824
مکی مسجد کالونی، مدن پور کھادر ایکسٹینشن، پارٹ 3، نالہ روڈ، سریتا وہار- 110076

زیر نظر کتاب 'میری بستی کے لوگاں' ریاست بہار کے ضلع سیوان سے تعلق رکھنے والے مشہور انشائیہ نگار جہانگیر انس کی تحریر کردہ ہے، یہ تقریباً تین درجن لوگوں کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ بڑا عجیب اتفاق ہے صاحب کتاب نے یہ کتاب اپنے گاؤں کے لوگوں پر لکھی ہے۔ عموماً ایسا کم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے محلے اور گاؤں کے لوگوں کا تذکرہ اتنی تفصیل سے کریں، جس طرح انھوں نے کیا ہے۔ مجھ کو ان کی کتاب دیکھ کر مشہور ادیب وہاب اشرفی کی خودنوشت 'قصہ بے سمت زندگی' یاد آ گئی ہے، جس میں انھوں نے اپنے جاننے والے تقریباً ایک ہزار لوگوں کے نام درج کیے ہیں۔

اپنی کتاب کے تعلق سے جہانگیر انس لکھتے ہیں کہ میری بستی کے لوگاں میرے گاؤں رانی پور کے چند خاص و عام لوگوں کے تعلق سے میرے ذاتی تاثرات ہیں۔

وہ مزید لکھتے ہیں غریب یا عام لوگ خاص طور سے گاؤں کے لوگ غیر معروف ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی بہت سے ایسے کردار ہوتے ہیں جن کے اخلاق و آداب، اعمال و افعال، ذہن و فکر کی صلاحیتیں اور سیرت کی بے نقابی انسانی مشاہدات و تجربات میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔ (میری بستی کے لوگاں، ص 10-9)

میری بستی کے لوگاں اگرچہ خاکوں پر مشتمل ہے، تاہم اسے ہم مصنف کی خودنوشت تحریروں کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں جہانگیر انس نے اپنے خاندان کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، خاندان کے علاوہ انھوں نے گاؤں کے لوگوں کا بھی ذکر بہت عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ اپنا ذکر اگرچہ مختصر طور پر کیا ہے مگر اپنی اہلیہ ناظرہ خاتون کا ذکر بڑے ہی دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

اسی طرح جہاں وہ گاؤں کے موذن کا تذکرہ کرتے ہیں تو گاؤں کے پس منظر والے قاری کو اس کا گاؤں یاد آجاتا ہے۔۔ مثلاً جہانگیر انس کی یہ عبارت دیکھیے۔۔۔ اپنے بچپن میں میری نیند جس آواز سے کھلتی وہ موذن صاحب کی پرکشش اور پر تاثیر آواز ہوتی۔ میں ہی کیا گاؤں کا ہر شخص ان کی آواز سے بیدار ہوجاتا۔ کمبھ کرن کی نیند سونے والے بھی آنکھ کھولنے پر مجبور ہوجاتے۔ (اپنے بستی کے لوگاں، ص 106)

اسی طرح جہانگیر انس کتاب میں گنگا جمنی تہذیب کی جھلک اور ہندو مسلم اتحاد کی مثال پیش کرتے ہوئے گاوں کے مرحوم درگھچن پرساد کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان کی اردو بولی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ کس طرح درگھچن پرساد خوبصورت اردو بولا کرتے تھے۔

جہانگیر انس کے گاوں کا نام رانی پور ہے۔ یہ گاؤں ضلع سیوان کا ایک اہم گاوں مانا جاتا ہے۔ اس گاؤں کا بھی انھوں نے ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ مقدمہ میں اس کا ذکر دیکھا جاسکتا ہے۔

گاوں کے لوگ پہلے اسی گاؤں میں رہنا پسند کرتے تھے، مگر بعد کو انھوں نے گاوں سے ہجرت شروع کردی۔ رانی پور کے تعلق سے وہ بتاتے ہیں کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا بھی یہاں غلبہ تھا۔ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ پہلے بھی ہوا کرتے تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ جہانگیر انس نے اس گاؤں کے شاعر ظفر رانی پوری کا ذکر کیا ہے اور ان کا کلام بھی درج کیا ہے، مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

میں خود اپنی انا سے لڑ رہا ہوں
مجھے خود سے بغاوت ہو گئی ہے

میری بستی کے لوگاں کا مقدمہ مولانا عبدالوہاب قاسمی نے لکھا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، جو کافی طویل ہے۔ کتاب دیدہ زیب ہے، اس کی طباعت عمدہ ہے۔

میری بستی کے لوگاں کی سب سے خاص بات جس نے مجھ کو متاثر کیا وہ اس کی زبان ہے، جہانگیر انس نے اگرچہ سادہ زبان استعمال کی ہے، تاہم اس کا ادب اتنا شاندار ہے کہ قاری کوئی بھی مضمون پڑھے بغیر اسے چھوڑ نہیں سکتا ہے۔

میں اس اہم ادبی شہ پارے کے لیے جہانگیر انس کو مبارکباد دیتا ہوں اور قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ اگر سادہ اردو میں اچھا ادب پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں، یقیناً اس کتاب کے مطالعے سے آپ کا وقت ضائع نہیں ہوگا۔

شاعری

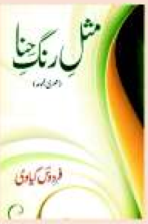

مثل رنگ حنا

شاعر/ ناشر: فردوس گیاوی

صفحات: 152، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: بدنام نظر، موضع کنڈہ، ڈاک خانہ و ضلع: شیخ پورہ (بہار)

'مثل رنگِ حنا' فردوس گیاوی کا پانچواں شعری انتخاب ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے کیا کہا کیا لکھا اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ میں نے انھیں جرائد و رسائل میں پڑھا اور جب بھی پڑھا ان کی شاعری کو قریب سے جاننے کی خواہش شدت کے ساتھ پیدا ہوئی۔

زیر نظر انتخاب کا عنوان مجھے ان کی شاعری کی مناسبت سے بالکل ہی اچھا نہیں لگا۔ 'رنگ حنا' ایک ایسا رنگ ہے جو ابتدا میں نہ صرف خوبصورت لگتا ہے بلکہ ہلکی ہلکی جاں پسند خوشبو بھی دیتا ہے لیکن دھیرے دھیرے رنگ اترنے لگتا ہے اور خوشبو بھی غائب ہونے لگتی ہے اور ایک عرصے بعد تو نہ رنگ رہتا ہے نہ خوشبو۔ فردوس گیاوی کی شاعری تو سمندر کے رنگ کی طرح ہے جو دور سے ہلکا نیلا نظر آتا ہے جیسے جیسے قریب جاؤ رنگ بدلتا رہتا ہے اور اگر کبھی وہ شانت ہوا تو ہم اس میں اپنا چہرہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی ہتھیلی کبھی رنگ سے خالی نہیں ہوتی۔ فردوس گیاوی کی شاعری کی طرح ہوتی مثلاً

درد کے شہر میں ہے گھر میرا — میرے گھر کا پتہ ہے خاموشی
کوئی طوفان دستک دے رہا ہے — خموشی کے حوالے بولتے ہیں
لبوں پہ جس کے ہے فردوس مہر خاموشی — یقین ہے کہ وہ اک روز راز کھولے گا

ان تینوں اشعار میں لفظ 'خاموشی' کا استعمال کیا گیا ہے۔فردوس کا کمال یہ ہے کہ تینوں اشعار میں خاموشی کے لغوی معنی نہیں ہیں۔ پہلے شعر میں خاموشی ایک سنسان ویران علاقے کا نقشہ کھینچتی ہے تو دوسرے شعر میں پیش انقلاب کا جواز پیش کرتی ہے جبکہ تیسرے شعر میں عقدہ اسرار کھولنے کی کوشش کا نام خاموشی ہے۔اس طرح ان کی شاعری میں اکثر ایسے اشعار مل جائیں گے جن کے متن قاری کو ایک جہان دیگر کی جانب لے کر جاتے ہیں۔ پہلے شعر کی کربنا کی دل پر بہت ہی گہرا تاثر ڈالتی ہے جبکہ تیسرے شعر میں تشکیک اور تیقن کے بیچ کی ایک کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔شاعری کے موضوعات وہی ہیں جواب تک مختلف انداز میں بیان کیے گئے ہیں لیکن ان کے اظہار کی ندرت انہیں نیا بنا دیتی ہے۔فردوس نے بھی ہر موضوع کو اپنے طور پر شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ویسے اس انتخاب کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے ان کا رجحان تصوف کی طرف زیادہ ہے۔ان کی حمد کا ایک شعر دیکھیے۔کفر میں ایمان کی عظمت کا کتنا خوبصورت اظہار کیا ہے۔

تو جو چاہے بول اٹھے بت　　آزر کے شہکار میں تو ہے

بدن، گناہ اور جنس کی شاعری کے بھی فردوس کے یہاں اچھوتے اشعار ملتے ہیں۔

ہم نے راتوں میں نئے خواب جو دیکھے تھے کبھی　　آؤ ان خوابوں کی تعبیر کو پورا کر لیں
ہم آسمان سے نقش کہن اتارتے ہیں　　سروں سے بوجھ بدن سے تھکن اتارتے ہیں
خشک ہونٹوں پہ کچھ نمی رکھ دو　　طاق پر پھول بھی کوئی رکھ دو

زبان کا حسن بھی ان کے اکثر شعروں میں نظر آتا ہے۔

میرا شجر ہے زمانے سے بے ثمر مولا　　تو اب کی رت میں ثمر ڈال کر دینا

فردوس کی شاعری اس کے مکمل مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔ان کی شاعری کو اس چھوٹے سے تبصرے سے سمجھنا مشکل ہے۔اس کے لیے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تقریباً نصف صدی سے غزلیں کہنے والا شاعر شتر گربہ جیسی غلطی کرے گا۔کہیں کہیں اشعار غیر موزوں بھی ہیں۔تیسری اور سب سے بڑی خرابی اس مجموعے کی یہ ہے کہ مختلف لوگوں کی رائیں اس میں شامل ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اپنی شاعری پر بھروسہ نہیں۔ایماندار قاری کے لیے تخلیق کو بغیر کوئی لباس پہنائے چھوڑ دینا چاہیے تا کہ وہ متن سے خود معنی پیدا کر سکے۔بہر حال میں شاعر کو اس کی اچھی شاعری کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

انبساط

شاعر: نذر فاطمی

صفحات: 165، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: براڈ سنز مالیر کوٹلہ پنجاب

مبصر: احمد صغیر، حنیف منزل، کوٹلی پوکھر، پولس لائن، گیول بگہا، گیا (بہار)

نذر فاطمی کا پہلا شعری مجموعہ 'ممکنات' 2018 میں شائع ہوا اور دوسرا 2022 میں منظر عام پر آیا۔ ان دونوں مجموعوں میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔نظمیں، حمد، نعت، گیت، قطعات برائے نام ہیں اس کا مطلب نذر فاطمی خالص غزل کے شاعر ہیں۔اردو میں ہر شاعر اپنی شاعری کی شروعات غزل سے ہی کرتا ہے اور غزل میں ہی وہ اپنی شناخت قائم کرنا چاہتا ہے لیکن صرف غزل کے ذریعے پہچان بنانا اتنا آسان نہیں کیونکہ ولی سے لے کر میر، غالب، مومن، اقبال، داغ، فیض، جوش، شاد سب نے زیادہ تر غزلیں ہی کہی ہیں اور شاید ہی کوئی قافیہ ردیف ہوگا جس کا استعمال نہ کیا گیا ہو تو پھر آج کے شاعر کے پاس کہنے کو کیا بچا ہے۔غزل کے حوالے سے اکثر سوال اٹھائے جا رہے ہیں کہ Repeat ہو رہا ہے یعنی وہی قافیہ وہی ردیف وہی بحر اور وہی وزن۔ پھر ایسے میں شاعر کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ کھڑا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے شاعروں سے منفرد کیسے نظر آئے اور ان کی آواز دور سے کیسے پہچانی جائے ظاہر ہے یہ محنت طلب کام ہے لیکن جن شاعروں نے محنت کی انھوں نے اس بھیڑ میں بھی اپنی پہچان بنالی۔ میں یہاں نام نہیں بتانا چاہتا لیکن اس کا اندازہ آپ اس سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ غزل کے حوالے سے جو بھی مضامین لکھے جا رہے ہیں ان کا نام اس میں شامل ہے، بہر حال یہ لمبی بحث ہے۔

نذر فاطمی غزل کے شاعر ہیں اور اپنے طور پر بھرپور کوشش کی ہے کہ ان کی آواز دور سے پہچانی جائے۔ میں کوئی ناقد نہیں ہوں اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں ادب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں اور فکشن سے میرا زیادہ لگاؤ ہے۔شاعری کم پڑھتا ہوں اور شاعری پر لکھتا بھی کم ہوں۔ بہر حال میں نذر فاطمی کا شعری مجموعہ 'انبساط' پورا پڑھ گیا۔کیسے پڑھ گیا یہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کچھ تو بات ہے جو مجھے پورا شعری مجموعہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ پڑھنے کے دوران جو اشعار مجھے بے حد پسند آئے اسے نوٹ کرتا گیا۔آپ بھی کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ایک میرا ہی ہے گھر شیشے کا سوڑ رتا ہوں　　شہر ہی شیشے کا ہو جائے تو خطرہ کیا ہے
زور تنبیہ سے مت چھینئے بچوں کی چہک　　کھل کھلا کر جو نہ ہنستا ہو وہ بچہ کیا ہے

تھک ہار کر چراغوں نے یہ فیصلہ کیا　　طوفاں سے اب کے آنکھ ملانے کی بات ہو

خبر کب نذر کیا مل جائے جانے　　سیاست آج گرمائی بہت ہے

میں نے اوپر جو اشعار درج کیے ہیں اس میں میری اپنی پسند شامل ہے۔ان اشعار میں کوئی بات تو ہے جس نے مجھے متاثر کیا۔

نذر فاطمی نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مختلف موضوعات اور موقع کا شعر کہیں اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ جیسے مزدوروں کے حوالے سے یہ شعر ملاحظہ فرمائیے کہ مزدور دوسروں کے لیے گھر تو بناتا ہے لیکن اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔

عمر گزری مکاں بنانے میں　　پھر بھی مزدور کا نہ گھر کوئی

اردو زبان سے محبت کا یہ شعر دیکھیے۔

لکھی جاتی ہے اب ہندی میں اردو　　ستم یہ ہے ستائش ہو رہی ہے

متوسط طبقے کے لوگوں کی مجبوری کا احساس شاعر کو شدت سے ہے:

بڑی آرزو ہے ہم کو کہیں ایک گھر بناتے
ابھی تک تو بال بچے مرے در بدر رہے ہیں

غریبی کی وجہ سے تعلیم چھوڑنے والوں کا جو درد ہے اس کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

اٹک جاتی ہے جب سوئی فقط اک دال روٹی پر
تو ناداروں کے بچے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتے ہیں

دوسرے ممالک میں بچوں کے رہنے کا شکوہ اور ایک باپ کا درد اس طرح بیان ہوتا ہے۔

سب خوش رہیں جہاں بھی رہیں اے مرے خدا　　میں جی رہا ہوں بچوں کی تصویر دیکھ کر

گاؤں سے ہجرت کرنے والے اپنے گاؤں کو کبھی نہیں بھولتے۔اس پر یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

لکڑی کی آگ مٹی کی ہانڈی کا ذائقہ　　کھلی ہے اپنے گاؤں سے ہجرت کبھی کبھی

امیر بیٹوں اور ان کے رویے پر بھرپور طنز کیا ہے۔

باپ کی برسی پہ تھا مقصود کچھ کار ثواب　　ورنہ کیوں جاتا وہ ناداروں کے مسکن کی طرف

نذر فاطمی نے ہر موضوع پر شعر کہا اور اچھا شعر کہا ہے۔ لیکن کیا یہ اشعار یاد رکھے جائیں گے ان اشعار کو ناقدین کوڈ کریں گے اور معاصر شعرا پر جو مضامین لکھے جا رہے ہیں اس میں جگہ دیں گے؟ یہ تو وقت بتائے گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ نذر فاطمی کی شاعری متوجہ کرتی ہے اور کچھ اشعار پر قاری رُکنے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یہی شاعر کی کامیابی ہے۔ کچھ پروف کی غلطی رہ گئی ہے۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں اس کو ٹھیک کر لیں گے۔

تاریخ

مسلم عهد کا تعلیمی، تهذیبی اور ثقافتی ورثه

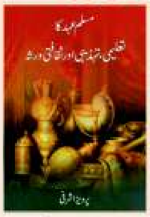

مصنف و ناشر: پرویز اشرفی

صفحات: 272، قیمت: 350 روپے

بہ اہتمام: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: ضیاء الحق خیر آبادی

محلّہ اتراری، پوسٹ خیر آباد، ضلع مئو (یوپی)

قطب الدین ایبک سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک مسلم حکمرانوں کی تاریخ دیکھی جائے تو انھوں نے عدل و انصاف اور مساوات کو قائم کیا، آپسی بھائی چارگی کو فروغ دیا، مذہبی رواداری کو اپنا نصب العین بنایا اور ملک کو تعلیمی، تعمیری اور تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے اس قدر ترقی دی کہ ہندوستان کا شمار دنیا کے خوشحال ترین اور متمدن ملکوں کی صف اول میں ہونے لگا۔ انگریزوں نے یہاں قابض ہونے کے بعد دیکھا کہ ہمارے استحکام کے لیے سب سے اہم اور بنیادی چیز یہاں کی دو بڑی قوموں کے درمیان نفرت و عداوت اور دوری پیدا کرنا ہے، جس قدر ہندو مسلم دشمنی کو فروغ دیا جائے گا اسی قدر ہماری حکومت مستحکم ہوگی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلم سلاطین ہند کے خلاف پروپیگنڈے کا بازار گرم کیا جائے، چنانچہ انھوں نے مسلم حکمرانوں کے روشن کارناموں، عادلانہ نظام، مذہبی رواداری، سماجی ترقیات اور تمدنی کارناموں کے منہ بولتے ثبوتوں کو مسخ کرنے کا منصوبہ بند کام شروع کیا۔

زیر نظر کتاب 'مسلم عہد کا تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ' بھی اسی سلسلے کی ایک بہترین اور جامع تصنیف ہے، جس میں اس کے لائق مصنف پرویز اشرفی نے مسلم سلاطین کے تمدنی کارناموں کا خلاصہ اختصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب ایک دستاویز اور وثیقہ ہے، جس میں ہزاروں صفحات کا خلاصہ اور سیکڑوں کتابوں کا مغز اور جوہر آگیا ہے، گویا سمندر کو کوزے میں سمو دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہمیں مسلم حکمرانوں کی علم پروری کی داستان سناتی ہے اور ان کے تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی کارناموں سے روشناس کراتی ہے۔

کتاب کا آغاز معروف ادیب حقانی القاسمی کی تقریظ سے ہوتا ہے، جس کا عنوان ہے 'مسلم سلاطین ہند کی تاریخ پر ایک منصفانہ دستک'۔ یہ ایک شاندار تحریر اور کتاب کا جامع تعارف اور اس پر بہترین تبصرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نہایت عرق ریزی سے میں نے عہد ماضی کے تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی وراثت پر روشنی ڈالی ہے تا کہ کوئی شعبہ چھوٹ نہ جائے۔ اس کے تحت مدارس کا قیام، ہندوؤں کی تعلیم، کتب خانے، رفاہ عام، حیوانات کی ترقی، کاغذ سازی، عوام خواص کے لباس، خورد و نوش، لوازم مجلس کھانے پکانے اور پینے کے ظروف، توشک خانہ کے سامان، مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہوار، فن مصوری، موسیقی۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے پر قلم چلایا ہے۔ مقصد صرف ایک ہے کہ ہماری نسل بادشاہوں پر عیش و عشرت کا ٹھپہ نہ لگائے بلکہ اُسے معلوم ہو کہ ان حکمرانوں نے نسل انسانی کے لیے اور بھی کام کیے ہیں، بالخصوص فروغ تعلیم کے لیے۔ (ص:20)

مصنف نے تعلیمی سرگرمیوں پر بہت تفصیل سے گفتگو کی ہے، اس کے عناوین سے موضوع کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

شاہان ہند کے عہد میں تعلیم کا فروغ، مغلیہ عہد میں تعلیم کی ترقی، مسلم عہد میں مدارس کا قیام، مسلم عہد میں ہندوؤں کی تعلیم، مسلم حکمرانوں کے عہد میں کتب خانے، ٹیپو سلطان کی علمی و ادبی خدمات، مسلم عہد کے کتب خانوں کا انتظام و انصرام

اول الذکر دونوں ابواب میں شہاب الدین غوری سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے جانشینوں کی تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'مسلم عہد میں مدارس کا قیام' میں اجمیر اور دہلی و آگرہ سے لے کر جونپور و بنارس تک کے 21 مدارس کا ذکر موجود ہے۔ 'مسلم عہد میں ہندوؤں کی تعلیم' اس کتاب کا ایک اہم باب ہے، اس سے مسلمان حکمرانوں کی وسعت قلبی اور بے تعصبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ دو ابواب میں اس عہد کے 41 کتب خانوں اور ان کے انتظام و انصرام کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ 'ٹیپو سلطان کی علمی و ادبی خدمات' کے تحت اس عالم و فاضل سلطان کے متعلق بڑی اہم تاریخی معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں پر نہایت تحقیق و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، درج ذیل عناوین سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے لیے مصنف نے کس قدر محنت و کاوش کی ہے:

مسلم عہد میں رفاہ عام کے کام، مسلم عہد میں ضروری اشیا کی ارزانی، مسلم عہد میں حیوانات کی ترقی، مسلم عہد میں کاغذ سازی، مسلم عہد میں عوام و خواص کے لباس، مسلم عہد میں خورد و نوش، مسلم عہد میں شاہانہ دعوتیں، مسلم عہد میں لوازم مجلس، توشک خانہ کے سامان، مسلم عہد میں کھانے پکانے اور پینے کے ظروف، مسلم عہد میں سواریاں، مسلم عہد میں ہندوؤں کے تہوار، مسلم عہد میں مسلمانوں کے تہوار، مسلم عہد میں تقریبات اور جشن، شادی میں مسلم معاشرے پر ہندوستانی اثرات، مسلم عہد میں موسیقی، مسلم عہد میں فن مصوری

کتاب کا آخری عنوان 'مسلم عہد پر ہندو مورخین کا تبصرہ' بھی اس معنی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ملک نصف درجن سے زائد ممتاز ہندو محققین و مورخین کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی مذہبی منافرت نہیں تھی۔

اس کتاب کے ذریعے مصنف نے اس دور کی حقیقی تصویر اور تاریخی سچائیوں کو تلاش و جستجو کے بعد عوام کے سامنے پیش کیا ہے، جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، اور اس کام کی حقیقی داد یہی ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور کم از کم ہندی اور انگریزی میں ضرور اس کا ترجمہ کیا جائے تا کہ صحیح صورت حال لوگوں کے سامنے آئے۔

تبصرے اور شخصیات

ادبی تبصرے

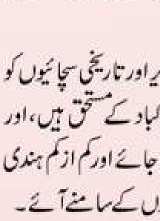

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی

صفحات: 280، قیمت: 400 روپے

مبصر: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی

پرنسپل، گورنمنٹ ڈگری کالج، ظہیر آباد، سانگا ریڈی، (تلنگانہ)

ڈاکٹر محمد ناظم علی شہر اردو حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے ادیب و ادبی صحیفہ نگار ہیں۔ پیشے سے استاد اردو رہے گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نظام آباد سے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ آل احمد سرور پر انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے پی ایچ

ڈی کی سند حاصل کی اور حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد ایم فل کے لیے ان کا گراں قدر تحقیقی کام ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی قلم کو امانت سمجھتے ہیں اس لیے ان کے تحریر کردہ تحقیقی ادبی مضامین و مراسلات مختلف رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی زود گو مصنف ہیں اور اپنی بارہویں تصنیف ادبی تبصرے کے ساتھ قارئین کے روبرو پیش ہوئے ہیں۔ اس سے قبل ان کی شائع شدہ گراں قدر تصانیف میں آئینۂ عصر، روح عصر، عکس ادب، ادبی بصیرت، تنقیدی فکر، افکار جدید، نقش ہیں نا تمام، ادبی وتہذیبی رپورتاژ، ادبی نظر، پروفیسر آل احمد سرور فکر و فن اور حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد شامل ہیں۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے تعاون سے شائع ہونے والی زیر تبصرہ کتاب 'ادبی تبصرے' میں شخصیات، ادبی تبصرے اور مضامین کے زمرہ جات کے تحت متنوع موضوعات پر ڈاکٹر محمد ناظم علی کے فکر انگیز خیالات جمع ہیں۔ شخصیات کے تحت غالب، چکبست، احمد صدیقی میکش، کے ایم عارف الدین، پروفیسر ایس اے شکور، ڈاکٹر نادر المسدوسی، ڈاکٹر محمد غوث اور ڈاکٹر سیادت علی پر مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی اپنے ایک مضمون میں چکبست کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''چکبست اپنی شاعری کے ذریعے عالم انسانیت کو امن، بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ عالم انسانیت کی خدمت چکبست کا مطمح نظر تھا۔ چکبست قومی اور وطنی شعراء میں اولیت کا مقام رکھتے ہیں۔ نئی نسل ان کے کلام اور تعلیمات سے ہم آہنگ ہوجائے تو وطن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔ (ص 20)

ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اردو ادب کی منتخبہ شخصیات پر لکھے اپنے تعارفی وتنقیدی مضامین کے علاوہ اس کتاب میں اپنے عہد کی نامور شخصیات پر بھی مضامین شامل کیے ہیں۔ حیدرآباد میں تعلیم کو فروغ دینے میں کے ایم عارف الدین صاحب کا نام مشہور ہے، جنھوں نے مدینہ ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ ان کی چالیس سالہ فروغ تعلیم کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ناظم علی لکھتے ہیں ''ان کے تعلیمی ادارے مسلم ماحول میں تعلیمی انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ ملک بھر سے ماہر تعلیم، مدبر و دانشوروں کو مدعو کر کے تعلیمی بیداری کے لیے شعور بیدار کیا... مدینہ گروپ کے اداروں سے فارغ التحصیل بچے دنیا میں اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں''۔ (ص 22)۔ زیر نظر کتاب میں 'ادبی تبصرے' زمرے کے تحت چالیس سے زیادہ کتابوں پر ڈاکٹر محمد ناظم علی کے لکھے تبصرے شامل ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر حیدرآبادی مصنفین کی کتابوں پر لکھے گئے۔ جن مصنفین کی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں ان میں علامہ اعجاز فرخ' ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، مجتبیٰ حسین، نفیسہ خان، مسعود جعفری، ڈاکٹر عسکری صفدر اور ڈاکٹر جہاں گیر قیاس وغیرہ شامل ہیں۔ ان ادبی تبصروں کی خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد ناظم علی اپنے تبصرے میں صاحب کتاب کے تعارف کے علاوہ کتاب کے مشمولات کا سیر حاصل تعارف کراتے ہیں اور کتاب کی قدر و قیمت سے آگاہ کراتے ہیں جس سے اردو قارئین کو اپنے اطراف شائع ہونے والی تازہ تصانیف کے بارے میں بھرپور معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام حیدرآباد دکن کی تاریخ کو اجاگر کرتی ایک اہم دستاویز نامور خطیب علامہ اعجاز فرخ نے مرتب کی۔ اس کتاب کے تعارفی تبصرے میں تحقیقی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ناظم علی لکھتے ہیں کہ ''اس مرقع میں سوائے بھاگ متی کے دیگر تاریخ وتہذیب کے نمونے اور حقائق مستند و معتبر مانے جاسکتے ہیں۔ بھاگ متی کے افسانے کو نکال دینا چاہیے۔ جو چیز تاریخ میں ندارد ہے تحقیقات سے ثابت نہیں ہوتی کیا اسے تاریخ میں شامل کرسکتے ہیں؟'' (ص 83)۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے مرقع حیدرآباد کتاب کے تبصرے کے دوران اپنی تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا اور کہا کہ شہر حیدرآباد کو بھاگ متی سے منسوب کرنے کی بات صرف افسانہ ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ زیر نظر کتاب کے سبھی تبصرے دلچسپ اور تحقیقی وتنقیدی بصیرت کے حامل ہیں۔ کتاب کے تیسرے گوشے میں چودہ مضامین شامل ہیں۔ جو زبان کی ترقی و ترویج اور عصری موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ مضامین کے عنوانات اردو زبان کے فروغ کے عملی اقدامات، من پسند رشتوں کی خاطر شادی کی عمر حد سے تجاوز، مختصر افسانہ فن اور تکنیک، سردار سلیم کی انشائیہ نگاری، تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی کا رول، سرسید احمد خان ملک وقوم کا رہنما، جامعہ عثمانیہ کے چانسلرس، عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلروں پر ایک نظر، یہ وہ سحر تو نہیں، ہندوستان آزادی کے 72 سال بعد، بچوں کے ادب کا جائزہ، یادرفتگان (حیدرآباد کے مشاہیر اردو) شوکت عثمانیہ، اردو کا عصری منظر نامہ اور عصری ٹیکنالوجی ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد ناظم علی ہمہ جہت ادیب ہیں اور اردو ادب کے قدیم اور عصری موضوعات پر اظہار خیال پر عبور رکھتے ہیں۔ اردو کا عصری منظر نامہ اور عصری تکنالوجی میں ڈاکٹر محمد ناظم علی اردو زبان کے تعلق سے اپنی فکر کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''عصری دور میں اردو کو عصری تکنالوجی سے مربوط کیا جارہا ہے۔ اشہر فرحان، مرزا جمیل خان، عبید اعجاز، ریحان انصاری اور دیگر اصحاب اردو کو عصری ٹیکنالوجی سے جوڑنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ماضی میں مرزا محمد جمیل نے اردو کی بورڈ کی تیاری کی کوشش کی ہے اور دیگر لوگ کوشش کر رہے ہیں۔ عصری ٹیکنالوجی سے اردو میں آن لائن لیکچر منعقد کیے جارہے ہیں۔ اردو اخبارات کے ای پیپر شائع ہورہے ہیں۔ پرنٹنگ میں آسانی ہوگئی ہے۔ فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ آئندہ بھی مزید تکنالوجی سے استفادہ کیا جائے گا'' (ص 280) ڈاکٹر محمد ناظم علی کے ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان کی بدلتی صورت حال سے بخوبی واقف ہیں۔ مجموعی طور پر تصنیف 'ادبی تبصرے' عہد حاضر کے اردو منظر نامے پر اچھا اضافہ ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی ایک سچے محب اردو ہونے کے ناطے اپنی تحریروں میں اپنے تنقیدی خیالات بھی پیش کرتے جاتے ہیں جو تعمیری نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کتاب میں دوران مطالعہ کچھ زبان و بیان کی غلطیاں اسلوب نگارش کو متاثر کرتی ہیں اس کے باوجود دیدہ زیب سرورق اور عمدہ کمپوزنگ و اشاعت کے ساتھ یہ کتاب اردو ادب میں اچھا اضافہ ہے۔

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

عالمی اردو نامہ

اردو ادب: عالمی تہذیب وثقافت کا نقیب

دوحہ (قطر): اپنے معاشرے کو اگر ہمیں بدلنا ہے اور بہتر تبدیلی چاہتے ہیں تو تعلیم سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ اردو زبان کے چاہنے والوں کا یہ فریضہ ہے کہ سماج کو تعلیم کی روشنی سے مالا مال کریں اور سب سے بڑھ کر کتابوں کی تصنیف اور تالیف کے ساتھ اُن کی اشاعت پر خصوصی توجہ دیں۔ ہر طبقے اور ہر کام کے لیے ہماری زبان میں کتابوں کا ایک سلسلہ ہونا چاہیے۔ بزمِ صدف نے یہ اچھا کام کیا کہ مشاعروں کے ساتھ سمینار، عوامی فلاحی کاموں کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ دراز کیا ہے۔ اِس کے اثرات دیر پا ہوں گے اور سماج کو اِس سے بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ باتیں قطر کی معروف سماجی اور تعلیمی شخصیت جناب حسن عبدالکریم چوگلے نے افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔

عالمی سمینار کا موضوع متعین تھا 'اردو ادب: عالمی تہذیب وثقافت کا نقیب' اِس موضوع کے حوالے سے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے بزمِ صدف کے ڈائرکٹر اور معروف نقاد پروفیسر صفدر امام قادری نے تاریخی اور تہذیبی حوالہ پیش کرتے ہوئے یہ بتایا کہ زبانوں اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کا طور اردو کے آغاز کے زمانے سے ہی ملتا رہا ہے۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی کے دَوران ہندستان میں جو لسانی اشتراک اور لین دین کا ماحول تیار ہوا، اُسی کا ایک خوش گوار نتیجہ اردو کی پیدائش بھی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج جیسے ادارے سے اردو کی بین الاقوامیت اور تصنیف وتالیف کے نئے اور کاروباری آفاق جس طرح روشن ہوئے، اِس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اردو کسی ایک تہذیب یا کسی ایک زبان کی طرف دار بننے کی مجرم نہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ اردو کی تشکیل اور ارتقا کے ہر مرحلے میں غیر مذہبی اور ہر ماحول میں خود کو شیر وشکر کر لینے کا انداز ہی وہ سب سے بڑا حربہ رہا جس نے 1857 کے بعد بدلی ہوئی دنیا میں اردو کو پھیلنے کے مواقع عطا کیے۔ برِصغیر ہندوپاک سے باہر یہ زبان نکلی اور دیکھتے دیکھتے یورپ اور امریکا کے مختلف گوشوں تک پھیلتی چلی گئی۔ غیر اردو آبادی کے سیکھنے اور استعمال میں لانے کی اصل وجہ یہی رہی ہے کہ یہ زبان تہذیبی اور معاشرتی سطح پر یک رُخا انداز نہیں اپناتی بلکہ ایک ہمہ گیر، مشترک اور روادار ماحول کی ترجمانی کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے۔

بزمِ صدف کے چیرمین شہاب الدین احمد نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ بزمِ صدف اپنے علمی وادبی اور ترویج واشاعت کے کام میں کل وقتی طور پر لگی ہوئی ہے۔ بزمِ صدف کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو زبان کی عالمی حیثیت کے شواہد ہر محفل میں پیش کیے جائیں۔ زبانوں سے قوموں کا مزاج سمجھ میں آتا ہے۔ اردو برِصغیر ہی نہیں عالمی طور پر امن اور اخوت کے اوصاف کو عام کرنے کے لیے کوشاں رہی ہے۔ یہ مذاکرہ بھی اِسی طور پر منعقد کیا گیا تاکہ اردو سے متعلق مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیالات کریں اور سماجی وعلمی رواداری کا پیغام عوام تک پہنچایا جا سکے۔

کلیدی خطبے کے بعد معروف افسانہ نگار ڈاکٹر شکیل کی صدارت میں پینل ڈسکشن کا سلسلہ شروع ہوا اور ناظمِ مجلس نے ماہرین سے گزارش کی کہ وہ اپنے تجربات ومشاہدات کے حوالے سے مذاکرے کے علمی دائرہ کار میں توسیع کریں۔ بزمِ صدف بین الاقوامی ایوارڈ یافتہ معروف شاعرہ شاہدہ حسن نے بتایا کہ اردو سے دُور کے علاقے کے باوجود ذاتی کوششوں سے نئی نسل کو اردو کی طرف راغب کرنے کی ہماری کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جغرافیائی اعتبار سے برِصغیر سے مختلف علاقوں میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے، وہ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے قابلِ اعتنا ہے۔ بزمِ صدف نئی نسل ایوارڈ یافتہ شاعرہ اور نقاد ڈاکٹر عنبرین صلاح الدین نے اوّلاً تانیثی ترجیحات کو موضوعِ بحث بنایا اور یہ واضح کرنے میں کامیابی پائی کہ ایک عالمی ماحول میں ہی اِس انداز کا نیا ادب تخلیق پا سکتا ہے جیسا فی زمانہ ہے۔

جرمنی سے تشریف فرما محترمہ امۃ المنان طاہر نے اپنی طویل تدریسی زندگی کے تجربات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جرمنی میں مختلف تعلیمی اداروں میں اردو کی تدریس کے لیے ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں۔ حرف شناسی سے لے کر ترجمہ اور تنقید وتحقیق کا سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک بڑی تعداد میں جرمن نژاد طالب علم اور استاد بھی اِس میدان میں کامیاب ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تقریر کے دوران درجنوں ایسی کتابوں کا تذکرہ کیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ اردو کے شاہکار جرمن زبان میں اور جرمن کے شاہکار اردو میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی برسوں کی مشقت کے نتیجے میں اردو سیکھنے کے لیے جرمن کے طلبہ کے لیے جو کورس تیار کیا، اُس کی شائع شدہ کاپی پیش کرتے ہوئے اطمینان ظاہر کیا کہ اِس سے کوئی بھی جرمن نژاد ابتدائی اردو کی مشقیں مکمل کر سکتا ہے۔

ممتاز مزاحیہ شاعر جناب خالد عرفان جو امریکہ سے تشریف لائے ہوئے تھے،

اُنھوں نے امریکہ میں اردو کی مجلسوں، تدریسی مراکز اور آئے دن ہونے والے مشاعروں کے سلسلے سے اطلاعات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ امریکہ میں یہ زبان برِصغیر کے تارکینِ وطن کے لیے اوّلین ترجیح کا باعث ہے۔ انھوں نے ادبا و شعرا کے درمیان سرگرم علمی رابطے کی اہمیت کا اقرار کیا اور یہ بات بھی بتائی کہ امریکہ میں اردو والے آپس میں ملتے جلتے اور اپنی تخلیقات کو ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں۔ معروف شاعر حسن کاظمی نے ہند و پاک میں اردو شاعری کی مقبولیت اور ذرائع ترسیل کے سہارے بڑے حلقے تک پہنچنے کے معاملات پر غور کرتے ہوئے بتایا کہ اردو کے مستقبل سے مایوسی کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا روایتی دائرۂ کار اچھا خاصا بدل چکا ہے اور اس کے مطابق نئے چاہنے والے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔

مذاکرے کی نظامت مشترکہ طور پر معروف شاعر اور بزمِ صدف دوحہ شاخ کے صدر ڈاکٹر ندیم ظفر جیلانی اور جناب احمد اشفاق، پروگرام ڈائرکٹر بزمِ صدف کر رہے تھے۔ اُنھوں نے جستہ جستہ پینل کے سامنے سوالات بھی پیش کیے۔ اُنھوں نے زبان کے معیاری اور غیر معیاری ہونے کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کے استعمال کی علمی اور عوامی جہات پر افراد کی واضح رائے جاننا چاہا۔

افتتاحی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دوحہ قطر کی معروف شخصیت پروفیسر صوفیہ بخاری نے اردو زبان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دوحہ قطر میں اُن کے شوہر مرحوم محمد صبیح بخاری نے جن کاموں کی بنیادیں رکھی ہیں، اُنھیں وہ آگے بڑھاتی رہیں گی۔ مادری زبان کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انھوں نے اپنے بچوں کو اردو زبان سے واقف کرانے پر زور دیا اور سرپرستوں پر یہ ذمے داری عائد کی کہ وہ چاہے کہیں بھی رہیں، اپنی زبان کی خدمت کا طور اپنا سکتے ہیں۔ افتتاحی جلسے کی نظامت جناب احمد اشفاق نے کی۔ معروف سائنسی محقق پروفیسر سید جاوید زیدی نے اپنی تقریر کے دوران یہ بات کہی کہ برِصغیر سے دور رہتے ہوئے اگر ہم خصوصی توجہ نہ کریں تو اپنے گھروں میں اردو کا چراغ روشن نہ ہو سکے گا۔ اس میں اپنی کمائی کا ایک حصہ بھی خرچ کرنا لازم ہے ورنہ ہماری اولاد سب کچھ سیکھ جائے گی مگر اپنی تہذیب اور ثقافت سے ہمیشہ کے لیے بے پرواہ بھی ہوتی چلی جائے گی۔ روزنامہ تاثیر کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر محمد گوہر نے اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے اردو اخبارات کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مشکل حالات کے باوجود ہم اردو اخبارات شائع کر رہے ہیں اور طرح طرح سے اپنی زبان کے پرچم کو بلند کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ بزمِ صدف کویت شاخ کے صدر جناب مسعود حساس نے کویت اور خلیج کے دوسرے ممالک میں اردو کی موجودہ سرگرمیوں پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔ دوحہ شاخ کے صدر ڈاکٹر ندیم ظفر جیلانی نے استقبالیہ خطاب کیا اور بزمِ صدف کی پچھلی کارکردگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے موجودہ پروگرام اور تقریبِ انعامات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ واضح رہے کہ بزمِ صدف انٹرنیشنل نے 2021 کا بزمِ صدف بین الاقوامی ادبی ایوارڈ کناڈا میں مقیم معروف شاعرہ شاہدہ حسن اور نئی نسل ایوارڈ معروف شاعرہ اور نقاد عنبریں صلاح الدین کو دیا۔ 2020 کے لیے بزمِ صدف ایوارڈ برائے اردو تحریک جناب ابراہیم کمال خان (قطر) اور 2021 کے لیے محمد صبیح بخاری ایوارڈ برائے اردو تحریک معتبر شاعر ظہور الاسلام جاوید کا انتخاب کیا گیا جبکہ 2022 کے لیے محمد صبیح بخاری ایوارڈ برائے اردو تحریک شیراز علی کو دیا گیا۔

اس عالمی سمینار میں دوحہ، قطر کی تمام نئی پرانی ادبی تنظیموں کے نمائندگان کے بشمول محبانِ اردو کی ایک کثیر تعداد شریکِ محفل تھی۔ تقریب میں ہندستان، پاکستان، کناڈا، امریکا، ابوظہبی، کویت، جرمنی جیسے ممالک سے مقبول ادبی شخصیات جمع ہوئی تھیں جس کی وجہ سے سمینار کے معیار اور وقار میں چار چاند لگ گئے۔ برِصغیر سے باہر اردو زبان و ادب کے حوالے سے اتنی کثیر تعداد میں دانش وروں کی شرکت خال خال ہوتی ہے۔ گولڈن اوشین ہوٹل کے ہال میں منعقد اس سمینار کا اختتام پُرتکلف عشائیے پر ہوا۔

پریس ریلیز: صفدر امام قادری، ڈائرکٹر: بزمِ صدف انٹرنیشنل، 31 جنوری 2023

سہ ماہی 'فکر و تحقیق'، جنوری تا مارچ 2023

- امیر خسرو کی تاریخی تصانیف — صادق
- خطوطِ غالب کا اسلوبی مطالعہ — سلیم شہزاد
- مسافرانِ شبلی منزل (عہدِ شبلی و سلیمان) — محمد الیاس الاعظمی
- ظریفانہ صحافت اور پنچ اخبارات — محمد ذاکر حسین
- شاعرِ زنداں مسعود سعد سلمان — مغیث احمد
- صنف اندر صنف، آزاد غزل سے غزالہ تک — شیخ احرار احمد
- سفرنامہ برنیئر اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت — سعید احمد

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

74ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر تقریب پرچم کشائی

نئی دہلی: آج کا دن یعنی یوم جمہوریہ ہمارے ملک کے لیے تاریخی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ آج ہی کے دن دستور ہند کا نفاذ عمل میں آیا تھا۔ یہ بات قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے آج یہاں 74ویں یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی

کی تقریب کے دوران اظہار خیال کرتے ہوئے کہی۔

انھوں نے کہا کہ ہندوستانی جمہوریت میں ملک کے ہر شہری کو مساوی اختیارات و حقوق حاصل ہیں، ساتھ ہی ہم سب پر یکساں ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے کہ جمہوریت کا ہر ممکن تحفظ کریں۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دن ملک کے تمام باشندوں کو یہ عہد کرنا چاہیے کہ وہ ہندوستان کو ایک مثالی جمہوری ملک بنانے میں اپنا کردار ادا کریں گے اور وطن عزیز کی تعمیر وترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک ساری دنیا میں ایک عظیم جمہوری ملک کے طور پر جانا جاتا ہے جس میں بے پناہ تہذیبی و ثقافتی تنوع ہے، تہذیبی و مذہبی رنگارنگی ہندوستان کی خوب صورتی ہے جسے برقرار رکھنا ہم سب پر لازم ہے۔

ڈاکٹر عقیل احمد نے مزید کہا کہ اردو زبان سے بھی جمہوریت کا گہرا تعلق ہے۔ جمہوری افکار و اقدار کے فروغ اور اشاعت میں اردو صحافت وشاعری نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اردو کے جمہوری مزاج نے ملک کی سالمیت اور یکجہتی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی اردو زبان اپنی اس ڈگر پر قائم ہے اور ملک کی جمہوری روح کی حفاظت میں پیش پیش ہے۔

قبل ازاں قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد تزک واحتشام کے ساتھ کیا گیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے پرچم کشائی کی۔ کونسل کے عملے نے قومی ترانہ گایا اور ترنگے کو سلامی دی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2023

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام عبدالواحد ہاشمی و نفیس الرحمان سیوہاروی کی کتاب 'ہفت پہلو سلیم شیرازی' کا اجرا

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام سینئر صحافی، مترجم و شاعر سلیم شیرازی کی شخصیت و خدمات کے تجزیوں پر مشتمل مضامین کے مجموعے 'ہفت پہلو سلیم شیرازی' کا آج کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور دیگر شخصیات کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شیخ عقیل احمد

نے کہا کہ سلیم شیرازی کو میں عرصۂ دراز سے جانتا ہوں، وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں، انھوں نے اردو صحافت، ترجمہ، فکشن اور شاعری تمام شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سلیم شیرازی چونکہ بہ یک وقت کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں اس لیے ان کا مطالعہ بھی وسیع اور متنوع ہے اور اس کا اظہار ان کی تخلیقات سے بھی ہوتا ہے۔ شیخ عقیل نے اس کتاب کی اشاعت پر سلیم شیرازی اور کتاب کے مرتبین عبدالواحد ہاشمی و نفیس الرحمان سیوہاروی کو دلی مبارکباد پیش کی اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے سلیم شیرازی کی شخصیت اور فکر و فن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ممتاز ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے کہا کہ سلیم شیرازی کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ ایک خوددار شخصیت کے مالک ہیں، بہت ہی مشفق، محبت کرنے والے اور اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے انسان ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شیرازی صاحب حقیقی معنوں میں اردو کے بے لوث خادم ہیں۔ انھوں نے جہاں دہلی سے شائع ہونے والے بیشتر اردو اخبارات میں خدمات انجام دیں، وہیں ان کی کلاسیکی رنگ کی شاعری بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ یہ کتاب ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی عمدہ کوشش ہے جس کے لیے میں مرتبین کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

قومی بھارت کے ایڈیٹر ممتاز عالم رضوی نے کہا کہ سلیم شیرازی ایک قلندر صفت انسان ہیں، کردار و عمل کا حسن ان کی شناخت ہے اور وہ لکھنؤ و دہلی دونوں دبستانوں کی ادبی و ثقافتی خصوصیات کے امین ہیں۔ یہ کتاب سلیم شیرازی اور ان کے عہد کی بھرپور عکاسی کرتی ہے، جس کے لیے مرتبین قابلِ ستائش و تحسین ہیں۔ مشہور شاعر معین شاداب نے سلیم شیرازی سے اپنے دیرینہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شخصیت و اطوار کے دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ سلیم شیرازی واقعی ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں اور ان کی شخصیت کا ہر پہلو ایک مستقل موضوع اور ایک کیرکٹر ہے۔ انھوں نے خصوصاً ان کے شعری اوصاف و محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ چونکہ سلیم شیرازی کو لکھنؤ کے قدیم شعرا کی صحبت حاصل رہی ہے اور انھوں نے کلاسیکی شعرا کا مطالعہ کر رکھا ہے، اس وجہ سے ان کی شاعری میں وہی رنگ پایا جاتا ہے جو استاد شعرا سے مخصوص ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے سلیم شیرازی کی پذیرائی و اعتراف کے لیے کونسل کا اسٹیج فراہم کیا۔ اس موقعے پر کتاب کے مرتب عبدالواحد ہاشمی نے بھی اظہار خیال کیا، جبکہ حاضرین کی خواہش پر جناب سلیم شیرازی نے کچھ منتخب نعتیہ اشعار پیش کیے۔ آخر میں کتاب کے دوسرے مرتب جناب نفیس الرحمٰن سیوہاروی کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر کونسل کے اسٹاف کے علاوہ معروف صحافی جناب ظفر انور شکرپوری، مشہور شاعر منیر ہمدم، عبارت پبلی کیشن کے سربراہ سلام الدین خان اور علی ساجد وغیرہ بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 جنوری 2023

پروفیسر ابن کنول کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشست

نئی دھلی: اردو کے مشہور ناقد، محقق اور افسانہ نگار پروفیسر ابن کنول سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے انتقال پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ پروفیسر ابن کنول کا این سی پی یو ایل سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ قومی اردو کونسل کے بہت سے علمی اور ادبی معاملات میں ان کی رہنمائی ملتی رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ابن کنول میرے مشفق استاد تھے۔ وہ محبت اور شفقت کی ایک جلی علامت تھے۔ ان کی موت سے اردو زبان و ادب نا قابل تلافی خسارہ ہوا ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ پروفیسر ابن کنول نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی لیکن داستان ان کا خاص موضوع تھا۔ اس کے علاوہ افسانے، خاکے، انشائیے اور تحقیق و تنقید پر بھی انھوں نے گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت فنکار تھے اور ان کی تخلیقات انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ خلیل الرحمٰن ایڈووکیٹ نے بھی ابن کنول کی شخصیت کے مختلف زاویوں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، ان کا اچانک اس طرح اس دنیا سے چلے جانا واقعی ہم لوگوں کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں، ان کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ ان کے اندر بناوٹ بالکل نہیں تھی، ان کی تحریر و تقریر بھی اس سے پاک تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ابن کنول چونکہ داستان کے آدمی تھے اس لیے ان کی شخصیت پر داستان کا بہت گہرا اثر تھا، وہ مشکل اور پیچیدہ الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے، ان کو جنون کی حد تک پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کا کام بہت وقیع ہے خاص طور پر داستان کے تہذیبی پس منظر کے حوالے سے ان کی کتاب بہت اہم ہے۔ اردو کے ناقد اور صحافی حقانی القاسمی نے تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول کی شخصی اور ادبی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ابن کنول اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والے شخص نہیں تھے، ان کا سماجی دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے علمی اور ادبی دنیا کو جو گراں قدر اثاثہ عطا کیا ہے اس سے ان کی مطالعاتی وسعت اور فکری تناظرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ داستان کے حوالے سے ان کا تحقیقی اور تنقیدی کام نئی نسل کے لیے نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس تعزیتی نشست میں کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 فروری 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دهلی

مصطفیٰ آباد میں تین روزہ قومی خطاطی ورکشاپ

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

وزارت تعلیم حکومت ہند اور صوفیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام شمال مشرقی ضلع کے علاقے مصطفیٰ آباد میں تین روزہ قومی خطاطی ورکشاپ اور مقابلہ منعقد ہوا جس میں بطور مہمانان خصوصی اردو اکادمی کے سکریٹری احسن عابد اور شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شرکت کی۔ اس موقعے پر معروف کیلی گرافر مختار احمد نے کہا کہ یہاں آکر تقریباً 250 بچوں کو تربیت کے دوران اپنا ہنر جاننے کا موقع ملا اور بچوں نے بہت کم وقت میں بہت خوشی سے سیکھا۔ پوری دنیا میں میں نے مختلف جگہوں پر ورکشاپس کی ہیں، لیکن جتنے بچوں کی تعداد یہاں دیکھنے کو ملی وہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ شمع کوثر نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل ملک میں اس طرح کی ورکشاپ کے انعقاد کے لیے ہمہ وقت تیار ہے اور مجھے بہت خوشی ہے کہ بنگلور کے مشہور و معروف خطاط مختار احمد کو مدعو کیا ہے یقیناً صوفیہ این جی او کے اس اقدام سے خطاطی کو ایک نئی جہت ملے گی۔ احسن عابد کا کہنا تھا کہ جب اس قسم کے ہنر کی بات کی جائے تو خطاطی کا نام سرفہرست آتا ہے خطاطی ہمیں نظم وضبط کا پیغام دیتی ہے اور لوگوں کو احترام کا دائرہ بتاتی ہے۔ صوفیہ این جی او کے صدر سہیل سیفی نے کہا کہ قومی کونسل ملک کا ایک ایسا ادارہ ہے جس کے ذریعے پورے ملک میں خطاطی کے مراکز کی ایک بڑی تعداد چل رہی ہے اور صوفیہ سوسائٹی گزشتہ 12 برسوں سے اب تک مسلسل خطاطی سینٹر چلا کر شاندار کام کررہی ہے اور ہزاروں نوجوانوں کو خطاطی سکھائی گئی ہے۔ خطاطی کے مقابلے میں شبینہ کو اول، ہمیر کو دوم، ثنا کو سوم اور چار دیگر کو انعامات دیے گئے۔ تمام بچوں کا کام شاندار رہا جس پر تمام بچوں کو سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ اس موقعے پر دانش ایوبی، ندیم، سرفراز، جمیل احمد سیفی، مشتاق احمد، حافظ وسیم، عبدالرحمٰن، قادر، شاہینہ وغیرہ بطور خاص موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 22 جنوری 2023

ایک شام یادرفتگاں کے نام

نئی دهلی: مولانا محمد علی جوہر ایک مفکر، دانشور اور عظیم مجاہد آزادی تھے۔ ملک کی آزادی کے لیے ان کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر نئی دہلی میں انجمن تعمیر اردو کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر کے یوم وفات کے موقعے پر منعقد 'ایک شام یادرفتگاں کے نام' جلسے میں مقررین نے کیا۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے انجمن کے جنرل سکریٹری رؤف رامش نے مرحوم ادیبوں اور شاعروں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر اخترالواسع نے اپنے منفرد انداز میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر کو دانشور، مفکر، شاعر، صحافی اور عظیم مجاہد آزادی قرار دیتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کی قربانیوں کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ تقریب کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے مولانا محمد علی جوہر کو ایسا مجاہد آزادی قرار دیا جو بے نظیر تھا، بے نظیر ہے اور بے نظیر رہے گا۔ دیگر اہم شرکا میں ایمس کے مشہور و معروف ڈاکٹر محمد فاروق، جامعہ اسلامیہ کے سابق اسٹیٹ رجسٹرار افضال الرحمٰن وغیرہ شامل تھے۔ بعدازیں محفل شعروسخن کا انعقاد بھی کیا گیا جس کی نظامت معین شاداب نے کی۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان میں سلیم شیرازی، رئیس مظفرنگری، درد دہلوی، رحمان مصور، رؤف رامش، شرف نانپاروی، معین قریشی، فرمان چودھری، اختر اعظمی، سرفراز احمد فراز دہلوی، شاذ جہانی، خالد اخلاق، محبوب امین، وحید عازم، مونس رحمان، تابش خیرآبادی، وقار جلال آبادی، ہاشم دہلوی اور عارف دہلوی وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2023

غازی الدین خان لیکچر

نئی دهلی: شمالی ہند کی ممتاز تعلیمی درسگاہ دہلی کالج سے تعلیم حاصل کرنے والے ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت ہندوستان کے ادبی افق پر چمکنے والے چند نابغہ روزگار ادیبوں میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ زبان وادب کے معیار اور فکر وخیال کی عمدگی کے لحاظ سے انھیں اردو زبان و ادب کے عناصر خمسہ میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف اردو کے ادیب نہ تھے بلکہ ان کو عربی زبان وادب پر بھی کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ عربی ذاکر حسین دہلی کالج میں منعقدہ غازی الدین خان لیکچر سیریز کے آٹھویں پروگرام میں مہمان خطیب بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری میں اسلامک اسٹڈیز اور اسکول آف لینگویجز کے ایسوسی ایٹ ڈین پروفیسر شمس کمال انجم نے کیا۔ واضح رہے ذاکر حسین دہلی کالج کا شعبہ عربی 300 سالہ قدیم مدرسہ غازی الدین خان کے تاریخی ورثے کی یادگار میں ہر سال تاریخی لیکچر منعقد کرتا ہے، یہ لیکچر بھی اسی سلسلے کا آٹھواں پروگرام تھا، جس کا انعقاد کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ کی صدارت میں عمل میں آیا۔ مہمان ذی وقار کے طور پر صحافی حبیب سیفی نے

شرکت کی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر محمد عبیداللہ نے مہمان مقرر پروفیسر شمس کمال انجم کا تعارف کراتے ہوئے ذاکر حسین دہلی کالج سے ان کی طالب علمانہ وابستگی، ان کی تدریس اوران کے علمی کارناموں کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر مہمان خطیب کی نوطبع شدہ کتاب 'شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد' کا کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ، مہمان صحافی حبیب سیفی، صدر شعبہ ڈاکٹر محمد عبیداللہ ودیگر اساتذہ کے ہاتھوں اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے شعبہ کے استاد ڈاکٹر سید محمد طارق نے سابقہ لیکچرر پر روشنی ڈالی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پر محیط اپنے طویل خطبے میں مہمان اسپیکر نے ڈپٹی نذیر احمد کی پیدائش و پرورش، نشو ونما اور ان کے عہد طفلی کی تعلیمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے شہر دہلی میں ان کے ورود مسعود اور پھر دہلی کالج کے تعلیمی مشغلوں سے سامعین کو واقف کرایا۔ ان کی عربی زبان دانی پر بھی بھرپور روشنی ڈالی۔ شعبہ عربی کے سال اول میں داخلہ لینے والے جدید طلبہ و قدیم طلبہ کی طرف سے استقبالیہ پروگرام بھی پیش کیا گیا، جس میں نئے طلبہ نے اپنا تعارف پیش کیا، قدیم طلبہ نے انھیں تحائف سے نوازا۔ تقریب میں ڈاکٹر محمد قاسم عادل، عامر جمال، ڈاکٹر نسیم احمد، ڈاکٹر عبدالملک، ڈاکٹر محمد معین الدین خان، ڈاکٹر محمد مستمر اور ڈاکٹر احسان کے علاوہ تمام طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جنوری 2023

اردو فکشن میں جادوئی حقیقت نگاری

دهلی: دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو کے زیر اہتمام 'اردو فکشن میں جادوئی حقیقت نگاری' کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیتے ہوئے معروف فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید نے کہا کہ جادوئی حقیقت نگاری کوئی نظریہ، کوئی رجحان نہیں بلکہ کہانی کہنے کا ایک طریقہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میجک یا جادو بنیادی طور پر نصف سائنس ہے، جہاں علت ومعلول کا رشتہ ٹوٹتا ہے، وہیں جادو بن جاتا ہے اور جادو نصف سائنس ہے۔ اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہوئے ہم جادو کو یاد رکھتے ہیں لیکن حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی بھی امیجی نیشن ایسی نہیں ہے جس میں حقیقت نہ ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ جادوئی حقیقت نگاری کی اصطلاح پہلی بار پینٹنگ کے لیے استعمال ہوئی تھی۔ سماجی حقیقت نگاری کا متبادل ومتوازن کوئی اسلوب ہم نے تلاش نہیں کیا۔ اس سے قبل استقبالیہ خطاب میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی نے کہا کہ توسیعی خطبات کی یہ دوسری کڑی ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ ادب اور فکشن میں رائج ہونے والے نئے رجحانات سے طلبہ و طالبات کو واقف کرایا جائے۔ توسیعی خطبے کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے پروفیسر ابوبکر عباد نے ممتاز فکشن نگار اور استاذ پروفیسر خالد جاوید اور پروگرام کے صدر پروفیسر ہریش ترویدی کا تعارف کرایا۔ مہمان خصوصی پروفیسر اپیتا بھ چکرورتی نے کہا کہ شعبۂ اردو کافی اہم پروگراموں کا انعقاد کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کے اہم پروگراموں کا انعقاد ہوتا رہے گا اور دیگر شعبہ جات بھی اس طرح کے اہم پروگرام منعقد کریں گے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ہریش ترویدی نے کہا کہ آج کا موضوع بہت اہم ہے۔ پروفیسر خالد جاوید نے ادو کا پرچم دنیا میں اونچا کیا ہے۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر ارشاد نیازی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جادوئی حقیقت نگاری پر اردو میں کافی کم بات ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں خالد جاوید جادوئی حقیقت نگاری پر بات کرتے ہیں تو جی خوش ہوجاتا ہے۔ اس تقریب میں پروفیسر ارجمند آرا، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر مشتاق عالم قادری، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر علیم اشرف خان، پروفیسر مظہر احمد، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر ماہتاب جہاں، ڈاکٹر نکہت پروین، ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر ہردے بھانو پرتاپ، شمیم احمد، ڈاکٹر مرتضیٰ، ڈاکٹر فرحت کمال، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن، ڈاکٹر شاہ فہد نسیم، ڈاکٹر سنیل کمار، ڈاکٹر عرفان، آصفہ زینب، ڈاکٹر اقبال حسین وغیرہ اور مختلف شعبہ جات کے طلبہ وطالبات نے خصوصی طور پر شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 جنوری 2023

اسلامی اقدار وحقائق کی ادبی تشکیل

نئی دهلی: بزم آگہی کی جانب سے اوکھلا کے بٹلہ ہاؤس،

جامعہ نگر میں ڈائینمک انگلش کوچنگ سینٹر میں اسلامی اقدار وحقائق کی ادبی تشکیل کے موضوع پر ایک پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس میں مختلف تعلیمی درس گاہوں کے طلبہ وریسرچ اسکالرز نے شرکت کرکے اپنی اپنی تخلیقات پیش کیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے جناب حقانی القاسمی نے کہا کہ اسلامی اقدار اور انسانی اقدار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام عظمت انسانیت کا پیروکار ہے۔ انھوں نے کہا کہ مذہبی شدت پسندی سے پرہیز کرتے ہوئے ہمیں مذہب کو مذاق بننے سے بھی بچانا ہے۔ اسلام اور سائنس میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے۔ انسان سب سے بڑا بیانیہ وجود ہے اور ہم سب اس کائنات کہانی کے کردار ہیں۔ اس پروگرام میں مہمانِ خصوصی رہے جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ ادیب قدروں کو تہس نہس کردیتا ہے جیسے راجندر سنگھ بیدی نے اپنے مشہور افسانہ لاجونتی میں انسانی اقدار کو توڑ پھوڑ دیا ہے۔ ہمیں اسلامی اقدار متعین کرنے کے لیے آج نئے سرے سے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اندرا گاندھی اوپن نیشنل یونیورسٹی شعبۂ اردو کے استاد جناب ڈاکٹر شاکر علی صدیقی مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادب کبھی بھی براہِ راست گفتگو نہیں کرتا۔ تجسس، تخیل اور تفکر کی تثلیث کی تجسیم وتشکیل سے ادب وجود میں آتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ رومی، حافظ شیرازی، شیخ سعدی، خنسا، ٹی ایس ایلیٹ، شیکسپیئر، اقبال، حفیظ جالندھری وغیرہ سب کے سب اعلیٰ پائے کے تخلیق کاروں نے مذہبی اقدار سے ادب کو بنایا سنوارا ہے۔ ادب کی تشکیل میں فن پر توجہ مرکوز رکھنا ادیب کا اولین فریضہ ہے۔ اس پروگرام میں دو افسانے، دو مضامین اور نو تخلیقات پیش کی گئیں۔ افسانہ نگار کے طور پر ڈاکٹر ذاکر فیضی نے اپنا افسانہ 'ٹی اوڈی' اور عاصم بدر نے آخری کہانی پیش کیا۔ ممبئی سے کاشف شکیل نے 'بدلہ لے لو' اور آگرہ سے سعدیہ سلیم شمسی نے ردعمل کے عنوان سے اپنے اپنے مضامین آن لائن پیش کیے۔ تخلیق کاروں میں ممبئی سے خان ذاکر خان، اعظم گڑھ سے ظل الرحمٰن فائق

بندوی، لکھنؤ سے ابوبکر ایوب، غازی پور سے غفران حکیم نے آن لائن اپنی تخلیقات پیش کی۔ جب کہ فیضان الحق، نسیم افضل اور ابوالاشبال نے بنفس نفیس شریک ہوکر اپنے کلام پیش کیے۔ جناب محمد اشرف یاسین نے بزم آگہی کا مختصر تعارف اور اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا۔ ڈاکٹر محمد عارف نے پروگرام کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر شاداب تبسم کے کلمات تشکر پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔ پروگرام آن لائن اور آف لائن دونوں موڈ میں ہوا، جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے طلبہ و اساتذہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ شرکا میں کشمیر یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر امتیاز احمد تانترے، ڈاکٹر انوارالحق، ڈاکٹر عبدالرحمٰن، ڈاکٹر زاہد ندیم احسن، ڈاکٹر خان رضوان، محمد عامر، طاہر عزیز، مناظر ارشد، طارق الزماں، محمد آصف، ہاشم الدین، منزہ بیگم، شاہین فاطمہ، پرویز اعظم، ثمرین، آصفہ زینب، محمد التمش، فیض الرحمٰن وغیرہ نے بنفس نفیس شرکت کی۔ جب کہ دہلی، ممبئی، راجستھان، اعظم گڑھ، آگرہ، کانپور اور لکھنؤ جیسے کئی بڑے شہروں سے بہت سارے لوگوں نے آن لائن شریک ہوکر اسے کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

روزنامہ تاثیر دہلی، 30 جنوری 2023

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ریسرچ اسکالر پیپر پرزینٹیشن پروگرام کا انعقاد

نئی دھلی: ریسرچ اسکالر کے تحقیقی معیار کو بہتر بنانے کی کوششوں کو رفتار دیتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ریسرچ اسکالر ماہانہ پیپر پرزنٹیشن پروگرام (آر ایس ایم پی پی ایس) کا انعقاد عمل میں آیا جس میں پروفیسر سید حسنین اختر، سینئر استاذ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، پروفیسر نعیم الحسن صدر شعبہ، ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر محمد اکرم اور ڈاکٹر اصغر محمود اساتذہ شعبۂ ہذا سمیت بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز نے شرکت کی۔ پروگرام کا تعارف اور اس کی معنویت کو بیان کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر نعیم الحسن نے کہا کہ ریسرچ کی اہمیت اور اس کی نزاکت کو سمجھنا اچھی تحقیق کی بنیاد ہے اور جب آپ اس طرح کے پروگرام میں شرکت کرتے ہیں تو آپ کی خوابیدہ صلاحیت کو تحریک ملتی ہے جس کے بعد کسی اسکالر سے ایک اچھے تحقیقی کام کی توقع کی جاتی ہے۔ پروگرام میں شعبہ کے ریسرچ اسکالر محمد سلمان نے اپنے پی ایچ ڈی کے عنوان 'حنا مینا کے ناول میں اہم سماجی مسائل' پر اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے شامی ناول نگار حنا مینا کے عربی ناول

ڈاکٹر احمد تنویر کے اعزاز میں شعری نشست

اور اس کی فنی خوبیوں و خامیوں کو تحقیقی زاویے میں پیش کیا۔ دوسرے اسکالر نوشاد نوری نے 'آزاد ہندوستان میں عربی نثر نگاری کے انواع' پر اپنا تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے ہندوستانی علما کی نثر نگاری میں بیش بہا خدمات کا تحقیقی تعارف پیش کیا۔ اس سے قبل پروگرام کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے پروفیسر سید حسنین اختر نے اس طرح کے پروگرامز کو اسکالرز کی تحقیقی صلاحیت کو نکھارنے کا پلیٹ فارم قرار دیا اور اس میں تمام طلبا و اسکالرز کی شرکت کو لازمی قرار دینے کی تجویز پیش کی۔ پروگرام میں ڈاکٹر آصف اقبال، ڈاکٹر ابوتراب، ڈاکٹر نعیم الحسن گیسٹ اساتذہ، شعبہ ہذا نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، ا فروری 2023

نثری نشست

نئی دھلی: غالب اکیڈمی میں پہلی نثری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت نارنگ ساقی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شاداب تبسم نے 'اختر الایمان کی افسانہ نگاری' پر ایک مضمون پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ اختر الایمان کے افسانے شاعری کی طرح اردو کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ افسانے میں ان کی نثر سادہ ہوتی ہے اور تصنع سے بہت دور ہوتی ہے۔ ڈاکٹر شہلا احمد نے 'فیض احمد فیض کی شاعری' پر ایک مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر ذاکر فیضی نے افسانہ 'ٹوٹے گملے کا پودا' اور افسانچہ 'جھٹکے کا گوشت' سنایا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ اس موقعے پر ٹی این بھارتی نے انعامات سے متعلق ایک مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر مظہر محمود نے کہا کہ غالب اکیڈمی نے نثری نشست کا آغاز کر کے بہت اچھا کام کیا اس سے اردو کا فروغ ہوگا۔ انور علی قاسمی نے کہا کہ اردو میں دنیا کی تمام زبانوں کے الفاظ ادا کرنے کی صلاحیت ہے، اردو نے ہر جگہ پنا مقام بنایا ہے اس کا مستقبل محفوظ ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ پچیس سال پہلے غالب اکیڈمی نے ادبی نشست کا آغاز کیا تھا ابتدا میں اس میں کم لوگ شریک ہوتے تھے لیکن دھیرے دھیرے اس کا دائرہ بڑھتا گیا۔ اس میں مشہور افسانہ نگار جوگندر پال، مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض، انجم عثمانی، جعفر عباس شریک ہوتے تھے اور اب بڑی تعداد میں ہندی اردو کے شاعر شرکت کرتے ہیں۔ نثری تخلیقات کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے اس لیے اسے الگ سے مہینے کے آخری ہفتے کو منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2023

ڈاکٹر احمد تنویر کے اعزاز میں شعری نشست

نئی دھلی: ڈاکٹر احمد تنویر سے مل کر مجھے یک گونہ قربت کا احساس ہوا۔ ان کے کلام میں نفاست اور لطافت کے ساتھ ایک نوع کی جدت متاثر کن ہے۔ اردو سے ان کا غیر پیشہ ورانہ تعلق بھی قابل رشک ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر احمد تنویر کے اعزاز میں مشہور تعلیمی اور ثقافتی تنظیم 'دی ونکس فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام منعقدہ شعری نشست کے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اردو سے جن لوگوں کا تعلق روزی روٹی کا ہوتا ہے، اردو کے لیے کام کرنا تو ان کا فرض منصبی ہے، لیکن ڈاکٹر احمد تنویر ان لوگوں میں ہیں جو سائنس کے میدان سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا اردو کے لیے ان کی جو بھی سرگرمیاں رہی ہیں وہ اردو کی سچی اور بے لوث خدمت ہے۔ عادل حیات نے تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر احمد تنویر اسّی اور نوے کی دہائی میں مظفر پور کے ادبی حلقے میں نہایت فعال رہے اور انھوں نے مشہور ادیب، ترجمہ نگار اور اسکالر پروفیسر انیس الرحمٰن کے ساتھ شاندار سمیناروں اور مشاعروں کا انعقاد کیا۔ شعری نشست میں ڈاکٹر احمد تنویر، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر ابوبکر عباد، احسان قاسمی، ڈاکٹر عادل حیات، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر امتیاز رومی، ڈاکٹر سلمان فیصل، سفیر صدیقی اور ڈاکٹر زاہد ندیم احسن نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر امتیاز احمد

علیمی، عبدالباری صدیقی، شبانہ ناز اور شفق کمال کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 1 فروری 2023

اترپردیش

اردو بیت بازی

وارانسی: بنارس ہندو یونیورسٹی کے مہیلا مہاودیالیہ میں

'منتھن' کے بینر تلے منعقد 'اردو بیت بازی' میں طالبات نے سامعین کو اردو زبان کی شیرینی کا احساس کرایا۔ 'اردو بیت بازی' میں 5-5 طالبات پر مشتمل تین ٹیموں نے حصہ لیا؛ جن کے نام میر، غالب اور فراق رکھے گئے تھے۔ جج کی ذمے داری پروفیسر رفعت جمال اور ڈاکٹر مشرف علی نے ادا کی۔ بہترین کارکردگی کا مظاہرہ میر گروپ کی طالبات نے کیا۔ جج کے متفقہ فیصلے سے پہلا انعام میر گروپ کو دیا گیا، دوسرا انعام گروپ غالب اور تیسرا انعام فراق گروپ کو دیا گیا۔ تینوں گروپوں میں مجموعی طور پر 15 طالبات نے بہترین اشعار پڑھ کر محفل میں موجود ہر ایک کا دل جیت لیا۔ 'اردو بیت بازی' کا آغاز 'اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ، ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے' سے کیا گیا۔ 15 طالبات میں مجموعی طور پر بہترین کارکردگی کا پہلا انعام اردو کی طالبہ انکو کو ملا، جب کہ ریتیکا سنگھ کو دوسرا اور سونا کشی یادو اور سواتی مشرا کو مشترکہ طور پر تیسرا انعام ملا۔ اس موقعے پر پروفیسر رفعت جمال نے کہا کہ آج سے تقریباً بیس برس قبل اس 'بیت بازی' کا آغاز کیا گیا تھا؛ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ انھوں نے تمام طالبات کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ تینوں گروپوں میں جس طرح کا مقابلہ دیکھنے کو ملا وہ بہت ہی قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر مشرف علی نے کہا کہ ہماری زندگی کو بہتر اور ترقی یافتہ بنانے میں زبانوں کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے بیت بازی کی اہمیت بھی پر روشنی ڈالی اور طالبات کو مفید مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ جذبات واحساسات کی ترجمانی کا مؤثر ذریعہ زبان ہی ہے۔ اردو سیکشن کے انچارج ڈاکٹر افضل مصباحی نے نظامت کے فرائض ادا کیے جب کہ شکریہ کی رسم ریسرچ اسکالر محمد اعظم نے ادا کی۔ طالبات کو بیت بازی کی تیاری کرانے میں محمد اعظم، کمال الدین، عائشہ پروین، نسرین جہاں اور خوش ناز نے اہم کردار ادا کیا۔ مختلف شعبوں کے اساتذہ پروفیسر ریتا سنگھ، پروفیسر میتالی، پروفیسر لیلینا بھٹ، پروفیسر کلپنا گپتا، پروفیسر ریچا کمار، ڈاکٹر اروشی گہلوت، ڈاکٹر ناز بیگم اور ڈاکٹر ندھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالرز اور دیگر شعبہ جات کے طلبہ وطالبات نے کثیر تعداد میں شریک ہوکر طالبات کی حوصلہ افزائی کی۔

پریس ریلیز: محمد افضل حسین، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی، 1 فروری 2023

تعلیم نسواں

امروهه: عالمی یوم بنات کے موقعے پر ہاشمی گرلس ڈگری کالج امروہہ شعبہ اردو کے زیر اہتمام سمینار کا انعقاد بعنوان تعلیم نسواں ہوا۔ سمینار کے دوران اساتذہ و طالبات نے تعلیم نسواں کے فروغ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ طالبات نے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی اور خواتین کی فلاح بہبود وحصول حقوق کا ذریعہ تعلیم کو بتایا۔ مہمان خصوصی چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ امروہہ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی ایڈوکیٹ نے کہا کہ تعلیم نسواں کا فروغ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، ہمیں اپنے بچوں خاص طور پر بیٹیوں کو عصری و دینی دونوں ہی علوم سے لازمی آراستہ کرنا چاہیے۔ تعلیم کے ذریعے ہی اپنے حقوق سے آشنا ہوا جاسکتا ہے۔ تعلیم ہی ترقی کی ضمانت ہے۔ آج خواتین کسی بھی شعبہ میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ لڑکیاں بھی لڑکوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ ہاشمی ایجوکیشنل گروپ کا بنیادی مقصد ہی تعلیم نسواں کا فروغ ہے، ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ ایک مرد کے پڑھنے سے صرف ایک فرد پڑھتا ہے، جب کہ ایک بیٹی کے تعلیم حاصل کر لینے سے ایک سماج تعلیم حاصل کرتا ہے۔ کالج پرنسپل ڈاکٹر رضوانہ کلثوم نے بھی اپنے خطاب میں فروغ تعلیم نسواں پر زور دیا اور کہا کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی کچھ لوگ ہیں جو بیٹیوں کو بیٹوں سے کمتر سمجھتے ہیں، لیکن اب دور بدل چکا ہے، آج بیٹیاں بیٹوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ کل بیٹوں سے آگے بھی نکل جائیں گی۔ اس موقعے پر جملہ اسٹاف اور ممبران موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جنوری 2023

کیفی نامہ

لکھنؤ: معروف شاعر کیفی اعظمی کے 104 ویں یوم پیدائش پر کیفی اعظمی اکادمی میں فلم 'کیفی نامہ' کی نمائش اور سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر شارب ردولوی نے صدارت کرتے ہوئے کہا کہ کیفی اعظمی کی شاعری میں میر انیس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ شاعری میں میر انیس کی لفظیات وروانی نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار ہمیشہ بلندیوں پر رہے۔ اردو زبان و ادب کو جس زبان خاص و انداز بیان کی ضرورت تھی، اس کو کیفی اعظمی نے غزل گوئی اور نظموں کے ذریعے پر کردیا، کیونکہ کیفی نے اپنے دور حیات میں ان کمیوں کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ کیفی اعظمی کے یوم پیدائش پر فلم 'کیفی نامہ' کی نمائش کیفی اعظمی اکیڈمی میں کی گئی۔ اس میں کیفی اعظمی کی خصوصیات اور ان کے سفر کے ساتھ ان کی خدمات کو تفصیل سے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد 'کیفی کی شخصیت وان کے کارنامے' کے عنوان سے سمینار منعقد ہوا۔ صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے ان کی زندگی اور ان کی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس دوران انھوں نے صفی لکھنوی کا بھی ذکر کیا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ کیفی اعظمی کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے، یہ وہ ستارہ ہے جو اعظم گڑھ کی سرزمین پر پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت ہوئی اور ممبئی کو اپنا مسکن بنایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ کیفی اعظمی کو ان کی غزلوں اور نظموں کے سبب غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مسیح الدین خان نے کہا کہ کیفی اعظمی نے دیگر ترقی پسند شعرا ساحر لدھیانوی و جاں نثار اختر وغیرہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حب الوطنی سے سرشار نغمے لکھے۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک اے ڈی

سی پی مغربی، ڈاکٹر للن رنجن سنگھ و دیگر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کا آغاز عذرا نے کیفی اعظمی کی نظم 'اتنا کیوں مسکرا رہے ہو' پڑھ کر کیا۔ کیفی اعظمی اکیڈمی کے سکریٹری سعید مہدی نے استقبالیہ پیش کیا اور اکیڈمی کی رپورٹ پیش کی۔ اس موقعے پر کیفی اعظمی اکیڈمی کے سفر پر مشتمل رشی شریواستو کی تیار کردہ ویڈیو بھی پیش کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2023

بہار

ترجمے کے مسائل

پٹنہ: ''ترجمہ لسانی اور ثقافتی قیود کو توڑنے کا عمل ہے۔ تمام زبانیں اپنے ڈھانچے میں یکساں نہیں ہوتیں، اسی لیے ایک زبان کا دوسری زبان میں مساوی لفظ تلاش کرنا اور ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے، اسی طرح مخصوص ثقافتی اصطلاحات کا ترجمہ کرنا بھی مترجم کے لیے مشکل ہوتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ لسانیات کے چیئرمین پروفیسر ایم جے وارثی نے 'میتھلی دیوس' کے موقعے پر 'میتھلی ساہتیہ سنستھان' پٹنہ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک خصوصی پروگرام میں 'ترجمے کے مسائل' پر خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ تقریب کے دوران اوشا کرن خان کے ایوارڈ یافتہ ناول 'بھامتی' کے اردو ترجمہ بذریعہ پروفیسر وارثی، اور میتھلی میں بیگ احساس کے ناول 'دخمہ' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اپنے خطبہ میں پروفیسر وارثی نے کہا کہ ''ترجمہ ایک پیچیدہ عمل ہے اور ایک زبان سے دوسری زبان اور ایک ثقافت سے دوسری ثقافت میں ترجمہ کرنا ہمیشہ اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا لگتا ہے۔ ترجمہ اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب ہم ٹارگٹ لینگویج میں سورس لینگویج کے ترجمے کے مساوی اصطلاحات و الفاظ تلاش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ پروفیسر وارثی نے مزید کہا کہ جب یہ زبان کی سطح پر ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکل کو ترجمہ کی لسانی مشکل کہا جاتا ہے اور جب ہم ثقافت سے نمٹ رہے ہوتے ہیں تو اسے ترجمہ کی ثقافتی مشکل کہا جاتا ہے۔ پروفیسر وارثی نے کہا کہ ثقافتی ترجمے کی مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سیاق و سباق کی خصوصیت روایتی طور پر اصل زبان میں موجود ہوں مگر ترجمہ والی زبان میں مکمل طور پر غیر موجود ہوں۔ ہر معاشرے کے لوگوں کا اپنا طرز زندگی ہوتا ہے، وہ ایک مخصوص زبان استعمال کرتے ہیں اور کچھ امتیازی صفات کے حامل ہوتے ہیں جو خاص سماجی گروپ کے رکن کے طور پر ان کی پہچان ہوتے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 10 جنوری 2023

ڈاکٹر ارمان نجمی کی یادوں، باتوں اور خدمات کے تعلق سے ایک گفتگو

پٹنہ: ڈاکٹر ارمان نجمی منفرد انداز و اطوار کے غیر معمولی شاعر و ادیب تھے۔ انھوں نے غزلوں، نظموں، مضامین اور ترجمے کے ذریعے اردو زبان و ادب کی مسلسل بے

لوث خدمت کی۔ ضرورت ہے کہ ان کی خدمات کا اعتراف ہو اور ان کی غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کا نظم کیا جائے مذکورہ خیالات کا اظہار علمی مجلس بہار کے جلسہ میں عظیم آباد کی کئی اہم اردو شخصیتوں نے کیا۔ یہ جلسہ 31 جنوری کی شام 3 بجے گورنمنٹ اردو لائبریری میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت گورنمنٹ اردو لائبریری کے چیرمین و سابق بی اے ایس ارشد فیروز نے کی۔ علمی مجلس بہار کے جنرل سکریٹری پرویز عالم نے جلسہ کی نظامت کی۔ جلسہ سے فخرالدین عارفی، اکبر رضا جمشید، خورشید اکبر، کلیم اللہ کلیم دوست پوری، اظہار خضر، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر سید سرور حسین، ڈاکٹر آصف سلیم اور محمد اظہر الحق نے ارمان نجمی کی شخصیت اور ادبی خدمات کا احاطہ کیا۔ ڈاکٹر ارمان نجمی کے چھوٹے بھائی اور دو صاحبزادوں بالترتیب فیض الحسن نجمی، ڈاکٹر علی اسد وارثی، حسن تابش نے ارمان نجمی کو یاد کرتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اور مرحوم کی اردو زبان و ادب سے متعلق خدمات پر روشنی ڈالی۔ ابتدائی تعارف کے بعد ڈاکٹر ارمان نجمی کی کتاب 'افتادگی کے بعد' کا اجرا عمل میں آیا۔

اپنی تقریر میں خورشید اکبر نے ارمان نجمی کے مضامین نثر و نظم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ ارمان نجمی معمولی شاعر نہیں تھے۔ انھیں نثر و نظم دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ غزل اور نظم دونوں کے یکساں طور پر اچھے شاعر تھے۔ وہ ادب کے موجودہ رجحانات سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ فخرالدین عارفی نے اپنی تقریر میں ارمان نجمی سے اپنے دیرینہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ارمان نجمی بڑے شاعر تھے۔ وہ غزلوں کے علاوہ نظمیہ شاعری پر بھی گہری گرفت رکھتے تھے، ان کو نثری ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ ان کے پاس گہری تنقیدی بصیرت بھی تھی۔ اردو کے ساتھ عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ بھی گہرا تھا۔

ڈاکٹر سید سرور حسین نے ارمان نجمی کو اچھا شاعر، اچھا ادیب، اچھا دانشور اور اچھا انسان بتاتے ہوئے مرحوم کے کئی اوصاف کا تذکرہ کیا۔ اظہار خضر نے ارمان نجمی کا تعارف و تذکرہ کرتے ہوئے ان کی شاعری پر خاص طور پر نظر ڈالی اور کئی اہم نکات کی نشاندہی کی۔ اکبر رضا جمشید نے ارمان نجمی کی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کئی مشورے دیے۔ ڈاکٹر عطا عابدی نے ارمان نجمی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ارمان نجمی کی شاعری ہو یا تنقید ہر جگہ ان کی غیر معمولی قابلیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی علمی و ادبی وراثت بہت قیمتی ہے، اسے محفوظ کرنے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر آصف سلیم نے ارمان نجمی سے کئی ملاقاتوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ڈاکٹر نجمی کے وسیع مطالعے، ان کی ذہانت اور خلوص ان کی نگارشات سے ظاہر ہے۔ وہ نئے لوگوں کی نگارشات کی حوصلہ افزائی کرتے۔ شاعری کے ساتھ نثر میں بھی ان کے عالمانہ افکار کی جلوہ گری ہے۔ تمام مقررین نے ارمان نجمی کو یاد کرنے اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر گفتگو کے لیے ان کے صاحبزادوں کو مبارکباد پیش کی کہ وہ اس سلسلے کو آگے بھی بڑھانا چاہتے ہیں۔ ارمان نجمی کی یادوں، باتوں اور خدمات سے متعلق علمی مجلس بہار کے زیر اہتمام منعقدہ اس جلسے میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ سلطان آزاد، ڈاکٹر ممتاز فرخ، شمع کوثر شمع، ڈاکٹر عشرت صبوحی، ڈاکٹر روشن پروین، فردوس قمر، نہال احمد انجینئر، نسیم احمد اور عطاء الحق مکرم بھی شریک تھے۔

ڈاکٹر عطا عابدی، پٹنہ، 2 فروری 2023

پنجاب

کرماں والی اور تقسیم ہند

پنجاب: پنجاب یونیورسٹی ایلمنائی ریلیشنز اور شعبۂ اردو و ہندی اور انگریزی، تھیٹر و پنجابی کے اشتراک سے کشمیری لال ذاکر کی یاد میں ان کے ناول 'کرماں والی اور تقسیم ہند'

کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں مہمان مقرر کی حیثیت سے معروف ڈراما نویس، ڈائرکٹر اور ایکٹر جناب ایم کے رینا نے خصوصی خطاب کیا۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز پروفیسر انوپما شرما (ڈین ایلمنائی ریلیشنز) کی استقبالیہ تقریر سے ہوا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ پروگرام ایک بڑی ادبی شخصیت کشمیری لال ذاکر کی یاد میں منعقد کیا گیا ہے۔ انھوں نے کشمیری لال ذاکر کی خدمات اور کارکردگیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ذاکر صاحب اپنے آپ میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ پروگرام کے مہمان مقرر شری ایم کے رینا نے ناول 'کرماں والی' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ ناول تقسیم ہند پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول پر مزید بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کرماں والی ایک ایسا کردار ہے جو سنہ سینتالیس میں ہندوستان سے ہجرت کر گئی تھی اور اس کا بیٹا ہندوستان میں چھوٹ گیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے ناول کے کلیدی جزئیات جس میں بے گھر ہونا، ہجرت و منتقلی کی صعوبتوں وغیرہ پر تفصیلاً گفتگو کرتے ہوئے ایک اہم بات یہ بھی کہی کہ اگر اس ناول میں پیش کیے گئے واقعات کا عصر حاضر کی صورت حال سے تقابل کیا جائے تو آج بھی لوگ ہجرت اور بے گھر ہونے کی دشواریوں سے نبرد آزما ہیں۔ واضح رہے کہ اس پروگرام کی نظامت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر علی عباس نے کرتے ہوئے کہا کہ کشمیری لال ذاکر کی 100 سے زائد کتابیں موجود ہیں جن میں خصوصیت سے تقسیم ہند کے موضوعات اور سماجی مسائل پر لکھے گئے ان کے افسانے، ناولٹ اور ناول شامل ہیں۔ اس پروگرام میں کشمیری لال ذاکر کی بیٹی ڈاکٹر کملیش موہن بھی موجود تھیں۔ آخر میں شعبۂ انگریزی کے صدر پروفیسر اکشے کمار نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'قومی بھارت' دہلی، 14 جنوری 2023

کرناٹک

ادب کی تدریس

وجے پور: کرناٹک اسٹیٹ اکا مہادیوی خواتین یونیورسٹی وجے پور کرناٹک کے زیر اہتمام 24 جنوری 2023 کو توسیعی لکچر اور جلسۂ اِستقبالیہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر ہاجرہ پروین، صدر شعبۂ اُردو سیکیاب ویمنس کالج وجئے پور نے بعنوان 'ادب کی تدریس' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''کسی بھی زبان کے ادب میں ایم اے کرنے والے طلبہ

کو اس بات کا تھوڑا بہت ادراک ہونا چاہیے کہ ادب کیا ہے۔ اِس کے بغیر ادب کی تدریس نامکمل رہے گی۔ ادب کی تدریس کے مراحل میں پہلا مرحلہ زبان کی تدریس ہے۔ لہٰذا زبان کی تدریس کے دوران زبان کے تمام نکات سے واقفیت ضروری ہے۔ اور ادب کی تدریس کے دوسرے مرحلے میں ادب کے خارجی اور داخلی پہلوؤں پر دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔ تبھی ادب کی تدریس مکمل ہوتی ہے۔

صدرِ جلسہ اور شعبۂ اُردو کے کوآرڈینیٹر پروفیسر نامدیو ایم گوڑا نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ''ادب کئی علوم کا مجموعہ ہوتا ہے لہٰذا طلبہ جس قدر ادب کا وسیع مطالعہ کریں گے اتنا ہی ان کے علم میں اضافہ ہوگا اور ان کی انفرادی شخصیت اُبھرے گی۔''

اِستقبالیہ و تعارفی کلمات اے ایم مومن نے ادا کیے۔ مہمانِ خصوصی وصدرِ اجلاس کے مبارک ہاتھوں سے سال اوّل کی یو جی اور پی جی کی طالبات کو تحائف سے نواز کر اِن کا اِستقبال کیا گیا۔ نظامت کے فرائض مالن منیار نے انجام دیے، میناج یلغار کی رسم شکریہ کے ساتھ جلسے کا اختتام ہوا۔ اس جلسے میں ڈین آف آرٹس فیکلٹی پروفیسر چنتامنی شعبۂ اُردو کے اساتذہ ڈاکٹر اسمٰعیل خان، ڈاکٹر سید سمیع الدین، شعبۂ ہندی کے اساتذہ گلاب راٹھور، ڈاکٹر پرجاپتی کے علاوہ شعبۂ اُردو اور ہندی کی تمام طالبات شریک رہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اسمٰعیل خان، لکچرر شعبۂ اردو خواتین یونیورسٹی، وجے پور، کرناٹک، 28 جنوری 2023

مغربی بنگال

اردو زبان وادب

هگلی: مغربی بنگال کی مشہور و تاریخی درسگاہ ہگلی محسن کالج میں گزشتہ 3 جنوری 2023 کو شعبۂ اردو کی جانب سے ایک عظیم الشان یک روزہ طلبہ و طالبات ریاستی سمینار بعنوان 'اردو زبان و ادب' کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب میں ہگلی محسن کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پرشتم پرامانک (WBSES) مہمان خصوصی کے طور پر شریک تھے جبکہ شعبۂ ریاضیات کے صدر ڈاکٹر سریش ناتھ بیرا گیا بطور مہمان اعزازی اس جلسے میں شامل رہے۔ سمینار کا آغاز کرتے ہوئے شعبۂ اردو کے استاد جناب ارشاد احمد نے اس پروگرام کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اپنی ابتدائی تقریر میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پرشتم پرامانک نے شعبۂ اردو کی کارکردگی پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے اس کی کارکردگی کو سراہا اور خصوصی طور پر فرمایا کہ شعبۂ اردو ڈاکٹر عمر غزالی کی صدارت اور ڈاکٹر ہمایوں جمیل خان صاحب و جناب ارشاد عالم صاحب کے مشوروں اور ہدایات پر عمل کرتے ہوئے بڑی فعالیت کا مظاہرہ بھی کر رہا ہے جو ایک نہایت خوش آئند بات ہے۔ شعبۂ ریاضیات کے صدر ڈاکٹر سریش ناتھ بیرا گیا (Convenor IQAC) نے بھی اپنی تقریر میں شعبۂ اردو کی بڑی تعریف کی اور اس سمینار کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عمر غزالی نے اپنی پر مغز تقریر میں شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے طلبہ و طالبات کو سمینار کی اہمیت و افادیت سے بھی آگاہ فرمایا۔ ڈاکٹر ہمایوں جمیل نے بھی اپنی تقریر میں طلبہ و طالبات کو مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے بعد سمینار کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ پہلے سیشن میں نظامت کے فرائض سید آصف عباس میرزا (ریسرچ اسکالر) نے ادا کیے جبکہ محمد خورشید عالم (ریسرچ اسکالر و جز وقتی لکچرر) نے دوسرے سیشن کو کامیابی سے اختتام تک پہنچایا۔ اس تقریب میں ہگلی محسن کالج کے شعبۂ اردو میں زیر تعلیم یو جی اور پی جی کے طلبہ و طالبات کے علاوہ 'یونیورسٹی آف بردوان'، 'یونیورسٹی آف کلکتہ'، 'عالیہ یونیورسٹی'، 'ویسٹ بنگال اسٹیٹ یونیورسٹی' اور 'قاضی نذرل یونیورسٹی' کے ریسرچ اسکالرس نے بھی شرکت کی۔ اس ریاستی سطح کے سمینار میں کل سترہ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے جن

کے اسما اور موضوعات اس طرح ہیں۔

محمد خورشید عالم (زبیر فاروقی کی غزل گوئی)، نیہا پروین (عباس علی خاں بیخود کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر)، محمد اظہرالدین (شموئل احمد - بحیثیت افسانہ نگار)، شگفتہ منیر (بچوں کے اقبال)، سیدہ خاتون (خطوط غالب)، فردوس نغمہ بانو (اردو ادب کی نشو نما میں امیر خسرو کا کردار)، دلکش ترنم (عصمت چغتائی بحیثیت افسانہ نگار)، داور حسین (عہد جدید کے ممتاز ترین شاعر منیر نیازی)، گلشن آرا (پروین شاکر کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ)، شبنم پروین (خم خانۂ صبر - ایک مطالعہ)، محمد ساجد (سید محمد اشرف - بحیثیت فکشن نگار)، شمع عظیم (جاوید اختر کی شاعری میں جدید سماج کی عکاسی)، سید آصف عباس میرزا (مرشد آباد میں رثائی ادب کا ارتقا)، صبا کائنات (اردو ادب میں جدید نظم کی اہمیت)، محمد ظہیرالدین (ناصر کاظمی ایک مطالعہ)، محمد رضوان (اقبال اور نوجوان قوم)، نغمہ پروین (مولوی عبدالحق - حیات و خدمات)۔

پریس ریلیز: سید آصف عباس مرزا، مغربی بنگال، 7 جنوری 2023

اعزاز و اکرام

اترپردیش اردو اکیڈمی کے انعامات

لکھنؤ: اترپردیش اردو اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کے ذریعے 2019 اور 2021 کے انعامات کا اعلان کیا گیا۔ 2019 کا مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ پروفیسر عبدالحق (دہلی) اور 2021 کا مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ پروفیسر عتیق اللہ (دہلی) کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ انعام پانچ لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ مجموعی ادبی خدمات پر بھی انعامات دیے گئے جن میں 2021 کے انعام یافتگان میں ڈاکٹر طارق قمر، شائستہ فاخری، پروفیسر نسیم احمد، پروفیسر خورشید احمد، سید فرید احمد، احتشام الدین صدیقی، جناب احسن ایوبی قابل ذکر ہیں۔ 2019 کے لیے مجموعی ادبی خدمات پر جو ایوارڈ دیے گئے ان میں تاج الدین اشعر رام نگری، احمد رشید، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر فخر الکریم، سلام فیضی، شاد عباسی، حکیم وسیم احمد اعظمی کے نام شامل ہیں۔ 2021 کے دیگر انعام یافتگان میں مہیش اشک، رفعت جمال، اشتیاق احمد ظلی، خالد سیف اللہ، فیروز احمد، حنیف خان، مشتاق احمد عامر، آصف جعفری، عتیق، ریاض احمد کے نام شامل ہیں۔ 2019 کے دیگر انعام یافتگان میں وفا گورکھپوری، نیلم فرزانہ، پروفیسر سید محمد ہاشم، طارق سعید، نفیس بانو، نیا ورق ممبئی، احتشام افسر، الیس فرحان، محمد عارف، شگفتہ یاسمین، ساجد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کتابوں پر بھی انعامات کا اعلان کیا گیا۔

....

حامد اکمل

گلبرگہ: مشہور صحافی مایہ ناز ادیب و شاعر جناب حامد اکمل مدیر روزنامہ ایقان ایکسپریس گلبرگہ کو انجمن ترقی اردو گلبرگہ کا باوقار کارنامہ حیات ایوارڈ پیش کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے خواجہ بندہ نواز ایوان اردو میں ایک یادگار تقریب منعقد ہوئی، جس میں حامد اکمل کو انجمن کارنامہ حیات ایوارڈ 2022 کے ساتھ سپاسنامہ، مومنٹو اور 25 ہزار روپے کیسۂ زر پیش کیا گیا۔ اردو صحافت کے 200 سالہ جشن کے ضمن میں حامد اکمل صاحب کی نصف صدی پر محیط صحافتی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں یہ اعزاز دیا گیا۔ سینئر صحافی ایم اے ماجد ایڈیٹر 4 ٹی وی اینڈ 4 ٹی وی نیٹ ورک حیدرآباد نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ حامد اکمل صاحب نے بے لوث 50 سالہ طویل صحافتی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی صحافت ہمیشہ صداقت پر مبنی رہی اور انھوں نے صحافت کا کوئی سودا نہیں کیا۔ ایم اے ماجد نے نئی نسل کی اردو صحافت و ادب سے عدم دلچسپی پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے مستقبل کو لے کر آج یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ ہم اردو ادب وصحافت کی میراث کس کے سپرد کر کے جائیں۔ کالم نگار ادیب و شاعر محمد اعظم شاہد بنگلور نے حامد اکمل صاحب سے اپنے دیرینہ ادبی و صحافتی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے حامد اکمل صاحب کی صحافتی و ادبی خدمات کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز مدیر ہفت روزہ گواہ حیدرآباد نے حامد اکمل کو نئی نسل کے لیے مشعل راہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ سچ پر چلنے کی راہ کیسی ہو، یہ جاننے کے لیے ہمیں حامد اکمل کی ایثار و قربانی سے معمور اور جستجو و جفاکشی کی زندگی کو دیکھنا ہوگا۔ صدر انجمن ترقی اردو گلبرگہ پیرزادہ فہیم الدین نے تقریب کی صدارت کی۔ انھوں نے صدارتی تقریر میں حامد اکمل صاحب کی صحافتی اور ادبی خدمات کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا شمار گلبرگہ کی قد آور علمی، ادبی، اور صحافتی شخصیات میں ہوتا ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 9 جنوری 2023

ڈاکٹر م ق سلیم کو ایوارڈ

حیدرآباد: جماعت اسلامی ہند چارمینار کے ادارہ ادب اسلامی کی جانب سے ایک طرحی مشاعرے کا اہتمام ہوا جس میں تیس سے زائد شعرا نے شرکت کی۔ اس موقع پر ادارہ ادب اسلامی نے حیدرآباد کے مشہور و معروف ادیب، نقاد، صحافی، مبصر ڈاکٹر م ق سلیم کو ان کی چالیس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں تہنیت پیش کی۔ محمد مسیح الدین (صدر جنوبی ہند) نے شال پوشی کی اور شاعر کوکب ذکی نے مومنٹو پیش کیا۔ ناظم مشاعرہ ادب اسلامی ظفر فاروقی کی موجوگی میں ڈاکٹر م ق سلیم نے ادارہ ادب اسلامی کے ذمے داروں کا شکریہ ادا کیا۔ یہ طرحی مشاعرہ حیدرآباد کے ممتاز مزاحیہ شاعر وحید پاشاہ قادری کی نگرانی میں رکھا گیا۔ محمد مجیب احمد (افسانہ نگار) نے ڈاکٹر م ق سلیم پر تفصیلی مضمون پڑھا۔ تمام شرکا نے ڈاکٹر م ق سلیم کو مبارک باد پیش کی۔ شاداں کالج کے تدریسی و غیر تدریسی اسٹاف نے مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر م ق سلیم کو ادب اسلامی کی جانب سے ایوارڈ دیے جانے پر بزم فروغ اردو، بزم اتحاد اردو، بزم ترویج تحریک اردو، دکن

لٹریری ایسوسی ایشن کے علاوہ دیگر تنظیموں نے انہیں مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر نادر المسدوسی، ڈاکٹر آصف علی، زعیم زومرہ، محسن خان، محمد مجیب احمد (افسانہ نگار) عطا عابدی (بہار) نخشب مسعود (مالیگاؤں)، محمد غوث، ڈاکٹر مختار احمد فردین، سید احمد علی، ظہیر دانش (کڑپہ)، شاہنواز ہاشمی، دستگیر نواز، عارف نظام آبادی اور دیگر نے مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر م ق سلیم، حیدرآباد، 3 فروری 2023

ثروت خان

جودھپور: معروف ناول نگار اور افسانہ نگار محترمہ ثروت خان کو ادبی تنظیم تہذیب کی جانب سے منعقد تقریب میں راجستھان کے اے ڈی راہی 2022 ایوارڈ سے نوازا

گیا۔ اس دوران انھیں شال اور شیلڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ تقریب کی صدارت راجستھان اردو اکیڈمی کے چیئرمین ڈاکٹر حسین رضا خان نے کی۔ جب کہ معروف شاعر، نقاد اور مفکر شین کاف نظام مہمان خصوصی تھے۔ پروگرام میں ڈاکٹر اشراق الاسلام ماہر نے ایوارڈ یافتہ ناول کڑوے کریلے پر مقالہ پڑھا۔ تہذیب کے چیئرمین ماسٹر اسحاق احمد چشتی نے ایوارڈ پیش کیا۔ غور طلب ہے کہ نامور شاعر اے ڈی راہی کے یوم پیدائش کے موقعے پر ناول نگار اور افسانہ نگار ثروت خان کے ناول 'کڑوے کریلے' کے لیے ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تھا۔ روزنامہ 'قومی بھارت' دہلی، 18 جنوری 2023

تقریب تقسیم ایوارڈ اور اجرا پروگرام

یاول: 18 جنوری 2023 بروز یہاں کی اردو سوشل ایجوکیشنل اکیڈمی کے زیر اہتمام بچوں کا رسالہ دو ماہی ترجمان 'اطفال' کے جنرل نالج ٹیسٹ کے تقسیم انعامات نیز رحیم رضا کی بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتاب گنبد کا جادو کی رسم رونمائی کی تقریب میں مارول کے سید شاداب کا ان کی ریاستی سطح کی والی بال شوٹر ٹیم کے بطور کپتان سلیکشن پر ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی سکول جونیئر کالج یاول کے پرنسپل جناب غلام غوث خان صاحب نے شال کے ذریعے استقبال کیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر

عبدالکریم سالار نے فرمائی جب کہ الحاج ہارون سیٹھ چیئرمین ڈائمنڈ انگلش میڈیم ہائی اسکول سادوہ کے دست مبارک سے رسم اجرا انجام پائی۔ علاقے کے مختلف اسکولوں کے سربراہان اور صدر مدرسین مہمانان خصوصی کے طور پر مدعو کیے گئے تھے جب کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج کے سابق پرنسپل عبدالرؤف شیخ صاحب نے اس شاندار تقریب کی سرپرستی فرمائی نیز ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول کے دسویں جماعت کے طالب محسن شیخ غفار کو بھی جنرل نالج ٹیسٹ میں اپنے اسکول میں اول آنے پر ٹرافی و سرٹی فیکٹ سے بدست الحاج ہارون سیٹھ نوازا گیا۔

پریس ریلیز: رحیم رضا، یاول 27 جنوری 2023

اجرا

رفتار

علی گڑھ: اردو سب سے خوبصورت زبان ہے، جو عالمی زبان بنتی جارہی ہے جس کو بھی فروغ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ علی گرھ مسلم یونیورسٹی نے سنجیو صراف کو اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات کے لیے سرسید نیشنل ایکسیلنس ایوارڈ دیا۔ میں اسی لیے کہتا ہوں کہ آپ سب لوگ اردو زبان سیکھیں، ایسا نہیں ہے کہ آپ نے اسکول اور کالج میں اگر اردو نہیں پڑھی ہے تو اب نہیں سیکھ سکتے ہیں، زبان کسی بھی عمر میں سیکھی جاسکتی ہے اور جب تک آپ اردو نہیں سیکھیں گے تہذیب کو کیسے بچائیں گے۔ یہ باتیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے شعبہ اردو کے جریدہ 'رفتار' کا اجرا کرتے ہوئے کہیں۔ پروفیسر منصور نے زبان کی حفاظت کے سلسلے میں عبرانی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں اس سے سیکھنا چاہیے کہ زبان کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے۔ اردو داں وہ ہے جو لکھنا اور پڑھنا دونوں جانتا ہو، صرف بولنے سے اردو داں نہیں کہلا سکتا، اس لیے اردو کی بنیادی معلومات ضروری ہے۔ 'رفتار' کا یہ شمارہ سالانہ روداد ہے جس سے شعبہ اردو کی سمت و رفتار کا پتہ چلتا ہے اور یہاں کے اساتذہ اور طلبا کی کارکردگیوں سے متعلق بھی معلومات ملتی ہے۔ یہ سالنامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کے ذریعے شعبہ اردو میں ہونے والے علمی و ادبی مذاکروں، سمیناروں اور یہاں ہونے والی ریسرچ سے متعلق واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ کسی بھی شعبے کی اہمیت اس میں ہونے والی ریسرچ کے معیار سے قائم ہوتی ہے اس معاملے میں بھی یہ شعبہ نمایاں ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 فروری 2023

سعادت حسن منٹو کے منتخب افسانوں کے مراٹھی ترجمے کا اجرا اور مذاکرہ

ممبئی: انجمن ترقی پسند تحریک اردو، ممبئی اور اردو کارواں کے مشترکہ بینر تلے سعادت حسن منٹو کے چند منتخب افسانوں کے مراٹھی ترجمہ کی کتاب کا اجرا اور منٹو کی فن و شخصیت پر ایک مذاکرہ، پریل دلوی بلڈنگ آفس پر رکھا گیا تھا۔ ترجمہ مراٹھی کے معروف ادیب لوک ناتھ یشونت نے کیا ہے۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر شریدھر پوار نے پروگرام کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے تمام مہمانوں اور مقررین کا تعارف پیش کیا۔ منٹو کے فن اور شخصیت اور افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اردو کارواں کے میر کارواں فرید احمد خان نے منٹو کی شخصیت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی افسانہ نگاری کے اسلوب، کہانی اور کردار نگاری پر مفصل اور مربوط نکات پیش کرتے ہوئے کہا کہ منٹو نے کل 43 سالہ مختصر زندگی میں فن افسانہ نگاری میں لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔ اسلم پرویز نے کہا کہ ایک زبان کے ادب کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا دور حاضر میں ادب کی بڑی خدمت ہے۔ صحافی فرحان حنیف وارثی نے منٹو کے انتقال پر پاکستان کے اہم اخبارات پاکستان ٹائمز، روزنامہ آفاق، لاہور، ٹائمز آف کراچی کے تاریخی مضامین پڑھ کر سنائے۔ مراٹھی کے نامور ادیب لوک ناتھ یشونت نے جن کی کتاب کی رونمائی کی گئی تھی کہا کہ میں نے منٹو کے افسانوں کے کرداروں میں خود کو محسوس کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ منٹو نے اپنے بیباک اور بے لاگ افسانوی تحریروں میں تقسیم کے درد و کرب، کمزور عورتوں کے مسائل اور فرقہ وارانہ سوچ اور عمل کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ انھوں نے دونوں میزبان تنظیموں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس قسم کے مزید پروگرام منعقد کرنے کی گزارش کی۔ اس محفل میں کئی نوجوانوں نے منٹو کے افسانوں کو مراٹھی میں پیش کیا۔

روزنامہ 'قومی بھارت' 15 جنوری 2023

اردو صحافت: تجزیاتی ولسانیاتی ڈسکورس

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں 'اردو صحافت: تجزیاتی ولسانیاتی ڈسکورس' کے عنوان سے شائع کتاب کے اجرا کی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ سمینار کا انعقاد اپنی نوعیت کے اعتبار سے نہایت جامع اور مکمل قدم تھا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کے موضوع پر شائع یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے امید ہے کہ اساتذہ اور طلبہ اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔ اس موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے

یہ کتاب اردو صحافت کے دوسو سال مکمل ہونے کے موقع پر منعقدہ سمینار کے مقالات پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے ڈائرکٹر پروفیسر عقیل احمد مہمان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ رسم اجرا کی تقریب میں صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد گلریز نے کہا کہ کسی بھی ملک کی معیار بندی میں اس ملک کے تعلیمی، صحافتی اور معاشی نظام کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سماجی اور سیاسی زندگی میں درس و تدریس اور علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں زبان و بیان اور ابلاغ عامہ کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ چونکہ ابلاغ عامہ کا براہ راست تعلق زبان سے ہے اور زبان ہی میڈیا کا ذریعہ اظہار بھی ہے، اس تناظر میں یہ کتاب خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت پر جب بھی گفتگو کی جائے گی تو اس کتاب کا حوالہ ضرور دیا جائے گا۔ یہ کتاب اردو صحافت کی مجموعی تاریخ کے حوالے سے اردو کے معروف صحافیوں مثلاً سرسید احمد خاں، منشی سداسکھ، مولوی محمد باقر، مولانا ابوالکلام آزاد، نول کشور، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، نندکشور وکرم، جی ڈی ٹنڈن، کلدیپ نیر وغیرہ کی صحافتی خدمات کا احاطہ کرتی ہے۔

مہمان خصوصی پروفیسر عقیل احمد، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ علم ودانش کے فروغ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا امتیازی حصہ رہا ہے اور اردو صحافت کے دوسو سالہ جشن کی مناسبت سے شعبہ لسانیات میں ایک تاریخی

ہوئے مہمان اعزازی ماس کمیونی کیشن شعبہ کے پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ اس کتاب کی اشاعت سے اردو صحافت میں زبان و بیان کے لسانی پہلوؤں پر غور وفکر کے باب روشن ہوں گے۔

معروف فکشن نگار سید محمد اشرف (آئی آر ایس) نے کہا کہ صحافت میں مستعمل زبان بھی زمان ومکان کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی ہے اس تبدیلی کے پس پردہ بہت سے عوامل کارفرما ہیں جو ایک صحافی کو نئی لسانی تخلیق پر آمادہ کرتے ہیں۔

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر علی نے کہا کہ ذرائع ابلاغ میں عالمی سطح پر نمایاں تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور دنیا کی تمام زبانیں اب انسانی ترسیل کے عالمی نظام میں ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہو رہی ہیں۔

شعبہ لسانیات کے سربراہ پروفیسر محمد جہانگیر وارثی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو صحافت نے نئے انداز فکر، نئے نظریات، نئی بصیرت، نئے طریقۂ کار اور نئے علمی ذخیرۂ الفاظ و اصطلاحات کے ساتھ دوسرے میڈیا کے شانہ بہ شانہ چلنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے کہا 'ہم جس دور میں زندہ ہیں وہ میڈیا کا دور ہے اب کوئی بھی شخص خود کو زمانے کی رفتار اور اس کے سرد وگرم سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار ہے۔ مگر پرنٹ میڈیا کا اپنا مزاج اور معیار ہے۔ طبع شدہ الفاظ رفتہ رفتہ ہمارے علمی اور تہذیبی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تہذیبی فروغ اور نئی تہذیب سے استفادہ کا معاملہ بھی اس سے جڑا ہوا ہے۔''

اس موقع پر مہمانان اعزازی آرٹس فیکلٹی کے ڈین، پروفیسر عارف نظیر، بی بی سی کے صحافی اقبال احمد اور شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر محمد علی جوہر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ شعبہ کے جناب مسعود علی بیگ نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ پروفیسر شبانہ حمید نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: پروفیسر ایم جے وارثی، اے ایم یو علی گڑھ، 24 جنوری 2023

پھول، خوشبو اور میں

نئی دہلی: حلقۂ تشنگان ادب کے زیر اہتمام سیما شرما میرٹھی کے شعری مجموعے 'پھول، خوشبو اور میں' کی رسم اجرا معروف استاذ شاعر اور دبستان داغ دہلوی کے روح رواں ڈاکٹر الیاس نوید گنوری کے دست مبارک سے عمل پذیر ہوئی جس میں مقامی و بیرونی ادبا و شعرا نے شرکت کی۔

پروگرام کی نظامت حلقۂ تشنگان ادب کے سکریٹری دھرم ویر سیماب سلطانپوری نے انجام دیے۔ اس موقع پر صدر محفل ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کہا کہ بلاشبہ عصر حاضر میں سیما شرما نسائی لب و لہجے کی خوبصورت اور منفرد شاعرہ ہیں ان کا خاصہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب کا سنگم نظر آتی ہے۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں سیما شرما کے شریک حیات، وبیندر کمار شرما کے علاوہ آکرش واتس، آشیش سنہا، رانا گنوری، معروف صحافی اور ادیب حبیب سیفی اور ہدایت بدایونی کا اہم کردار رہا۔ واضح رہے کہ یہ حلقۂ تشنگان ادب کے زیر اہتمام یہ 550 ویں شعری نشست تھی۔ اختتام پر سیما شرما اور ان کے شریک حیات روبندر کمار شرما کو استاذ ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے دعاؤں کے ساتھ ردائے ادب سے سرفراز کیا۔ روبندر کمار شرما نے تمام حاضرین اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 12 جنوری 2023

متن کے آس پاس

نئی دہلی: خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی گلبرگہ میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ڈاکٹر سلمان عبدالصمد کے تنقیدی مضامین کے مجموعے کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ اس مجموعے میں

کل سترہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے صدر اور مشہور ادیب پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر نے سلمان عبدالصمد کا تعارف پیش کیا اور ان کے تنقیدی مضامین پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ اس مجموعے میں اردو کے ابتدائی دور سے لے کر موجودہ عہد کو کسی نہ کسی سطح پر زیر بحث لانے کی کوشش کی گئی۔ یہی سبب ہے کہ اس میں امیر خسرو تا موجودہ صحافت کے معاملات موجود ہیں۔ ساتھ ہی مضامین کے عناوین اور ڈاکٹر سلمان کی چند لفظیات کا خصوصی تذکرہ کیا۔ جب کہ شعبہ کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر میمونہ سرڈگی اور ڈاکٹر اطہر معز نے بھی کتاب کے مشمولات پر اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے دیگر عملہ سمیت شعبہ اردو کی طالبات ثمینہ افشاں، لبنیٰ ثمرین، رئیسہ فاطمہ اور اسماوغیرہ شریک تھیں۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر سلمان عبدالصمد بی این یو کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کا ایک ناول 'لفظوں کا لہو' پانچ برس قبل منظر عام پر آیا تھا۔ متن کے آس پاس' کے متعلق ماہر لسانیات پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ لکھتے ہیں کہ اس مجموعے کے مضامین اپنے اسلوب کی ندرت، موضوع کے تنوع اور دو ٹوک طرز اظہار کی وجہ سے قاری کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت پر شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شہباز ارشد اور اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ذبیح اللہ کے علاوہ شعبۂ صحافت کے ڈاکٹر جاوید نے بھی مبارک بادی پیش کی ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2023

بزم ادب خواتین اردو کی ادبی نشست

علی گڑھ: علی گڑھ کی ادبی و ثقافتی تنظیم 'بزم ادب' خواتین کی ایک ادبی نشست بیگم شاہینہ یونس کی خواہش پر سٹی شیف میں منعقد کی گئی۔ بزم ادب ایک بہت پرانی تنظیم ہے جس کا مقصد شروع سے ہی اردو ادب کی خدمت کرنا اور تخلیق کار خواتین کو منظر عام پر لانا ہے۔ بزم ادب کی اس نشست میں رسالہ بزم ادب کا اجرا فکشن نگار محترمہ نسترن احسن فتیحی، افسانہ نگار محترمہ انجم قدوائی، افسانہ اور مضمون نگار ڈاکٹر فائزہ عباسی، ادیبہ اور شاعرہ محترمہ صبیحہ سنبل، افسانہ نگار و شاعرہ آصف اظہار علی اور مضمون نگار محترمہ نرجس حسین و دیگر اراکین بزم ادب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ نشست کا آغاز محترمہ نسترن احسن فتیحی نے اپنا ایک پر اثر اور جذباتی مضمون 'میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں' پڑھ کر کیا جو اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت شاعرہ اور افسانہ نگار مرحومہ تبسم فاطمہ کے انتقال ہونے پر لکھا گیا تھا۔ افسانہ نگار محترمہ انجم قدوائی نے اپنا ایک افسانہ 'درد کا موسم' پڑھ کر سنایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر فائزہ عباسی نے بھی اپنا ایک دلچسپ مضمون پڑھا۔ محترمہ عفت صدیقی نے بھی اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔ محترمہ نجمہ خان نے ترنم کے ساتھ اپنی خوبصورت آواز میں ایک غزل سنائی۔ محترمہ صبیحہ سنبل شاعری کے علاوہ نثر نگاری بھی کرتی ہیں، انھوں نے اپنا ایک افسانچہ 'کار خیر' کے عنوان سے سامعین کے روبرو پڑھا اور اپنے مترنم کلام سے بھی اراکین بزم کو محظوظ کیا۔ محترمہ نسترن احسن فتیحی نے مرحومہ پروفیسر سیما صغیر کی یاد میں لکھی ہوئی اپنی پر اثر نظم بھی محفل میں سنائی۔ نوئیڈا سے تشریف لائی ہوئی ایک معزز باذوق خاتون نے اپنی والدہ اور مشہور شاعرہ نہال مرادآبادی کا کلام سنایا۔ محترمہ نرجس حسین نے غالب کی ایک مقبول غزل سنا کر سماں باندھ دیا، محترمہ آصف اظہار علی نے بھی اپنی ایک نظم اور غزلیں اراکین بزم کے روبرو پیش کیں۔

روزنامہ'میرا وطن' دہلی، 7 جنوری 2023

تعاقب زرد موسم کا

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام معروف افسانہ نگار راجیو پرکاش ساحر کے افسانوی مجموعے 'تعاقب زرد موسم کا' کی تقریب رونمائی پریس کلب میں ہوئی۔

صدارت پروفیسر شافع قدوائی صدر شعبۂ ماس کمیونی کیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی معروف ناول نگار محسن خان اور پرتل جوشی سابق ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو شریک ہوئے۔ دیگر مہمانان گرامی میں پروفیسر نلن رنجن سنگھ، محمد احسن، سہیل کاکوروی، رفعت شیدا صدیقی اور پرویز ملک زادہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیا۔ مہمانوں کا استقبال شکیل گیاوی اور اظہار تشکر ڈاکٹر ثروت تقی نے ادا کیا۔ شافع قدوائی نے کہا کہ راجیو پرکاش ساحر کے افسانوں کے دوسرے مجموعے 'تعاقب زرد موسم کا' کے بیشتر افسانے داخلی کشاکش کو خارجی حقیقت سے ہم آہنگ کر کے تغیر آسا زندگی کی تفہیم کا ایک نیا حوالہ عطا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے کہا کہ راجیو پرکاش کے افسانوں میں لکھنوی تہذیب و ثقافت کی عصری آگہی، سماجی شعور اور انسانی اضطراب کی مصوری ملتی ہے۔ ڈاکٹر ریشما پروین نے کہا کہ ساحر کے افسانے انسانی قدروں کے نشیب و فراز کے بہترین شارح ہیں۔ عطیہ بی نے کہا کہ ماورائی طاقتوں سے عصری مماثلت ان کے افسانوں کی فکری ترجیح ہے۔ ڈاکٹر جاں نثار عالم نے 'تعاقب زرد موسم کا' کو افسانوں کی عصری آگہی سے پر بتایا۔ نلن رنجن نے کہا کہ ساحر کے بیشتر افسانے سماج کے دبے کچلے کردار کو ابھارتے ہیں اور قاری کو اس کی طرف شدت کے ساتھ متوجہ کرتے ہیں۔ پرویز ملک زادہ نے کہا کہ راجیو پرکاش ساحر نے اپنا ادبی آغاز تو شاعری سے کیا تھا مگر کامیابی نثری میدان میں حاصل ہوئی۔ پرتل جوشی نے راجیو پرکاش کو افسانوی میدان کا مجاہد اور ان کے افسانوں کو مستقبل کا خوبصورت منظر نامہ بتایا۔ محسن خان نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے خوب سے خوب تر کی طرف بڑھتا ہوا قدم بتایا۔ سہیل کاکوروی نے کہا کہ راجیو پرکاش کے افسانے ماورائی اور حقیقی دنیا کے امتزاج سے پر ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ان کا شعری شعور بھی جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر اسرارالحق، ڈاکٹر احتشام خان، وسیم حیدر، ارشد اعظمی، سید اعزاز حسین، انور حسین، رضا حسین، نزہت شہاب چشتی، پروفیسر جمال انور، عتیق انور صدیقی، مہناز انور، قمر خان، ڈاکٹر صفیہ پروین وغیرہ موجود تھے۔ اس موقع پر ایک شعری نشست کا بھی اہتمام تھا جس کی صدارت رفعت شیدا صدیقی اور نظامت شکیل گیاوی نے کی۔ شعرا میں قمر سیتاپوری، محمد علی علوی، مسعود احمد فہمی، اتل اناڑی، نظام

حسن پوری الہ آبادی، معید رہبر، اوپندر باجپئی، قسیم تابش، عاصم خاں آفریدی ملیح آبادی، ڈاکٹر رضوان الرضا، اشہر علیگ، نیر عمر بلرامپوری اور منیش پانڈے کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ ’آگ‘ لکھنؤ، 6 فروری 2023

وفیات

پروفیسر ابن کنول

نئی دھلی: معروف افسانہ و خاکہ نگار پروفیسر ابن کنول سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کا 11 فروری کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 65 برس تھی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں وائیوا لینے گئے ہوئے تھے۔ اطلاع کے مطابق دوپہر دو بجے تک

وہ یونیورسٹی میں تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے ایک رشتے دار کے یہاں گئے جہاں ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہیں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ان کے انتقال کی خبر سامنے آنے کے بعد اردو دنیا میں صف ماتم بچھ گئی۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور چار بیٹیاں شامل ہیں۔ اطلاع کے مطابق ان کی تدفین 12 فروری بروز اتوار صبح 11 بجے علی گڑھ میں عمل میں آئی۔ درجنوں کتابوں کے مصنف پروفیسر ابن کنول کی تخلیقی کاوشوں میں شاہکار افسانے، خاکے، انشائیے اور ڈرامے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے ماتحت ان گنت طلبہ و طالبات نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پروفیسر ابن کنول کا اصلی نام ناصر محمود کمال ہے۔ ان کی ولادت اترپردیش کے ضلع مراد آباد کے قصبہ بہجوئی میں 15 اکتوبر 1957 کو ایک زمیندار خاندان میں ہوئی تھی۔ والد محترم مشہور قومی شاعر قاضی شمس الحسن کنول ڈبائیوی تھے۔ ان کا خاندان ہمیشہ سے ہی علمی و ادبی سرگرمیوں کے سبب کافی مشہور رہا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں علی گڑھ میں پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر قاضی عبدالستار، خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر نعیم احمد اور پروفیسر اصغر عباس جیسے اساتذہ سے کسب فیض کا موقع ملا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ڈبائی اور بدایوں کے گنور میں حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے مکمل کرنے کے بعد وہ دہلی چلے گئے جہاں سے انھوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد سے دہلی یونیورسٹی کے ہی شعبہ اردو میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور گزشتہ سال اکتوبر میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ تقریباً پانچ دہائیوں سے وہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمہ تن مصروف تھے، چنانچہ اب تک مختلف اصناف میں متعدد تحقیقی، تنقیدی علمی و ادبی مضامین قلم بند کر چکے تھے، جن میں تیسری دنیا کے لوگ (افسانے)، بند راستے (افسانے)، ہندوستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں، ریاض دلربا (تحقیق)، آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ)، داستان سے ناول تک (تنقید)، انتخاب سخن (اردو شاعری کا انتخاب)، اصناف پارینہ (قصیدہ و مثنوی اور مرثیہ)، منتخب نظمیں، تحقیق و تحسین (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، تحقیق و تدوین (ترتیب) وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 12 فروری 2023

امیر دہلوی

نئی دھلی: پرانی دہلی کے بزرگ شاعر حاجی امیر دہلوی کا مختصر علالت کے بعد 12 جنوری کو 92 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 12 دنوں سے اوکھلا کے الشفا

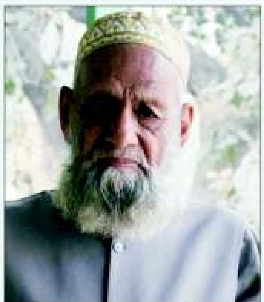

اسپتال میں زیر علاج تھے۔ حاجی امیر دہلوی علامہ انور صابری کے شاگرد عزیز تھے۔ ایک کشمیری خاتون سے انھوں نے شادی کی تھی، وہ لاولد تھے۔ حاجی امیر بنیادی طور پر غزل کے شاعر کے طور پر جانے جاتے تھے، دہلی کے تاریخی لال قلعہ کے مشاعرے میں انھیں بہت عزت و احترام کے ساتھ بلایا جاتا تھا، دہلی اور دہلی کے باہر بھی انھوں نے متعدد مشاعروں میں شرکت کی۔ وہ حاجی میاں فیاض الدین مرحوم کے بڑے بھائی تھے جن کا 2021 میں کورونا کے دور میں انتقال ہوا تھا۔ دہلی کی تاریخ اور اس کی تہذیب ان کے اندر رچی بسی تھی۔ حاجی امیر دہلوی کی نماز جنازہ شاہجہانی جامع مسجد دہلی میں ادا کی گئی جب کہ تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں سوگواران کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ ان کی آخری رسومات میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے بھانجے ایڈووکیٹ مسرور صدیقی نے بتایا کہ حاجی امیر دہلوی کی پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی سے بے تکلف دوستی تھی، اس کے علاوہ ان کے ’حاجی ہوٹل‘ میں ملک کے کئی اہم شعرا قیام کرتے تھے جن میں ملک زادہ منظور احمد، بیکل اتساہی، راہی شہابی، وسیم بریلوی، ابرار کرت پوری وغیرہ شامل تھے۔ یہ سبھی ان کے ہم عصر شاعر تھے۔ سینئر صحافی معصوم مراد آبادی نے کہا کہ امیر دہلوی، دہلوی تہذیب کے نمائندہ شاعر تھے، ان کا پہلا مجموعہ کلام ’شرح جذبات‘ 1984 میں شائع ہوا تھا، وہ علامہ انور صابری کے چہیتے شاگرد تھے۔ اپنے عہد کے بڑے بڑے شاعروں نے شاہجہانی جامع مسجد کے پہلو میں واقع ان کے حاجی ہوٹل میں قیام کیا۔ ملک بھر کے اہم شعرا سے ان کے بے تکلف مراسم تھے۔ ان کا انتقال دہلوی تہذیب اور شعر و ادب کا بڑا خسارہ ہے۔

روزنامہ ’اخبار مشرق‘ دہلی، 14 جنوری 2023

انیس درانی

نئی دھلی: سینئر سیاسی رہنما، دہلی اسٹیٹ حج کمیٹی کے سابق چیئرمین، اور معروف کالم نگار انیس درانی کا نوئیڈا کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 75 سال کے تھے۔ پسماندگان

میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ تدفین بعد نماز مغرب دہلی گیٹ کے قبرستان میں ہوئی۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں سیاسی، سماجی اور ملی رہنماؤں کے ساتھ صحافی موجود تھے۔ معلوم ہو کہ انیس درانی کو 17 دسمبر بروز جمعہ کے روز دل کا شدید دورہ پڑنے کے بعد نوئیڈا کے جے پی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی حالت نازک ہونے کی وجہ سے انھیں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا لیکن حالت میں کوئی سدھار نہیں آیا۔ ان کے انتقال پر ملال پر سابق ایم پی م افضل سینئر صحافی مودود صدیقی، سہیل انجم، پروفیسر اختر الواسع، دہلی وقف بورڈ کے سینئر ممبر چودھری محمد شریف، غازی پور، مرغا مچھلی منڈی کے چیئرمین مہربان قریشی، ڈاکٹر شاہد پرویز، معصوم مراد آبادی سمیت متعدد شخصیات نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ روزنامہ ’صحافت‘ دہلی، 22 جنوری 2023

اعجاز اختر

نئی دھلی: سرگرم قلم کار اعجاز اختر کا 29 جنوری بروز اتوار درمیانی شب 12:45 پر انتقال ہوگیا۔ اسی دن بعد

نمازعصر کلکتہ کے گوبرا قبرستان میں سیکڑوں سوگواروں نے انھیں نم آنکھوں سے الوداع کہا۔ کولکاتا کے ادب نوازوں میں اس لحاظ سے ان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا کہ وہ کتابوں

اور رسائل کے رسیا اور سنجیدہ قاری تھے۔ ان کا خاندانی کاروبار چھاپہ خانے کا تھا اور شانتا پریس پچھلی صدی کے آخری نصف میں ایک بہت مقبول چھاپہ خانہ تھا۔ اسکولوں کے سوالات کے پرچے انتہائی رازداری سے چھاپنے کی وجہ سے تعلیمی حلقے میں اعجاز اختر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ادھر کئی برسوں سے بیمار چل رہے تھے۔ ان کی عمر تقریباً 71 سال تھی۔ آخری سانس اپنی رہائش گاہ پر ہی لی۔ دہلی میں ادبی انجمن اردو برادری کے دفتر میں اشہر ہاشمی کی صدارت میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں ظفر انور، شکیل رحمانی، نوید اقبال، ڈاکٹر عبدالواسع، جلال الدین اسلم اور ڈاکٹر وسیم اختر وغیرہ نے ان کے بلندی درجات کے لیے دعا کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 31 جنوری 2023

خراج عقیدت

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کو خراج عقیدت

بنگلورو: ملک کی معروف اردوداں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی سابق ڈائرکٹر اور کرناٹک اردو اکادمی کی سابق چیئر پرسن ڈاکٹر فہمیدہ بیگم مرحومہ کی یاد میں ایک

پروگرام کا الایمان کیمپس کے سمینار ہال میں اہتمام کیا گیا۔ اس میں سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر کے رحمٰن خان مہمان خصوصی رہے۔ پروگرام میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر رحمٰن خان نے کہا کہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم جب حیات تھیں تو ان کی کوشش ہمہ وقت یہی تھی کہ اردو زبان کو ترقی بنیادی سطح سے دی جائے۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اردو زبان کو عام لوگوں تک لے جائیں۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے این سی پی یو ایل کی ڈائرکٹر کے طور پر ملک کے مختلف مقامات پر کونسل کے ذریعے خطاطی کی تربیت کے مراکز قائم کیے۔ ڈاکٹر کے رحمٰن خان نے کہا کہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اردو زبان کی بقا و ترویج کے لیے جس جذبے سے کام کیا اس کو حقیقی معنوں میں خراج عقیدت اسی وقت ممکن ہے جب تمام مل کر نوجوانوں اور آنے والی نسلوں کو اردو زبان سکھانے اور اس زبان کو بچانے کا عزم کریں۔ اس موقعے پر پروفیسر م ن سعید سابق صدر شعبۂ اردو بنگلورو یونیورسٹی نے اپنی بہن ڈاکٹر فہمیدہ بیگم سے اپنے مراسم اور اردو زبان کے لیے ان کی مخلصانہ خدمات سے آگاہ کروایا۔ ڈاکٹر مہ نور زمانی نے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی شاگردہ اور ایک دوست کی حیثیت سے اپنے تعلق پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر آر عبدالحمید نے اسی عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ عزیز اللہ بیگ، ریٹائرڈ آئی اے ایس و سابق چیئر مین کرناٹک اردو اکادمی نے صدارتی خطاب کیا۔ اجلاس کی نظامت ملنسار اطہر نے کی اور خلیل احمد کے شکریہ پر جلسہ تمام ہوا۔

روزنامہ 'سالار' بنگلور، 23 جنوری 2023

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................ بتاریخ.......................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, मार्च-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०३
URDU DUNIYA Monthly, March-2023, Vol.25, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/02/2023**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6